تصاویر

عِصمت چُغتائی

سرلا دیوی

مُمتاز شیریں

سیّدہ اشرف

سنجیدہ اشرف

کوشلیا اشک

قرۃ العین

مسز عبد القادر

ابتدائیہ

عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، شیریں اور شکیلہ اختر وغیرہا! اور ان کے فوراً بعد تسنیم سلیم چھتاری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں اور کرشلیا اشک وغیرہا کی کہانیاں پڑھ کر اکثر اوقات میں اس سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ کہیں ہندوستان کی خواتین اردو ادب کے میدان میں مرد افسانہ نگاروں کو پیچھے تو نہیں چھوڑ جائیں گی، اس لئے کہ جہاں تک مرد افسانہ نگاروں کے موضوعات محدود تھے، وہاں خواتین نے ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو پر لکھنا شروع کر رکھا تھا۔ عصمت چغتائی کی بے پناہ مقبولیت کے ساتھ خواتین کی دنیا میں ایک زلزلہ سا پیدا ہو گیا، اور اچانک ہونہار افسانہ نگار خواتین کی ایک اچھی خاصی جماعت ہمارے افسانوی ادب کے افق پہ نمودار ہوئی، اور اس تیز رفتاری سے آگے بڑھی کہ میرا مندرجہ بالا وہم (جو خوف کے بجائے تعجب کے جذبات سے عبارت تھا) یقین میں بدلنے لگا۔ ___ مگر بہت ہی جلد آگے بیٹھے ہوئے شہ سواروں کے تعاقب میں مل کر خواتین کی یہ جماعت ان کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلنے لگی، دونوں جماعتیں یکساں رفتار سے

متوازی خطوط پر گامزن تھیں اس لئے اب سوال یہ نہ رہا کہ بازی کون لے جائے گا۔ بلکہ نُقاد
یقیناً دونوں جماعتوں کی تخلیقات کے مجموعی اثرات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس سے یہ
فائدہ تو ضرور ہوا کہ (عصمت چغتائی کی خواہش کے مطابق) ادب سے عورت مرد کی تفریق
اُٹھ گئی۔ مگر اس فائدے سے کہیں بڑا نقصان یہ ہوا کہ خواتین کی تحریروں کو بیشتر نقادوں
نے ثانوی حیثیت دینا شروع کر دی، اور اگر اُن کے مضامین میں عصمت چغتائی اور رشید جہاں
کا نام آیا بھی تو مجبوراً اور احتراماً۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، تسنیم سلیم چھتاری، قرۃ العین حیدر
اور کوشلیا وغیرہا کی کہانیاں بلند پایہ رسائل میں چھپتی رہیں، مگر ان کہانیوں سے گھٹیا درجے کے
افسانوں کو محض اس لئے آسمان پر چڑھایا جاتا رہا، کہ ان کے لکھنے والے مرد تھے، اس کی
ایک بڑی وجہ تو یہ تھی، کہ ہمارے ہاں کوئی نقاد خاتون موجود نہیں، جو اپنی صنف کی
کامیاب وکالت کر سکے، دوسرے ہندوستانی مردوں کے ذہنوں پر اپنی روایتی برتری
کا خیالات اس پختگی سے منڈھا جا چکا ہے۔ کہ وہ اس ترقی یافتہ دَور میں بھی عورت کو مساوی
وجود دینا برداشت نہیں کر سکتے، حالانکہ ادب ہی ایک ایسا حسین نظام ہے، جہاں امیر
غریب اور مرد عورت کی تمیز مفقود ہے، اور جہاں کی ہر چیز کو اس کی ماہیت، حیثیت
اور افادیت کے لحاظ سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ —— اور پھر ادبی دُنیا میں ہر قلمکار کی ماہیت
ایک، حیثیت ایک، اور افادیت متنوع ہونے کے باوجود یکساں ہے! کتنے تعجب کا مقام
ہے کہ اب تک کئی حضرات کے نزدیک عورت افسانہ لکھنے پر قادر ہی نہیں، رسالہ شاعر
(آگرہ) کی اشاعت فروری مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک صاحب رسالہ مذکور کے شاندار
افسانہ نمبر پر رائے ظاہر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان (افسانہ نمبر مذکور میں شامل ہونے والی افسانہ نگار خواتین) میں

سے بھی بعض شخصیتوں کے تو وجود ہی مشتبہ ہیں اور بعضوں کا کام مشتبہ!"

قرۃ العین حیدر میرے ایک سوال کے جواب میں اپنے مستقبل کے بارے میں ارادے ظاہر کرنے کے بعد چونک کر لکھتی ہیں۔

> لیکن یہ خیال خاصا nonsense سا ہے، اور پھر اس ہندوستان میں جہاں وحیدہ عزیز کے متعلق لکھا جاتا ہے، کہ یہ خاتون تو ہو ہی نہیں سکتی قطعی کوئی مرد ہے جو نسوانی نام سے اتنے عمدہ مضامین لکھتا ہے!

اور پھر طاہرہ دیوی شیرازی کا قصہ تو اب تک ادبی حلقوں میں تازہ ہے، جو آخر کار غلط ثابت ہوا اور جس کی طرف محترمہ موصوفہ نے اپنے حالاتِ زندگی میں ایک دردناک اشارہ کیا ہے۔ اس عالم میں نقادوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ "صنفِ مخالف" سے پورا پورا انصاف کر سکیں گے، محض باطل ہے، اور یہ کتنی افسوسناک حقیقت ہے! البتہ اُن نقادوں سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں جو انسانی سماج میں عورت کی واضح اہمیت کے قائل ہیں اور جو اب رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے ساتھ ہی، ڈرتے جھجکتے ہی سہی، ہاجرہ مسرور، تسنیم سلیم چھتاری اور قرۃ العین حیدر کا ذکر بھی کر دیتے ہیں،

اردو افسانے کی تاریخ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے میرا اس بار بار کی دہرائی ہوئی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہوگا۔ یہاں صرف جدید رجحانات کی طرف چند اشارات مقصود ہیں، جو اس کتاب کے افسانوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں اور ان کی فنی اہمیت کو واضح کرنے میں شاید ممد ثابت ہو سکیں، ہر افسانے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرکے

میں پڑھنے والوں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہتا،

نقوشِ لطیف میں صرف نئی لکھنے والیوں ہی کو شامل نہیں کیا گیا، بلکہ یہ مجموعہ اس دَور کی تقریباً تمام زندہ خواتین کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ خواتین بھی شامل ہیں۔ جو مدتوں سے افسانے لکھتی آ رہی ہیں، اور جو اس دَور سے تعلق رکھتی ہیں جب افسانے پر پلاٹ کی حکمرانی تھی اُس دَور میں واقعہ کو محض اس کی دلچسپی کی بنا پر پیش کردینا زبردست فنی خوبی سمجھا جاتا تھا،

حجاب امتیاز علی (جو بدقسمتی سے اس مجموعہ میں شامل نہیں) مسز عبدالقادر، صالحہ عابد حسین اور طاہرہ دیوی شیرازی اُسی دَور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں کی مقبولیت محض اس وجہ سے قائم ہے، کہ ان کے بیان کردہ واقعات میں خیالات کی کمی محسوس نہیں ہوتی، اور اگرچہ واقعات کی حرکت اور تسلسل ان کی کہانیوں کا نمایاں عنصر ہوتا ہے لیکن یہ کبھی کبھی ایسے کردار بھی تخلیق کرتی ہیں، جن کے محسوسات سے افسانے کے واقعات کو مربوط کرتے ہوئے ہمیں ذہنی آسودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

متعدد خواتین وسطی دَور سے تعلق رکھتی ہیں۔ فنکاروں میں کردار نگاری کی اہمیت کا احساس ہوتے ہی پہلے دَور کا ردِّ عمل شروع ہوا۔ یہ ردِّ عمل انتقامی جذبے کے ماتحت تھا، اس لئے بہت سی فضول کہانیاں لکھی گئیں، استعاروں اور تشبیہوں کی افراط سے افسانوں کی فضا کو بوجھل کر دیا گیا، نفسیاتِ انسانی کو اجاگر کرنے کی کوشش میں الجھاؤ پیدا ہونے لگے اور پھر اسی صُورت کا ردِّ عمل شروع ہوا، پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کا احساس سنجیدہ ہونے لگا۔ رشید جہاں، حمیدہ سلطان، شیریں، شکیلہ اختر، صدیقہ بیگم، شفیق بانو، شائستہ اختر، عائشہ ورّانی، رسیدہ اشرف اور سعیدہ اشرف نے بیشتر ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں نہ ہمیں پلاٹ کی کمی محسوس ہوتی ہے نہ کردار نگاری کی، افسانے کی یہ دونوں حیثیتیں

اِن کی کہانیوں میں ساتھ ساتھ چلتی رہیں، اور ہر خیال کا قاری اِن سے محظوظ اور مستفید ہوتا رہا،

اچانک چند ہونہار ترقی پسندوں نے افسانے میں واقعات کو قطعی ثانوی حیثیت دے دی، اور ایک فرد کے خیالات یا محسوسات کے مکمل بیان کو افسانے کا پلاٹ قرار دیا۔ عصمت چغتائی۔ ہاجرہ مسرور، تسنیم سلیم چھتاری، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر۔ کوشلیا اشک۔ ممتاز شیریں، سرلا دیوی، سحاب قزلباش اور زہرہ جبیں سنے ایک ذہنی تجربے، ایک حسیاتی عمل کے بیان کو افسانے کی صورت دینا شروع کی، اور صنعتی زیب و زینت کی بجائے نفسیاتی تحلیل کو احسن سمجھا، اگرچہ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں بھی کئی مرتبہ ہمیں ہر جہت سے مکمل پلاٹ مل جاتے ہیں، لیکن اِن کے ہاں واقعات کا ایک کردار پہ اثر انداز ہونا ہی فن کا کمال ہے، انھوں نے اس بیکار سوچ میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا، کہ ہمارا روایتی نقاد کیا مانگتا ہے۔ اگر وہ اصطلاحات پارینہ کے بوجھ تلے دبے ہوئے علم تنقید سے ڈر جاتیں تو اُن کا یہ خوف اُن کے آرٹ کی موت کے مترادف ہوتا۔ پہلے گروہ نے پلاٹ کو نکھارا اور سنوارا، دوسرے نے پلاٹ اور کردار نگاری کو شیر و شکر کرنے میں انتہا درجے کی فنی مہارت سے کام لیا۔ اور تیسرے گروہ نے پلاٹ کو یکسر مردود قرار نہ دیا، بلکہ اُسے پس منظر میں لے جا کر کردار کو اُبھارا، اور افسانے کو ایسی ہیئت بخشی، جو قدیم و جدید کا ایک خوشگوار امتزاج بھی ہے، نئے امکانات بھی پیش کرتی ہیں۔ اور ہمارے مشرقی مزاج سے بھی ہم آہنگ ہے،

---

* میرے خیال میں کہانی سُنانے کے لئے عورت مرد سے زیادہ موزوں ہے،

بشرطیکہ کہانی کو صحیح معنوں میں کہانی سمجھا جائے۔ اسے سیاسیات، کلچر یا مذہبیات پر دعظ
کی صورت نہ دی جائے، عورت کی اس خصوصیت کا باعث یہ ہے کہ مرد کے مقابلہ میں سماج
سے اُس کا رابطہ زیادہ گہرا اور حسین ہے، عورت ہماری منقلب سوسائٹی سے براہ راست
متاثر ہے، اور اس کا سماجی شعور مردوں سے پختہ ہے، اس لئے جب وہ اعلیٰ رنگ
کے افسانے سنائے گی تو اُن میں ایسی بے ساختگی، واقعیت اور زندگی کی تعمیری تنقید
کو سمو دے گی۔ کہ اسکے سننے سے ہم اپنے معلومات میں اضافہ ہوتا محسوس کریں گے حقیقت
یہ ہے کہ عورت ــــ اگر وہ اچھی فنکار ہے ــــ ایسے افسانے لکھنے پر قادر ہے،
جو مرد مشکل ہی سے لکھ سکیں گے۔ اس کے بیان میں سادگی ہوگی، وہ مبہم معاملات کو نہایت
لطافت اور روانی سے سلجھاتی چلی جائے گی۔ اُسکے تخلیقی اشارے اجمال کی بہترین مثالیں
ثابت ہوں گے، اسکے مشاہدے میں گہرائی اور خلوص اور اسکی تحریر میں جلت بصیرت اور
ترنم ہوگا۔ وہ اپنی فطری حیا کے باعث فنی شائستگی اور لطافت کو کبھی مجروح نہیں کریگی،
اور جب زندگی پر تنقید کرے گی، تو شگفتگی کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ عورت فطری طور پر
نہایت جذباتی ہوتی ہے لیکن جو عورت "جذباتیت" سے بچ کر شدت احساس سے کام لے
سکے گی، اور فنی لوازمات کا لحاظ رکھتے ہوئے متحرک و رقصاں زندگی کو آنسوؤں کی چلمنوں
اور مسکراہٹوں کی پھواروں سے سجا کر پیش کرے گی، وہ ایک عظیم آرٹسٹ ہوگی، اور
پھر یہ تو ایک مسلمہ سچائی ہے، کہ شدت احساس کا مقام ہی تخلیقی مقام ہے، اور وہی
تخلیق ممتاز و جلیل ہے، جو شدت احساس و وفورِ جذبات کی حامل ہو،

میں بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کر سکتا ہوں، کہ شروع شروع میں ترقی پسند افسانہ
نگاروں نے اُردو افسانے کو جنس، اور مزدور کے موضوعات میں الجھا کر شدت سے

جکڑ لیا۔ اور افسانوی ادب کو اس درجہ محدود کر دیا، کہ کچھ عرصے تک یوں معلوم ہونے لگا، جیسے عورت اور مزدور کے سوا اس زمین پر کوئی دوسری مخلوق نہیں بستی۔ یہ فخر صرف خواتین افسانہ نگاروں کو حاصل ہے، کہ انہوں نے افسانوی دُنیا کی بے پناہ وسعتوں کا احساس عام کیا، اور ہر ایسے موضوع پر لکھا، جو انہوں نے دیکھا، محسوس کیا، اور برکھا، مقررہ موضوعات کی حدیں توڑ کر افسانہ نگار خواتین نے ادبی تالاب کی سطح پر ایک دلآویز تموج پیدا کر دیا۔

یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوتی ہے، کہ خواتین کے یہاں موضوعات کا نہایت وسیع تنوع موجود ہے، اور وہ بھیڑ چال سے یکسر آزاد رہی ہیں، ہر خاتون نے ایک ایک موضوع کو اپنا لیا ہے۔ اور تقسیم کار کا ایک نہایت دلربا نمونہ پیش کیا ہے، اُردو ادب میں اگر ان خواتین کا وجود نہ ہوتا، تو ہم میں سے بیشتر حضرات ابھی تک مزدور کی دیوالی اور بیوہ کی عید کے متعلق ہی لکھ رہے ہوتے! عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور رضیہ زبیری کے افسانوں سے ہم متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی سماجی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں، تسنیم سلیم چھتاری اونچے طبقے کے نوجوان مرد اور عورت کے ذہنی نشیب و فراز کو اجاگر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، قرۃ العین حیدر کی انفرادیت اس درجہ نمایاں ہے۔ کہ بورژوا طبقے کو ابھی مدتوں تک کوئی ان سے بہتر نمائندہ شاید ہی مل سکے، سحاب قزلباش نے ایک بالکل نیا تخیلی رنگ اختیار کیا ہے، صدیقہ بیگم کمیونزم سے متاثر ہیں، صالحہ عابد حسین پرانے افسانہ نگاروں کے رنگ میں لکھنے کے باوجود ایک خاص معصوم اور محترم حیثیت کی مالک ہیں، مسز عبدالقادر نے ایک ایسا موضوع کامیابی سے اپنایا ہے جس میں اب تک کوئی مرد بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانے ہندوستان

میں آسکر وائلڈ کے فنی نظریات کی صدائے بازگشت کی حیثیت رکھتے ہیں، حجاب امتیاز علی کی ایک الگ دُنیا ہے، جہاں زندگی جیسے صرف چاندنی اور سنہری ریت اور خوبصورت پھولوں ہی سے عبارت ہے، رشید جہاں اور شیریں کو ہر طبقے کے گہرے مشاہدے کا فخر حاصل ہے، کوشلیا اشک اپنے محترم خاوند کی طرح متوسط ہندو گھرانوں کا نہایت مکمل عکس پیش کرتی ہیں، ان کے علاوہ دیگر خواتین بھی تقسیم کار کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے اپنے رنگ میں پائدار ادب تخلیق کر رہی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کا نقاد جونہی کہ ان کی نگارشات کو دیکھے گا۔ اور حیران ہوگا، کہ اتنی بڑی اور ہر لحاظ سے نمائندہ جماعت کے متعلق ماضی کا نقاد کیوں خاموش رہا!

"تہذیب نسواں" اور "ادب لطیف" کی ادارت کے دوران میں (۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک) میں نے محسوس کیا، کہ افسانہ نگار خواتین کی حق تلفی بدستور جاری رہے گی، کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے یہاں بیشتر تعداد ایسے نقادوں کی ہے، جو تخلیقی چیز پیش کرنے کی بجائے دُوسرے نقادوں کے مضامین کو سامنے رکھ کر الفاظ بدلنے اور سطروں کو بڑھانے گھٹانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اور چونکہ اُن کے محبوب مضامین میں خواتین کا ذکر نہیں ہوتا، اس لئے تقلید اور نقل کے فطری اصول کے ماتحت اُن کے ہاں بھی افسانہ نگاروں کی اس زبردست جماعت کا تذکرہ مفقود ہوتا ہے۔ تہذیب میں میں نے کئی ایسی خواتین کے افسانے شائع کئے جو ادبی حلقوں میں یکسر غیر معروف تھیں۔ لیکن جن کے افسانے فنی لحاظ سے تکمیل اور برسوں کی مشق کے نتائج معلوم ہوتے تھے، ادھر ادب لطیف میں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور۔ قرۃ العین حیدر ممتاز شیریں اور شکیلہ اختر کے افسانے دیکھے، اُدھر تہذیب میں زہرہ جبیں، سیدہ اشرف

دنیا میں تھوڑی دیر کو جنس بھول کر صرف ادب اور فن ہی کو یاد رکھا جائے[1]
میں نے اسی لئے ریڈیو سے بائیکاٹ کر رکھا ہے، کہ وہاں بچوں،
دیہاتیوں اور فوجیوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی ایک خاص پروگرام
ہے۔ لیکن افسوس بے چارے مردوں کے لئے کوئی خاص پروگرام نہیں
—— امید ہے کہ آپ میرے اصول کی بنیادوں کو پہچانیں گے اور
اسے ایک بہانہ نہ سمجھیں گے۔"

آخرکار انہوں نے مجھے افسانہ اور مضمون کی شمولیت کی اجازت دے دی، لیکن میں ان پر یہ بات شاید واضح نہ کر سکا کہ اردو ادب میں عورت مرد کا امتیاز کھڑا کرنے کی بجائے میرا مقصد اردو ادب میں افسانہ نگار خواتین کی حیثیت کی تعیین تھی، اور اس خواہش کی متعدد وجوہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں، یہیں ممکن ہے کہ عصمت صاحبہ کی بجائے مردوں سے بے پناہ ہمدردی ہی میرے مقصد کو شکست بخشنے کا باعث ہوئی ہو۔

نقوشِ لطیف کی ایک کمی ادب اردو کے ہر بہی خواہ کو کھلے گی، لیکن یہ ایک ایسی کمی ہے، جس کو دور کرنے کی میں نے ہر ممکن سعی کی، مگر کسی نامعلوم وجہ سے میں بُری طرح ناکام ہوا۔ پرانے افسانہ نگاروں میں جناب امتیاز علی تاج غائب ہیں، یہ ایک ایسی خامی ہے جس کا مجھے ہمیشہ گلہ رہے گا، البتہ یہ اطمینان ضرور ہے، کہ میں نے اپنے فرض کی بجا آوری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ستمبر ۱۹۴۵ء سے لے کر جون ۱۹۴۶ء تک میں نے کتنی مرتبہ بالواسطہ اور بلاواسطہ محترم موصوف سے افسانہ حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر مجھے نہ کبھی خط کا جواب ملا اور نہ میرے ہمدردوں کی کوئی کوشش کارگر ثابت ہوئی

[1] "[illegible] زندگی کے [illegible] متوجہ ہوں۔ (مرتب)

، کسی فن کار سے مجھے اس حیران کن عدم توجہی کی امید نہیں ہو سکتی تھی، اور یہ حقیقت ہے کہ حجاب امتیاز علی ہمارے افسانوی ادب میں ایک بے مثل حیثیت رکھتی ہیں، اُن کی عدم شمولیت کے عزم کے متعلق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ ع

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

نئی افسانہ نگاروں میں ناہید عالم، سلمیٰ رشید، زینت ساجدہ، رضیہ رعنا۔ اُم کلثوم اور دیگر خواتین کے پتے باوجود سعیٔ بسیار کے معلوم نہ ہو سکے، میں ان تمام خواتین سے معذرت خواہ ہوں، انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا،

اس مجموعے کی ترتیب کے متعلق بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے، مہدی علیخاں فضل حق قریشی اور عبدالرحیم شبلی کے مرتب کردہ مجموعے نیز شاعر (آگرہ) کا افسانہ نمبر افسانہ نگار خواتین کی ادبی خدمات کے اعتراف کی اچھی مثالیں ہیں، لیکن میں افسانہ نگاروں کی بھرپور نمائندگی کے علاوہ فنکاروں کے فنی نظریات بھی پیش کرنا چاہتا تھا، اور میں مسرور ہوں کہ میرا مرتب کردہ سوالنامہ جو مندرجہ ذیل آٹھ استفسارات پر مشتمل تھا، ایک گراں بہا تنقیدی ذخیرے کی بنیاد ثابت ہوا، سوال نامہ یہ تھا۔

۱۔ آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی؟

۲۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟

۳۔ جدید اردو افسانہ نگاری میں جنسی تجزیہ کی رو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

۴۔ آپ افسانے میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہیں، یا کردار نگاری کو، یا دونوں کو؟

۵۔ آپ کے فن پر غیر ارادتاً کس افسانہ نگار کی زبان اور بیان اثر انداز ہوئے ہیں؟

۶۔ اپنے فن کا موجودہ اسلوب اپنانے میں آپ نے ارادتاً کیا کیا کوششیں کیں؟

۷۔ اپنے فن کے بارے میں آپ نے مستقبل کے لئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے؟
۸۔ کیا آپ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟
ان خالص تنقیدی استفسارات کے متعلق چند بہنوں نے جو کچھ لکھا، وہ اس لحاظ سے قابل توجہ ہے، کہ خالص فنکاروں میں (وہ مرد ہوں یا عورتیں) تنقیدی موضوع احساس کمتری کا کیسا عجیب سا ردِ عمل پیش کرتا ہے، اور جن فن کاروں کو سوالات کی شدید علمی نوعیت کا گلہ ہے، انہوں نے ہر سوال کے کیسے چھچھے تلے جواب لکھے ہیں تسنیم سلیم چھتاری نے جوابات کے آخر میں لکھا۔

"سوالات پوچھنے والے کی اہمیت نے مجھے لاچار کر دیا کہ میں جواب دوں، ورنہ یہ سارے راز تو میری تحریر سے کھل جاتے ہیں۔ جب میں قطعی مسلح نہیں ہوتی، اور نہیں جانتی کہ کہاں کونسی بات کو پکڑ کر مجھے مطعون کیا جا سکتا ہے۔"

قرۃ العین حیدر تحریر فرماتی ہیں:۔

سوالات اس قدر ٹیکنیکل اور اونچے قسم کے ہیں، کہ معلوم نہیں میں نے کیسے اور کیوں لکھنا شروع کیا۔ ارادتاً اور غیر ارادتاً کیا کیا کوششیں کیں اور کیا چیزیں اثر انداز ہوئیں —— مجھے واقعی معلوم نہیں کہ اس قسم کی سخت عالمانہ اور "یونیورسٹی" کی باتوں کے متعلق کیا لکھا جاتا ہے۔"

سیدہ اشرف نے یہ خیال ظاہر کیا:۔

"آپ نے جو قیمتی سوالات مجھ جیسے منزلِ ادب کے بے گاہ مسافر سے پوچھے ہیں، ان کے جوابات میں نہ جانے میری عقلِ خام کہاں تک

میرا ساتھ دے گی، ادب کے ان پیچیدہ موضوعات پر میری خیال آرائی مستند ادیبوں کا منہ چڑانے کے مترادف ہو گی، مگر اپنے ادبی اور اخلاقی فرض کی مجبوری میرے خوف زدہ حوصلوں میں جرأت پیدا کرنے کا باعث بنی ہے"۔

سترہ خواتین نے ترتیب دا سوالات کے جوابات لکھے، جامع اور مکمل جوابات کا یہ مجموعہ کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، مجھے یقین ہے کہ کتاب کا یہ حصہ اردو کے تنقیدی ادب میں ایک بالکل نئے، دلچسپ اور قیمتی اضافے کا موجب ہوگا عصمت چغتائی۔ سرلا دیوی ممتاز شیریں اور طاہرہ دیوی شیرازی نے تمام سوالات کا جواب مضامین کی صورت میں دیا، ذہین دماغوں کے یہ پر معنی اشارے کتاب کے شروع میں درج ہیں، اور نقوش لطیف کے معلومات افزا دیباچوں کا فرض ادا کر رہے ہیں، کوشلیا اشک نے بقول خود ابھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں پایا، کہ ایسے علمی قسم کے موضوعات پر روشنی ڈالنے کا انہیں حق حاصل ہو، مجھے انکی معذرت کا احترام ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے سوال نامے کا جواب حاصل نہ کیا جا سکا۔ دراصل وہ تو اس نوع کے مجموعے ہی کے خلاف تھیں، قرۃ العین حیدر اور صالحہ بیگم سیوہاروی نے میری دستگیری کی، ورنہ حجاب امتیاز علی کی عدم شمولیت کے ساتھ نئے افسانہ کی ایک مانیہ کی غیر موجودگی میرے مقصد کے لئے سخت مضر ثابت ہوتی،

اسکے علاوہ میں نے ہر خاتون سے ایک اپنی ہی پسند کا یعنی اپنا نمائندہ افسانہ اور حالات زندگی طلب کئے جو خواتین پردہ نہیں کرتیں اُن سے تصاویر کی استدعا بھی کی، مجموعے میں سرلا دیوی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، کوشلیا اشک، مسز عبدالقادر اور ممتاز شیریں کی عکسی تصاویر شامل ہیں، حالات سوائے دو خواتین کے سب نے لکھ بھیجے، ڈاکٹر رشید جہاں

کے حالات قرۃ العین حیدر کے ایک خط سے اور عصمت چغتائی کے حالات مختلف رسائل سے منقول ہیں۔

نقوشِ لطیف کی ترتیب و تدوین میں کئی محترم خواتین کے مشورے شامل ہیں، اگر صدیقہ بیگم سیوہاروی میری امداد کو نہ پہنچتیں، تو ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ حاصل کرنے میں میں بڑی حد تک ناکام ہو چکا تھا، حمیدہ سلطان نے شائستہ اختر سہروردی کو ٹیلیفون پر ٹیلیفون کر کے افسانہ لکھنے کو کہا، اور اُن کی گنجان مصروفیتوں کو اس کتاب کی ترتیب پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔ ہاجرہ مسرور نے عائشہ درّانی سے افسانہ وغیرہ حاصل کرنے میں مدد دی زہرہ جبیں، عزیز جہاں بیگم ادا بدایونی، ہاجرہ مسرور، شکیلہ اختر اور ممتاز شیریں نے نہایت اچھے مشوروں سے مستفید کیا، میں ان سب خواتین کے تعاون کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں،

بہن زہرہ جبیں نے "نقوشِ لطیف" کی لطافتوں میں ایک گراں بہا اضافہ فرمایا ہے یعنی اسکے لئے ایک ایسا گرد پوش تخلیق کیا ہے، جس کے دلآویز رنگوں اور رُوح نواز خطوں میں "نقوشِ لطیف" کی تمام رعنائیاں سمٹ آئی ہیں، میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی بہت تلاش کی ہے، مگر مجبور ہو کر اس پرانی حقیقت کا سہارا لینا پڑا ہے کہ وہ میری چھوٹی بہن ہیں، اور انہوں نے فن کے علاوہ بھائی کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔

میں بہن تسنیم سلیم چھتاری کا بہت ممنون ہوں، جنہوں نے نہ صرف شفیق بانو کا افسانہ اور حالات و خیالات مہیا کئے، بلکہ اس کتاب کا ایک لطیف اور ذو معنی نام تجویز کیا، کتاب کی ترتیب میں عزیزہ بہن ذہنی طور پر ہمیشہ میرے ہمراہ رہیں،

ان کے علاوہ میں دیگر تمام خواتین کا شکر گذار ہوں، جنہوں نے اس مجموعے کی تیاری

میں میرا ہاتھ بٹایا، اور مجھے ایک ایسے کام کی تکمیل کی سعادت بخشی جسے آنے والے دور کا
نقاد کسی صورت میں فراموش نہیں کر سکے گا۔

ن۔ م۔ راشد

۲۶ ستمبر ۱۹۴۶ء

انگہ ضلع شاہپور (پنجاب)

مضامین

جہاں را محکمی از امّہات است
نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند ،
نظامِ کاروبارش بے ثبات است

اقبالؔ

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی

ایک بات

کہتے ہیں ایک آدمی تھا، اس کی تھیں چار بیویاں اور کمبختیں سب کی سب توتلی۔ ایک دن چند دوستوں کی دعوت کی۔ میاں نے سختی سے بولنے سے منع کر دیا کہ نہیں تو ہنسی اڑائیں گے۔ پر جب انہوں نے کھانے کی تعریف کی تو بیویوں کا جی نہ مانا اور بول ہی اٹھیں۔ تین تو خیر اپنی اپنی تعریف میں بولیں پر چوتھی نے کہا "بھلا ہوا جو ہم نہ بولے میاں آئیں گے تو جوتے لگیں گے"

تو صاحب وہ جوتے لگے۔ مگر سب سے زیادہ ان آخری بولنے والی کے۔

تو آج کل ساقی سب کی باتیں سن رہا ہے۔ تو ہم کیوں چپ رہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں آج کل تو باتوں کا عام موضوع "نیا ادب" ہے۔ ہمدرد لوگ انسانیت، اخلاق، ادب اور تہذیب کو گمراہی سے بچانے کے لئے اس شتر بے مہار یعنی نئے ادب کے پیچھے ہر قسم کے ہتھیار لے کر حملہ آور ہوتے ہیں، اور قبلہ اور نٹ صاحب کچھ بوکھلائے نظر آرہے ہیں اللہ جانے کس کروٹ بیٹھتے ہیں یا اور بدحواس ہونے کا ارادہ ہے

سنا ہے کہ جب اونٹ کو غصہ آتا ہے تو دشمن کی کھوپڑی اتار لیتا ہے۔ کیا معلوم

سچ ہی!

اور ذرا ہتھیار ملاحظہ ہوں ادب کانے والے!

"نیا ادب فحش نگاری ہے"۔

"نیا ادب سوائے جنسی الجھنوں کے کچھ نہیں"!!

"نیا ادب گر رہا ہے!!!"

یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے۔ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ذرا شانہ سے دوپٹہ ڈھلکا اور انکی آنکھوں میں خون اترا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خاص حصۂ جسم سے کیوں جلتی تھیں معلوم ہوا کہ محترمہ خود چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی کھٹائی کی شکل کی تھیں لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہو جاتی تھیں۔ بیچاری خالہ! نہ جانے کتنی خالائیں اور نانیاں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتیں بن جاتی ہیں

یہی حال نئے ادب نے پرانے ادب کا کر دیا ہے اور وہ اس کے شباب کی تپش سے پگھلا جا رہا ہے سمجھ میں نہیں آتا آخر اگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں۔ یہ مانا کہ یورپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بچپنے ہی سے کچھ اس انداز ...... کی ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت ہی نہیں رہ جاتی، وہ جب اس کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگتی اور یہاں سانپ پھنپھنانے لگتا ہے۔ کیوں صاحب کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آیندہ نسل کا خون چوسنے کے لئے زندہ چھوڑ دیں کیوں

نہ اس کا مچن جلد از جلد کچل کر قصہ پاک کر دیا جائے اور نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں۔ دشمن دین و دنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں؟

مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔ چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور وہ ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی باقی مطلب کی باتیں معلوم نہ ہوئیں۔ لہٰذا نظر انداز کر دیں مگر یقیناً عریاں جملے سو سو بار رٹے۔ ذرا غور کیجئے عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں اور لکھنے والا بُرا۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی فضول کو بھی دکھائی جائے اور ریلے کار سٹر کوں پہ ننگے گھومتے لگیں لیکن اگر غسل آفتاب کے لئے کسی ضروری حصہ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم۔

اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہو جائے تو یہ عریانی نہیں ہوتی بلکہ اسے علاج کہتے ہیں اور ہر وہ بزرگ جو اس سے چڑ جائیں قابلِ رحم ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ عریانی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اور اس عریاں ادب کے آئینے میں نہ جانے کیا لوگوں کو جھلک نظر آتی ہے۔ کہ وہ اپنے ٹلے کر غریب آئینے پر لعنت بھیں کہ دوڑتے ہیں۔ بھلا سوچئے تو اس میں آئینہ کا قصور ہی کیا؟

شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریانی دیکھ کر لوگوں کے رکیک جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں مجسمہ دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے! اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تو نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پڑھئے، ارے صاحب یہ تو زندگی کی تصویر ہے کھلی ہوئی سے

ڈھکی بھی ہے اگر عریانی ہے بھی تو کیا ضرور کہ مرگی کا دورہ ضرور ڈالا جائے۔ ضبط اور جذبات پر قابو بھی تو کوئی چیز ہے۔ اور ایسا عریانی میں عیب ہی کیا ہے جو آپ ادب کی عریانی سے لرزے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دُنیا کی عریانی سے لرزا اٹھا ہے۔ اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے وہ تو صرف حروف میں انہی باتوں کو منتقل کر رہا ہے۔ جو دنیا میں ہو رہی ہیں۔ نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے برسوں بعد جب یہ نیا ادب نیا نہ رہیگا تب بھی اسی طرح سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہیگا۔ یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ نئی دنیا گندی ہے، جس کی یہ تصویر ہے۔ مصور کا کیا قصور؟

تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اقتصادیات کو بھی ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا، خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دور رکھیں۔ پھر بھی دبا چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا۔ اس نئے ادب سے پہلے رومان اور مزاح کا زور تھا۔ پطرس عظیم بیگ۔ رشید احمد۔ شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج۔ فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم و بیش ایک ہی سا لکھتے تھے۔ ذرا غور سے پڑھیئے وہی بیوی کے مظالم، دوستوں کی خوش مذاقیاں۔ گھریلو جھگڑے سب کے سب ایک ہی بات بار بار لکھتے تھے۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ سب کا رنگ جدا تھا۔ اور اب نئے ادیب کیا لکھ رہے ہیں۔ جنسی الجھنیں۔ امیر و غریب کے جھگڑے، زندگی سے جنگ اور جملہ دُنیا کی تلخیاں ایسا تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے۔ کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے۔ اسے صاحب طرز یا پھیلتا ہے تو سب

کو کو نین ہی دیتے ہیں دُکھ درد میں سب انسان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں۔
کوئی گانا تو ہوہی نہیں رہا جو شہزادوں میں ہو۔ پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور
نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو یہ دُنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں
تھی اور اب آپ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھئے دنیا ننگی، بھوکی، چور، اچکی اور مکار نظر
آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاولی اور مثنوی گلزار
نسیم لکھنے لگیں۔ فسانہ آزاد اور مذاقیہ کہانی لکھتے چلے جائیں نئے ادیب زیادہ تر
ننگے بھوکے اور حساس ہیں۔ دل و دماغ زیادہ تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ اور
ذرا سی چوٹ سے بھنا اُٹھتے ہیں۔ انکے بھیانک خواب بھی کی اور بھی بھیانک تعبیریں یا
یہ ہماری دُنیا کا نقشہ ہے۔ بُرا ہے یا اچھا۔ یہ فیصلہ آئندہ پود کے ہاتھ میں ہوگا
کہ وہ اسے سینہ سے لگائے یا ٹھکرائے۔ ہم اور آپ کبھی انصاف سے کچھ نہیں کہہ
سکتے اور آپ کا فیصلہ بیکار ہے جو چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے وہ دب نہیں سکتا
آپ کے اعتراض اور طعنے اسے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ چیخے
گا—— دُکھ ہوگا تو روئے گا۔ یہ جنسی بھوک ہے جس پر مہذب لوگوں کو اعتراض ہے
اسی طرح کہانیوں میں چھلکے جائے گی۔ جب بھوک ہی ٹھیری تو پھر ہائے ہائے کیوں
نہ ہو۔ نئے ادیب اتنے شرمیلے اور بزدل نہیں جو طعنوں تشنوں سے ڈر جائیں گے
یہ جنسی پکار جو افسانوں میں نظر آ رہی ہے۔ کیا اس کا تعلق اقتصادی اور معاشرتی حالات
سے کچھ بھی نہیں۔ کیا اس میں آپ کو سیاست کی چاشنی نظر نہیں آتی آپ نے ڈیمانڈ
اور سپلائی (DEMAND & SUPPLY.) کے متعلق اکنومکس میں پڑھا ہوگا۔
ذرا اس نکتے کو ہماری موجودہ زندگی پر پرکھئے جنسی ڈیمانڈ بھی ہے اور سپلائی بھی

مگر مارکیٹ نہیں یعنی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی اور خواہشات بھی، مگر اُن کا ذکر بے شرمی، ہندوستان کے لوگ غریب ہیں اکثر نادار ہیں، ناداری میں شادی مصیبت ——— ناداری میں عیاشی گناہ ——— ناداری میں جینا منع۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ ہمارے نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے کے دُنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو اُلٹا ہمارے لئے مصیبت ہو گیا کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ "دُنیا کے دوسرے انسان کیا مزے اڑا رہے ہیں۔ مزے سے اپنی جھگڑی میں مگن رہتے ہیں، مگر اب ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے نوجوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عیب، ہر بات گندی عریاں اور مخرب۔ اخلاق۔ وہاں عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی کے خواب دیکھنا جُرم! خیر اگر یہ مصیبتیں تھیں تو کم از کم احساس ہی کُند ہوتا۔ کاش مٹی کے تودے ہوتے جو نہ سنتے نہ دیکھتے نہ دُکھ سُکھ سے چلاتے۔ زمانہ کی ٹھوکروں میں لڑھکتے فنا کی طرف چلے جاتے مگر نئی دُنیا کا تیا بٹیا ہندی، بدمزاج اور اکھڑ ہے وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک نئے نظام کے لئے بے کل ہے۔ وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر ابھی تو وہ بدنظمی سے متنفر، غصہ ہو ہو کر اپنی بوٹیاں چبا رہا ہے خود اپنا ہی جسم اور رُوح چیر کر پھینک رہا ہے۔ اور کل وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر دوسرا نظام بنائے گا۔ مگر اس نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑیگا کس کس کے پیروں سے روندا جائے گا ——— اور جو باقی رہیگا وہ نئے نظام کی تکمیل کرے گا۔

یہ نظام کیا ہوگا؟ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔ نئے ادب کے پڑھنے سے اندازہ

ہوتا ہے کہ اِس نئے نظام میں دُکھ، بھوک اور افلاس تو نہ ہوگا ——— فاقے ———
جنسی اور رُوحانی نہ ہوں گے، بدمعاشی نہ ہوگی، طوائفوں کے اڈّے نہ ہوں گے
اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے گھر ہوں گے۔ جہاں انسان رہے گا ———
عورتوں کو بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ موریوں میں عذاب دوزخ بن کر نہیں بیٹھنا پڑیگا
مرو حیوانیت سے دُور ہوں گے۔ قدرت کے اصول کے مطابق جو انسان پیدا ہونگے
وہ انسان مانے جائیں گے اور انہیں صرف سماج کا پیٹ بھرنے کے لئے حلال نہیں
کیا جائے گا۔ شادی بیاہ صرف پیسے ہی والوں کے نہ ہوں گے بلکہ ہر تندرست انسان
کو مکمل زندگی گذارنے کا حق ہوگا۔

نیا ادب پکار پکار کر انسان کو جینے کا حق دلانا چاہتا ہے۔ زندگی اور اس کے
سارے لوازمات جو باپ دادا کی وراثت بن گئے ہیں۔ انسان کا حق ہو جائینگے
نئی دُنیا کے دُکھ بہت بڑھ گئے اور نیا ادب اسی دُنیا کے دُکھوں کی آہ ہے جو
دُنیا کے ہر ذی رُوح نوجوان کے چپہ چپہ جسم سے نکل رہی ہے۔ طعنے دینے سے کچھ
نہیں ہوتا۔ بڑھیاں طعنے دیتے مرگئیں ——— بوڑھے لاحول پیتے چل دیئے۔ مگر
نوجوان زندگی کی کشمکش میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ مٹنے کے لئے تیار نہیں، وہ بُزدل
نہیں اور اُسے بے شرمی کے خطاب سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ جب ادب کا سوال
آتا ہے۔ تو اس میں زنانہ مردانے ادب کا کیا سوال۔ جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں
وہ لڑکیوں کو کب پسند آسکتا ہے۔ مرد اگر چیخ سکتا ہے۔ تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت
ہونی چاہیئے۔

نئے ادب کا اعتقاد ایک ننگ جنسی کتاب سے کہتے ہیں بالکل ٹھیک لیکن

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملک کے لوگ جنسی معلومات پر لکھی ہوئی کتابوں کو صرف لذت کے لئے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ نئے ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں جنسی معلومات پر کتابیں طبی اصول واضح کرنے کو لکھی گئی تھیں لیکن لوگ ان سے ادبی ذوق فرمانے لگے اور اسی طرح نئے ادب کو ناول اور افسانہ سمجھ کر مزہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر بجائے اس میں چٹخارے دار مسالہ کے جیب کو ہیں نکلنی ہے۔ تو غریب ادیب کے جہنم میں ٹھونکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات نئے ادیبوں سے! ان فضول طعنوں کی پرواہ نہ کیجئے۔ یہ اعتراض کب نہیں ہوئے؟ کس نے نہیں کئے؟ سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو؟ نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں یہ بزرگوں کے لئے ہے بھی نہیں، کچھ کہیں تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجئے۔ لکھئے ضرور لکھئے جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں وہ ضرور لکھئے نہ زبان کی غلطیوں سے ڈرئیے نہ اس بات سے ڈرئیے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں۔ کچھ بھیانک درندے ہیں۔ کچھ خوفناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل کے لئے اسے لکھ جائیے۔ اس کا سبق آپ ہی کے تجربے ہوں گے۔ آپ کے ہی مشاہدے ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے اچھا برا کڑوا کسیلا سب کچھ لکھ دیجئے اور وہ خود اگلیں جو ہمارے شریر مریض پینے سے انکار کر رہے ہیں اور بے طرح مچلے جاتے ہیں آئندہ نسلیں انہیں فخر یہ احترام سے لیں گی۔ کیونکہ آئندہ نسل زیادہ سمجھ دار روشن دماغ اور اچھے برے کو پرکھنے والی

پیدا ہو گی۔ اسکے لئے یہ خوراکیں بھاری ہوں گی وہ نسل واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پڑھے گی۔ اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو عریانی اور سچی بات سے بھڑک اٹھا جائیں جیسے شیر کی بُو پاکر گھوڑا بدکنے لگتا ہے۔ لکھئے اور اتنا لکھئے کہ یہ ان کے لئے بالکل معمولی بات ہو جائے اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب جیسے ادبی مادے سے تباہ کر دیجئے اور یہی روئی کے گالے جن میں ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اُڑ جاتے ہیں برف کے گالے بنا دیجئے جن میں انگارے بھی سرد پڑ جائیں۔

اور چلتے چلتے ایک بات ان بزرگان قوم سے کہ یہ نوجوانوں پر اعتراض تو اب پرانا فیشن ہو گیا —— اور پرانی چیز کو دفن ہی کر دیا جائے۔ تو بہتر ہے بیشک آپ کو بُرا لگتا ہے۔ اور آئندہ ادب ان موجودہ ادیبوں کو بُرا لگے گا۔ موت کسی کو اچھی نہیں لگتی۔

ان اصحاب کو کیوں کر سمجھا جائے جو خود تو خوب لکھ چکے اور اب تائب ہو گئے ہیں نصیحت پر تُل گئے ہیں۔ ایک صاحب تو بہت ہی بگڑ گئے۔ اور انہوں نے چند لاجواب اشعار بھی گنہگاروں کو راہِ راست پر لانے کے لئے لکھے۔ جن کی داد دئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ مجھے بدقسمتی سے اُن کا قافیہ اور ردیف اس وقت یاد نہیں رہا مگر معنی جو دل پر نقش ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ادیب ایسی فحش نگاری کرتے ہیں تو کیا ان کی بہن ماں نہیں۔ علاوہ شاعری حسن کے یہ ایک بالکل نرالا اور شاعرانہ گالی دینے کا مہذب طریقہ ہے اور مجھے از حد خوشی ہوئی کہ اور باتوں میں پیچھے سہی لیکن اس ہنر میں ہم ہر ملک سے بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ ان حضرت سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ اگر ماں بہنیں نہ ہوتیں تو پھر شاعر کہاں ہوتا؟ یہ ادب سے گپ

اور خرافات تو ہے نہیں کہ نشہ پی کر لکھ ڈالا۔ نیا ادب زندگی کی تصویر ہے اور
اسکے لئے ماڈل ور کار ہیں پھر آپ کہیں گے۔ "شرم نہیں آتی!"
"جی سچ مچ کی تو نہیں آتی —— اگر آپ کہیں تو رعایتاً شرمانے کو تیار ہیں"
اگر مصور شرمانا ہی شروع کر دیتے تو آج آپ کو آرٹ نظر نہ آتا اور پھر نئے
ادیب آئینہ ساز ہیں، ہر شخص اس آئینہ میں منہ دیکھ کر شرما سکتا ہے۔
اور —— ہاں بس ایک بات اور ان اچھے فرمانبردار بچوں سے جو اخلاق
اور تہذیب کے حامی اور ادب سے اُسے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز نہ نیا ادب
لکھیں اور نہ پڑھیں۔ کیونکہ نیا ادب "اخلاق" اور "تہذیب" کی دھجیاں بکھیرتا ہے۔
یہ تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو بے خوف اور بے جگرے ہیں جن کا ہاتھ بھی
سڑ جائے تو اُسے کاٹ کر پھینک سکتے ہیں کُجا جھوٹی اور بناوٹی سوسائٹی ——
جو اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اخباروں نے بائیکاٹ کر دیا یا ادیب رُوٹھ
گئے —— اور وہ دن دُور نہیں جب اس ادب کا ریزہ ریزہ لوگ پلکوں سے
چُن لیں گے۔ مؤرخین، گورنمنٹ اور محکمہ تعلیم والے اس کو جمع کر لیں گے۔ اگر یہ
موجودہ ادب موجودہ زمانہ کی سچی تصویر ہے تو خود بخود عجائب خانہ کی زینت بن جائیگا
اور اگر کوڑا کرکٹ ہے تو اپنے راستے لگ جائے گا —— ہمیں کیا فکر؟

سرلا دیوی

سرلادیوی

نیا ادب

اس صدی کے آغاز میں اس حقیقت کا احساس کہ ورثہ میں انہیں غلامی اور تنزل کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔ ایک عظیم حادثہ تھا جس کا جھٹکا ہر انسان کی ذہنی سطح پر محسوس ہوا۔ یہ زنجیر کے حلقوں میں بیدار ہوتی ہوئی پہلی حرکت تھی مگر عام انسان اس حقیقت کے معانی سے آشنا نہ ہو سکا۔

اس حادثہ اور ذہنی زلزلہ کے اثرات وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف نمایاں ہوتے گئے بلکہ زندگی کی رگوں میں انکی سرسراہٹ بھی محسوس ہونے لگی اور اس موہوم سی بیداری اور خفیف سی حرکت کا احساس سمندر میں گرم رووں کی طرح یخ بستہ تخیلات و احساسات کو پگھلاتا گیا۔ آزاد کرتا گیا حتیٰ کہ وہ حرکت اب ایک تحریک کے روپ میں خس و خاشاک کو بہاتی طوفانی رَو کی طرح نظر آتی ہے اور نیا ادب کچھ بھی نہ ہو۔ وہ اپنی قومی بیداری کا پہیا کہ وہ نئی کرنوں کا

انعکاس اور جاگتے ہوئے انسان کا ٹوٹا پھوٹا درد آمیز مگر پہلا تکلم ضرور ہے۔ دلکش ترین حسین ترین نہ سہی مگر زندہ ترین اور حرکت پذیر ضرور ہے۔ وہ نہ کوئی ادبی تحریک ہے اور نہ فنی اختراع ——— وہ تو ذہن میں پھٹتی ہوئی پو اور تخیل میں پھولتی سرسوں کا سونا ہے۔

"نیا ادب" کی پیدائش اور نشو ونما تو "علاؤالدین کے چراغ کا دیو" والا مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اتنے قلیل عرصہ میں نیا ادب ذہنی وسعتوں پر پھیل کر زندگی کے ہر پہلو پر حاوی و طاری ہو گیا ہے۔ ذہنی خلا میں اس نے اپنے خد و خال کو پوری طرح واضح اور نمایاں کر لیا ہے۔ رجعت پسندوں کے لئے یہ عیش یا ٹھگسیوں کا سامان نظر آتا ثابت ہوا ہے۔

نئے ادب پر عام اعتراضات سے مجھے اس وقت غرض نہیں۔ مگر ہاں سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور اہم ترین اعتراض کا تذکرہ ضرور کروں گی۔ رجعت پسند فرماتے ہیں "نیا ادب کلاسیکی ادب نہیں ہو سکتا۔ وہ بحرانی اور ہنگامی ہے کیونکہ وہ زندگی کے متعلق کچھ کہتا ہے اس لئے وہ اس زندگی کے بدلتے ہی فنا ہو جائے گا۔" ——— مذکورہ بالا سطور میں حقیقت کی چھاپ ہے یا نہیں میں یہ بتانے سے قاصر ہوں ہاں اُن میں سرمایہ دارانہ دور کی جھلک صاف نظر آتی ہے کہ ادب کسی پیر کا مزار ہے اور اُسے ابد تک زمین کے سینے کا بوجھ بنے رہنا چاہیئے۔ ——— کہ ایک ادیب کو آپ سے آپ کی نسلوں سے اپنی ہڈیاں دھلواتے رہنا چاہیئے۔ یہ کونسا ادبی اور تنقیدی معیار ہے شاید کوئی ترقی پسند نہ سمجھ سکے گا۔

زندگی ارتقار ہے اور اس کے متعلق تمام چیزوں کو اس اصول کا پابند ہونا

چاہیئے۔ زندہ حقیقت یا Scientific truth اسی چیز کا نام ہے اور ترقی پسندی زندہ حقیقت کے علاوہ کسی اور دوسری چیز کا نام نہیں۔ نیا ادیب موجودہ زندگی کی زندہ حقیقت کا تجزیہ پیش کر رہا ہے اس کا ہر ادبی شاہکار اس کے راستہ کا ایک نقش ہے۔ منزل نہیں اور نقش سے زیادہ اہم منزل کی تلاش ہے نئے ادیب کی منزل اس دور کو ختم کر کے نئے دَور کو جنم دیتا ہے۔ اور محض اپنی قوم کے نقوش کو بچانے کے لئے وہ ابد تک ایک جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔

نئے ادب میں غلامی، بھوک اور جنسی تشنگی کا ذکر اس لئے ہے کہ یہ تین انگارے ہیں جو فنکار کے سینہ پر سلگ رہے ہیں۔ اور وہ اُن کی سوزش کو محسوس کرتا ہے اور اس سوزش کو دور کرنا چاہتا ہے۔ نیا ادیب ان موضوعات پر اس لئے نہیں لکھتا کہ وہ ہمیشہ برقرار رہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ان موضوعات پر آئندہ پھر کبھی نہ لکھے۔ غلامی اور افلاس سے جہاد شاید اعلیٰ ترین انسانی کارنامہ ہے انسانی تواریخ ہی خود غلامی اور افلاس کے خلاف انسانی جنگ کا فسانہ ہے۔ پھر تاریخ کا یہ نیا باب اور نئے دَور کا نیا ادب ارفع و اعلےٰ کیوں نہیں ہو سکتا۔ لافانی اور ابدی کیوں نہیں ہو سکتا۔ کچھ عام سمجھ سے باہر کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر خود ترقی پسند ادیب اپنی تخلیق کو ابدی اور لافانی لیبلوں کے ساتھ پیش نہیں کرتا۔ نیا ادب ان "ہسپتالی کپڑوں" کے مترادف نہیں۔ جن میں مریض کے خون کے دھبے ہیں۔ پیپ کے نشان ہیں اور ناسوروں کا مواد ہے۔ ان صابن کے جھاگوں اور کاربالک ایسڈ کے مانند نہیں ہے۔ جن سے صفائی کے بعد انسان اپنی وہ ریشمی اور زریں خلعت پہن سکے گا۔ جو اس کا ترکہ ہے۔ بلکہ نیا ادب قرآن

صاف فضیں اور تیز اوزاروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جن سے اس دور کا آپریشن کیا جا رہا ہے۔

"فید حیات اور بند غم" ــــــ انسانی تواریخ اس تلخ حقیقت کو بار بار دہراتی ہے۔ اور شاید انسانی المیہ اسکے علاوہ کچھ اور ہے بھی نہیں۔ زریں ترین دوروں سے پہلے اُن کے بعد میں اور خود اُن کے اندر عام انسان بھوک اور افلاس کے اگن کنڈ میں تھبتا رہا ہے۔ اور بند غم سے نجات کا راستہ آجتک کسی خضر نے تلاش کر کے نہیں دیا پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جو ادب عام آدمی کی زندگی سے اُگلا ہے اسکی مجبوریوں کا آئینہ دار ہے اور جو غمگین راگ کی گونج ہے کس طرح بے کار بے معنی اور فانی قرار دیا جا سکتا ہے۔

نیا ادیب ابدیّت کی پگڑی کا خواہاں نہیں۔ اپنی شہرت اور اپنے ادب کی دیرپائی کے لئے وہ دَور اور وقت کو تھامنے کا حامی نہیں وہ صرف ایک درخشاں دَور چاہتا ہے ــــــ اور اس نئی زندگی کے لئے پرانی زندگی کو قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ اپنے ادب کو کھنڈروں کی طرح چھوڑ کر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے رجسٹروں میں اندراج کا بھوکا نہیں ہے۔ وہ ایک نئی انسانی بستی کا شیدائی ہے۔ جہاں اُفق تک آبادی ہو۔ کھنڈروں کا نام و نشان تک نہ ہو ادب اُس کے نزدیک ایک ارتقائی اور کارآمد چیز ہے اسے اس دور کی ضرورت نہیں جہاں تاج محل ہو اور اسکے سائے تلے لاکھوں انسان بھوکوں مر جائیں۔

کرشن چندر کی رومانیت سے بیدی کی جذباتی سنجیدگی تک، منٹو کی "خواتین" سے عصمت کی شرارت تک ایک حقیقت عیاں ہے کہ اس خارجی انتشار اور تنوع

میں ایک ہی داخلی مرکزیت ہے اور وہ قومی زندگی ہے۔ سارے نئے ادیبوں کا فکر تخئیل اور پرواز ایک نقطے کے گرد ہے ـــــ زندگی تلخ زندگی تشنہ کام زندگی اور غلام زندگی ـــ نئے ادب کی رُوح تصور آزادی اور ادب تلاش آسودگی ہے۔ اس میں ادبی "تکلفات" کا فقدان ہو۔ مگر اسکی بنیادیں ٹھوس ہیں۔

غرضیکہ ترقی پسند ادیب محمد حسن عسکری صاحب کے تمثیلی ادیب کی طرح نہ تو ابدیت کا بھوکا ہے۔ اور نہ خُلد میں تخلیق کرنے والا "بہشتیہ ورد" ہے بلکہ وہ ایک انسان فنکار ہے جو غلام ہے اور بھوکا ہے۔ اس دَور سے غیر مطمئن ہے۔ اور باغی ہے۔ اسکے پاس مدھر نغمے اور رومانی پھلجھڑیاں ہیں۔ اسکی حالت کرشن چندر کے "ان داتا" میں ستار والے آرٹسٹ کی طرح ہے جس کے ایک ہاتھ میں فنون لطیفہ کی ستار تو ہے۔ پھر دوسرے ہاتھ میں اسکی لڑکی کا وہ کھلونا ہے جسے وہ سڑک کے کنارے پھینک کر چلا آیا ہے۔ وہ ساز میں محو تو ہے مگر ادب برائے ادب کے حامیوں کی منظورِ شُدہ "فینسی روئی" کو کانوں میں بھر کر انسانیت کے غمگین راگ کو نہ سننے سے قاصر ہے۔

اس سلسلے میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث ایک مقدس رسم کی طرح سامنے آجاتی ہے جس کے متعلق لوگ صرف "کچھ کہتے ہی" ہیں۔ آج کل نئے ادب کے سلسلے میں اس بحث یا مردے کو از سرِ نو اکھاڑنے والے ایک زمانہ میں اُردو کے مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری صاحب ہیں جو انہوں نے خالص ادب" کا پرچار اپنا مقدس فرض تصور کر لیا ہے اور اپنے "پوتر" نظریات کے پیش نظر افسانے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مگر یہ احتجاج ہے

زیادہ مجبوری ہے۔ کیونکہ ادب برائے ادب کے نظریہ کا اثر اور نتیجہ اسکے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا میاں خلیل کے فاختہ اڑانے کا دور اب ختم ہو گیا۔ کیونکہ موجودہ دور۔ زمانہ اور ماحول اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ ایک ادیب دوربین لئے ہوئے تباہ ہوتے اسٹالن گراڈ کو دیکھتا رہے۔ اور آسمان میں گھٹتے ہوئے تباہ کن دھوئیں پر محبوبہ کی زلفوں کا تصور باندھتا رہے ایک خالص ادیب آسکر وائیلڈ کے The rose and Nightingale کی تخلیق بے شک کر لے مگر ایک اسٹالن گراڈ کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ مادی حالات کو شعور سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مادہ خود ذہن کی پیدائش ہے۔

ایک عام حادثہ کو لیجیے۔ بنگال کا قحط۔ اس ملک کی زندگی میں کوئی انوکھا اچنبھا نہ ہوتے ہوئے بھی اس قوم کی المیہ کا منتہا (climax) ضرور تھا۔ ایک زندہ انسان، روحانی جسمانی اور جمالیاتی یا اور کسی اعتبار سے اس حقیقت کے احساس کو نہیں جھٹلا سکتا۔ ایک حساس فن کار اس المیہ سے متاثر ہوئے بغیر ہرگز ہرگز نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ اسکی تمام حسوں کے لئے ایک چیلنج ہے "ان داتا" "بھگوان جنس رہا ہے"۔ اور "دراڑیں" جیسے کامیاب افسانے اس موضوع پر لکھے گئے مگر بعض "خالص ادیبوں اور محض فن کاروں" نے اپنے "تعزیرات فن" کی کس دفعہ کے ماتحت انہیں مفت خوری اور چور بازاری کے مترادف پایا۔ ان بیمار مغز فنکاروں کا معیار بلا شبہ "فنی" ضرور ہو۔ مگر وہ انسانی کسی حالت میں نہیں ہے۔ اگر ادب برائے ادب کی ترجمانی یہی ہے۔ تو اس نظریہ کا وہی حشر ہوگا جو کمیونزم کے نظریہ کا ہندوستانی کمیونسٹوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے میں

4/11/88

تو پھر ادب برائے ادب کو Crime Clubs کے Motto کے علاوہ کچھ اور خیال نہ کر سکوں گی۔

ترقی پسند جنسی افسانوں سے تو گویا مسجد کے آگے باجا بجا دیا ہے ماں بہنوں کی عصمتوں کی دہائی دیتے ہوئے بوکھلائے لوگ بھاگتے جاتے ہیں۔ ہاں گالے گلے ہے انکے منہ سے چیلن۔ لحاف اور لو کا نام سنائی دے جاتا ہے ورنہ ایک قیامت بپا ہے گویا۔ گنڈیاں کھلنے لگیں۔ پردے اڑنے لگے اور برسوں کی دبی ڈھکی عصمتیں خطرے میں پڑ گئیں۔

بقول ڈی۔ ایچ لارنس ہر نئی چیز ایک بھوت ہوتی ہے اور نئی جنسی تحریک کا معاملہ بھی کچھ ایسا نظر آتا ہے۔ ورنہ اس نئی تحریک میں مجھے اب تک کوئی مہلک چیز نظر نہیں آئی۔ جو چیز ہم روزانہ کی زندگی میں جانتے ہیں جس کو ہمارے آباؤ اجداد جانتے تھے اس کے Scientific اور ڈاکٹری بیان سے خوفزدہ ہونا ان بوڑھی ماؤں کی خصلت کے مانند ہے۔ جو "ڈاکدر" کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہیں کہ "مرتے مرجاؤں گی پر فرنگی کے ہاتھوں عاقبت خراب نہ کراؤں گی"۔

آپ سارے جنسی افسانے پڑھ جائیے۔ بیشتر سے زیادہ ایک احساس کرامت کے حامل ہیں چند نفسیاتی تجزیہ ہیں باقی جنس کے سماجی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں انمیں تلذذ کا پہلو کتنا نمایاں ہے آپ کلاسیکی ادب سے موازنہ کر کے اپنی تسلی کر لیجئے۔ چھیں۔ لحاف اور لو ایک سماجی حقیقت کے غماز ہیں۔ تین پرانے ناسور ہیں محض ان کو اجاگر کر دیا گیا ہے۔ یہ عام ڈاکٹری عمل ہے۔ تین فوٹوگرافک پلیٹیں ہیں ان سے گھبرانے کی کیا ضرورت یہ آپ ہی کے گھر کے چیتھڑے ہیں

شرمناک یا غضبناک ہونے کی نوبت کیوں آتی ہے؟

اُردو ادب کی جنسی تحریک میرے نزدیک ایک دہکتی بھٹی ہے۔ جس میں
پرانی اخلاقی اقدار کو گلا کر نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔

نئے ادب کی تکنیک پر جدید نفسیاتی معلومات بہت حد تک اثر انداز ہوئی ہیں
نفسیاتی تجزیہ اور آزاد تلازمے نے تو ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ان معلومات
سے پیشتر انسانی کردار کو واضح اور مکمل کُل کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ اُن کی
ذہنی حرکات کا اظہار reactive جسمانی اصطلاحوں میں کیا جاتا تھا۔ اُن کی مختلف
ذہنی کیفیتوں کے اظہار کے لئے حادثات کا وقوع پذیر ہونا لازمی تھا اس طرح
کردار کی تراش خراش کے ساتھ پلاٹ کا تانا بانا بھی پڑتا چلا جاتا تھا۔ اس
طرح پلاٹ کا ہونا ایک حد تک کردار نگاری کے ساتھ لازمی سا ہو کر رہ گیا تھا
مگر Psycho-analysis & free Association کی روشنی میں کردار
کی کلیت (Compactness) کا مسئلہ ہی غلط ثابت ہوا ہے۔ اور نفسیاتی
اصولوں پر بغیر خارجی حوادث کے اور بنا critical situation پیدا
کئے ایک کردار کی ذہنی کیفیات کی ترجمانی کی جا سکتی ہے اس لئے نئے ادیب کے
لئے اسکی تخلیق میں اُن مجبوریوں سے نجات مل گئی ہے۔ جن کی وجہ سے طویل پلاٹ
والے افسانے لکھے جاتے تھے۔

آج کل کے افسانوں میں کرداروں کی دلچسپی اُن کے خارجی اور داخلی
محرکات کی صحیح ترجمانی پر موقوف ہے لیکن لوگوں نے تو اس اصول کے پیش نظر
پلاٹ اور کردار نگاری کی مروجہ قیود سے اس قدر انحراف کیا ہے کہ اُن کے

افسانے یا تو آزاد تلازمے ہیں یا وحدانیہ (Monologue) محمد حسن عسکری اور مہندر ناتھ کے زیادہ تر افسانے اسی تکنیک کے اعلیٰ نمونے ہیں مگر اس تکنیک کے استعمال میں جب پلاٹ ذہنی کے برابر ہوتا ہے اور کردار ٹکڑے ٹکڑے پیش کیا جاتا ہے تو جذباتی تسلسل کا قائم رہنا ضروری ہے۔

نئے ادب کو میں نے زندگی کی اصطلاح میں سمجھا ہے نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں اسکی نشو ونما کو پہچانا ہے اور اس میں اس انسانی المیہ کا پرتو دیکھا ہے جس میں خلوص ہے شدت ہے انسانی محبت ہے۔ یہ وہ ادب ہے جو زندگی کا عکاس ہے اور ارتقا کے اصول پر پیدا ہوا ہے۔

ممتاز شیریں

ممتاز شیریں

ترقی پسند ادب

ترقی پسند تحریک ایک وسیع عالمگیر اور زبردست تحریک ہے۔ ۱۹۳۲ء
میں ایک طرف فاشیت سر اٹھا رہی تھی تو دوسری طرف روس کے نئے نظام
کا، جو قریب قریب تشکیل پا چکا تھا۔ نمونہ سامنے تھا! ان حالات کے زیر اثر ایک
منظم تحریک نیک اغراض کو مقاصد لے کر اٹھی، اب یہ تحریک ہندوستان
میں بھی خوب زور پکڑ چکی ہے اور اب اس نے اپنے وسیع دامن میں ادب کے علاوہ
دوسرے فنونِ لطیفہ کو بھی سمیٹ لیا ہے، ادب کو اس میں ایک خاص اہمیت
حاصل ہے۔ ترقی پسند ادب کی مختصر تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔

وہ ادب جو زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرے جس میں زندگی کی
تفسیر ہی نہیں تنقید بھی ہو اور جس میں زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہو ——
یہ کہنا غلط ہوگا۔ کہ اس تحریک سے پہلے ادب میں زندگی کی صحیح عکاسی نہیں

ہوئی تھی - ہر دور کا بڑا ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اس تحریک سے
بہت پہلے بھی ادب کا یہی نظریہ رہا ہے۔ اور بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں
ایسا ادب پیش ہوتا آیا ہے حقیقت نگاری صرف ترقی پسند ادب کی خصوصیت
نہیں کہی جا سکتی۔ خصوصاً جب یہ ہر دور کے ساتھ پہلو بدلتی آ رہی ہے۔ مغربی
ادب میں انیسویں صدی میں معاشرتی حقیقت نگاری (Social Realism)*
تھی۔ تو ۱۹۲۰ء کے بعد جنسی حقیقت نگاری اور آج سیاسی، اُردو ادب
میں آجکل رجحان مجموعی طور پر جنسی حقیقت نگاری کی طرف ہے لیکن آج جس قسم کی
حقیقت پیش کی جا رہی ہے وہ پرانے دور کی حقیقت نگاری سے کچھ مختلف ضرور
ہے حقیقت اپنی عریاں صورت میں (crude reality) البتہ اُردو
ادب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ حقیقت نگاری اسی تحریک کے ساتھ
آئی - اس سے پہلے ہمارے ادب میں رومانیت، فراریت اور مثالیت
(idealism) بہت زیادہ تھی۔

بعض لوگ ترقی پسندی کو مارکسیت کے مترادف سمجھتے ہیں بعض ادیبوں
کا یہی خیال ہے کہ ان کی ساری کوششیں ایک ایسی راہ کے تیار کرنے میں
صرف ہوں جس کی آخری منزل اشتراکی نظام ہے۔ لیکن یہ نظریہ ادب کو تنگ
داماں بنا دیتا ہے۔ اور بعض نے محض پرانی روایات اور پرانی قدروں کے مٹانے،
ہر قسم کی پابندیوں سے آزادی اور سماج سے بغاوت کو "ترقی پسندی" سمجھ لیا
ہے۔ پرانی روایت، رواج اور قانون بجائے خود قابل ملامت نہیں ہیں۔ ایک
خاص ماحول میں یہ ٹھیک بیٹھتے تھے۔ پرانے زمانے میں ان کا اثر اس لئے

مہلک نہیں تھا کہ ان پابندیوں کے ساتھ مخصوص اخلاقی قدریں اور روایات ہوتی تھیں۔ اور قانون، رواج، روایت، اخلاقی اقدار، جن سے ایک آئین، ایک نظام کی تشکیل ہوئی تھی، مضبوط جال میں بٹے ہوئے تھے، یہ جال مضبوط تھا تو نظام بھی پائیدار تھا۔ لیکن اب زندگی پیچیدہ ہو گئی ہے۔ یہ پرانے قانون اس میں جوڑ نہیں سکتے۔ لوگوں کو اب ان سے عقیدت نہیں رہی انہیں آج محسوس ہو رہا ہے کہ یہ رواج، یہ قانون، انکی آزادی کو سلب کر رہے ہیں اور افیونی دواؤں سے (جیسے مذہب۔ اخلاقیات) ان کے اس احساس کو مردہ کیا گیا ہے۔ بعض نے آزاد روی اختیار کر لی ہے بعض لوگ مکمل آزادی کو خطرناک سمجھ کر پرانی اور نئی راہوں کے بیچ میں کھڑے ہیں، بعض ابھی تک پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ اور ان سب کے لئے اخلاقی قدریں بھی الگ الگ ہیں۔ نئے قانون بن رہے ہیں اور انہیں جوڑنے کے لئے پرانے حصّوں کو کاٹنا چھانٹنا پڑ رہا ہے۔ اور اس توڑ، مروڑ، گھسوڑ میں نظام کی بری حالت ہو گئی ہے، اس کے جوڑ جوڑ ڈھیلے پڑ گئے ہیں، بعض کیلیں نکل گئی ہیں، کئی جگہ بندھن ٹوٹ چکے ہیں، کہیں تمام مضبوط ہیں۔ ہندوستان میں یہ نیم آزادی اور نیم پابندی کا دور خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ اور "ترقی پسند" چاہتے ہیں کہ ان تمام پرانی روایتوں کو مٹا ڈالیں، اس جال کی دھجیاں اڑا ڈالیں، ساری پابندیوں سے آزاد ہو جائیں لیکن یہ مکمل آزادی ہمیں کہاں لے جائے گی؟ کون جانتے شاید یہ anarchy کا دور دورہ ہو جائے۔ اور یہ مکمل شخصی آزادی پابندیوں سے بھی خطرناک ثابت ہو!

ترقی پسند تحریک کے مقاصد نیک ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تحریک کے زیرِ اثر اُردو میں آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ وہ کہاں تک ان مقاصد کی تکمیل میں مدد دے رہا ہے۔ اور کہاں تک یہ سب کچھ، جو ترقی پسند ادب کہا جاتا ہے ادب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے زیرِ اثر ہندوستان میں بھی اچھا ادب (خصوصاً افسانوی ادب۔ جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے ہمارا ادب ابھی بہت پیچھے ہے) پیدا ہوا ہے۔ جو کسی بھی ملک کے ترقی پسند ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بہت سارا رطب و یابس بھی جمع ہو گیا ہے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ترقی پسند ادب ایک بڑی حد تک مقصدی ادب ہے۔ اور مقاصد کے پرچار کے لئے پروپیگنڈا بھی ادب میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ پروپیگنڈے کی سطح تک گرائے بغیر بھی ادب میں افادیت کا عنصر لایا جا سکتا ہے۔ مقصد فن کے پردے میں ڈھکا نہیں تو کم از کم اس طرح گھل مل جائے کہ اس کا اثر تو ضرور ہو لیکن مقصد آپ کو گھورتا ہوا نہ نظر آئے۔ کامیاب فن کار طنزیہ جملوں، جوشیلی تقریروں، اور پند و نصائح کی بھرمار کئے بغیر بھی بہت اثر پیدا کر سکتا ہے۔ حقیقت نگاری کے معنے یہ نہیں کہ جو کچھ سامنے گذرا ہوا ہے من و عن بیان کر دیں خواہ یہ روکھی پھیکی رپورتاژ کیوں نہ بن جائے۔ رپورتاژ اور فن میں یہ فرق ہے کہ فن کارانہ چیز کی تخلیق میں واقعات کے چناؤ، ترتیب اور اندازِ بیان کو بہت بڑا دخل ہے۔ ادب فوٹوگرافی نہیں فن کار خاکہ کھینچنے کے بعد جن نقوش کو اُبھارتا ہے۔ اور اس میں رنگ آمیزی کر کے اور زیادہ اثر پیدا کرتا ہے۔ یوں تخئیل حقیقت کو نکھارتا ہے۔

پروپیگنڈا ایک کارآمد حربہ ضرور ہے عوام پر اثر ڈالنے کے لئے ادب سے زیادہ کارآمد۔ روس میں انقلاب اور موجودہ جنگ کے دوران میں پروپیگنڈا زوروں پر تھا۔ اچھے اچھے ادیبوں نے اپنے آپ کو پروپیگنڈا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ ایلیا اہرن برگ پمفلٹ نگاری کرتے رہے افسانوں کے ذریعے بھی پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ لیکن اسے پروپیگنڈا سمجھ کر وہ یہ منوانے پر مصر نہیں تھے کہ یہ بہترین ادب ہے۔ تیسرے درجہ کی چیزوں کی تخلیق کی ایک اور وجہ بھی ہے ترقی پسند ادب کے مقاصد اور خاص رجحانات دیکھ کر لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ترقی پسند افسانے لکھنا بہت آسان ہے۔ فلاں فلاں موضوع پر لکھ دیں تو "ترقی پسند" افسانہ تیار ہے۔ چونکہ فن کا پلہ مقصد کے پلہ سے ہلکا رکھا گیا ہے۔ ایسے لوگ بھی لکھنے لگے ہیں جن میں فنی صلاحیتیں نہیں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ارادوں میں خلوص ہے لیکن جو فن پر دسترس نہیں رکھتے۔ ایسے بھی ہیں جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں یہ خلوص سے نہیں لکھتے بلکہ صرف اس لئے کہ فلاں فلاں موضوع پر لکھنا آج کا فیشن ہے اور وہ ان پر لکھ کر "ادیبوں" کے زمرے میں شمار کئے جائیں گے۔ انکی تحریروں میں نہ گہرائی ہوتی ہے، نہ خلوص، بلکہ سطحیت اور رسمیت۔ البتہ پھیکا جوش وخروش ہوتا ہے

ادب کو مقصدی سمجھنے کا ایک اثر یہ بھی ہو رہا ہے کہ ہمارے ادیب کسی سماجی حقیقت کو بحیثیت مجموعی دیکھنے کی بجائے صرف بعض پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور انہیں ایک حد تک بڑھا چڑھا کر بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً غریبوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں تو انہیں اتنی مصیبت میں بتلاتے ہیں جتنی غریب خود محسوس نہیں کرتے

کیونکہ وہ اس زندگی سے مانوس ہوتے ہیں پھر ان کی زندگی میں بھی چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں زندگی قابلِ برداشت معلوم ہوتی ہے شاید یہ سب جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا ذکر کرنا موجودہ حالت سے اطمینان بتانا ہوگا۔ لیکن اسکی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اُن کی زندگی کو متوسط طبقے کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے اکثر کیا۔ قریب قریب سبھی ادیب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یورپ میں نچلے طبقے نے بھی ادیب پیدا کئے ہیں لیکی ہاورڈ اگر پلاسٹررز کے متعلق لکھتے ہیں تو وہ خود پلاسٹرر رہے تھے۔ بی، یل کومبس نے کان میں کام کرنے والے مزدوروں پر لکھا ہے تو وہ خود کانکس رہے تھے۔ جارج گیرٹ، فرڈیو کوہارٹ وغیرہ نے مزدوروں کے متعلق بہت اچھا لکھا ہے اور یہ خود اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں انکی تحریروں کا متوسط طبقے کے ادیبوں کی تحریروں سے موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ متوسط طبقے کے ادیب مزدوروں وغیرہ کی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا لہجہ زیادہ تلخ اور جذباتی ہوتا ہے۔ بی، یل کومبس، جارج گیرٹ، فرڈیو کوہارٹ سبھی نے اپنی دیکھی ہوئی اپنے آپ پر بیتی ہوئی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے لیکن انہیں بیان کرنے میں ان کا لہجہ بہت تلخ ہسٹرک اور جذباتی نہیں ہے۔ لیکن یہی زیادہ موثر معلوم ہوتا ہے پھر انکی تحریریں صرف مصیبتیں اور مایوسیاں ہی نہیں، امید اور اپنی طاقت پر بھروسہ کی جھلک بھی ہوتی ہے۔

یہی حال جنسی ادب کا ہے۔ ہمارے ہاں جنس پر بہت لکھا جا رہا ہے۔ جنس زندگی کا ایک بہت اہم جزو ضرور ہے۔ لیکن اس پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ شاید مغربی ادب کی ۱۹۲۵ء کے بعد کی جنسی حقیقت نگاری کی تقلید

اب ہو رہی ہے۔ ہم تقلید بھی بیس برس بعد کرتے ہیں! جنسی بھوک، جنسی ناآسودگی جنسی بے راہ روی، بس انہیں کے ذکر سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے مرد کی تصویر بھی سیاہ ہے اور عورت کی بھی —— اور افسوس تو یہ ہے کہ عورت کے قلم سے کھنچی ہوئی عورت کی تصویر بھی سیاہ ہے —— سوگند ہیاں، اور جینا ئیں (جُپ ممتاز مفتی) کتنی زیادہ ہیں۔ ستی (گرم کوٹ) صفیہ (دنبلی) اور آپا، کتنی کم۔ حالانکہ ہندوستان میں انہیں کی تعداد زیادہ ہے۔ شاید ترقی پسند یہ کہیں کہ ہمیشہ جنسی برائیوں کا ہی ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ برائیاں مخصوص سماجی حالات کا نتیجہ ہیں اور ان سماجی حالات کو بدلنا ہو تو برائیوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنا ہوگا۔ لیکن پورے جنسی ادب کا ہم جائزہ لیں تو اس میں بہت کم سماجی مسائل ملیں گے پیسے کے طوائف، کا ایک موضوع ہے، یا ایک بوڑھے مرد اور جوان لڑکی کی بے جوڑ شادی، ان موضوعوں پر بیسیوں افسانے لکھے گئے ہیں، اور لکھے جا رہے ہیں لیکن کتنے اہم مسائل چھوئے تک نہیں گئے۔ زیادہ تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن میں جو منفرد کرداروں کی جنسی بے راہ روی یا عیاشی کا ذکر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کے 'انفرادی' ہونے سے کوئی گلہ نہیں۔ آخر ایک فرد کے احساسات، اس پر گذرے ہوئے واقعات بھی اہم ہیں، گلہ اس بات سے ہے کہ آخر انسان کو ہمیشہ حیوان کے روپ میں کیوں پیش کیا جائے؟ جیسے جدید افسانہ نگاروں کو جنسی بدعنوانیوں کا ذکر کرنے کا خبط ہے، ترقی پسند ادب میں عریانی اور فحاشی پر آئے دن بحثیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہ الزام بھی بے بنیاد نہیں ہے، ممکن ہے بعض ادیبوں کے ارادوں میں واقعی خلوص ہو اور گناہوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنے سے ان کا مقصد

ان سب سے نفرت دلاتا ہو۔ لیکن بعض تو ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ سیکس ایلیزم کو فیشن سمجھ کر خواہ مخواہ عریاں
جنسیتوں کو اُجاگر کرتے ہیں بعض عریاں نگاری کو اپنی جرأت کا اظہار سمجھتے ہیں یا محض ضد اور بغاوت
مخصوص باتوں کو کھلے طور پر بیان کرنا بجائے خود فحاشی ہرگز نہیں اس کا انحصار
پیش کرنے کے انداز اور مواقع پر ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایسے افسانے
بھی لکھے گئے ہیں، اور لکھے جا رہے ہیں، جو کہ بیہودہ گناہ آمیز اور غلاظت میں ڈوبے ہوئے
معلوم ہوتے ہیں اور ایسے افسانوں میں یوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کہ نئے لکھنے والے
پہلے کی چند مثالیں دیکھ کر تقلید کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد جو آتے ہیں ان کی تحریروں
میں اور عریانی بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ مبتدی اور معمولی لکھنے والے عریانی
کو اپنے افسانے کے اچھے اور 'ترقی پسند' ہونے کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ ترقی
پسند ادب پر فحاشی کے الزام کے جواب میں 'ترقی پسند' اکثر یہ کہتے ہیں کہ لوگ ایسے
افسانے پڑھ کر اس لئے جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ یہ ان کا پول کھولتے ہیں یہ محض چور
کی داڑھی میں تنکا والا معاملہ نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کی طبیعت پر ایسے
افسانے اس لئے گراں گذرتے ہیں کہ یہ ان کی جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچاتے ہیں
اور پڑھنے والوں میں ایسے بھی ہیں، جنہیں ایسے افسانوں سے اکتاہٹ ہوتی ہے
اس لئے نہیں کہ یہ ان کا پول کھولتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس لئے کہ وہ جنسی
ادب، ان کی زندگی کو نظر انداز کر رہا ہے۔ وہ صحت مند محبت یا ازدواجی محبت
کے قائل ہوں، خود اچھی زندگی بسر کرتے ہوں اور ادب میں اپنی زندگی کا عکس
بھی دیکھنا چاہتے ہوں، جس سے انہیں ایک طرح کا سکون اور مسرت حاصل ہو
'آپ ہی کا لحاف گندہ ہے،' آپ ہی کے جسم سے یہ 'بو' آتی ہے،' کہہ کر

چپ ہونے کی بجائے ہمیں چاہیئے کہ اس شکایت پر غور کریں، اس معاملہ پہ زیادہ
توجہ دیں اور جنسی ادب میں سنجیدگی، توازن اور اعتدال پیدا کریں۔ جنس میں
لھڑے ہوئے افسانے کی بجائے، جنس میں زندگی کو پیش کریں۔
سنجیدگی، توازن اور اعتدال سے ترقی پسند ادب کی خوبیاں اور
اجاگر ہوں گی، یہ افراط تفریط انہیں عوام کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہے۔
لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند ادب میں "بغاوت" کا عنصر بہت زیادہ ہے۔
پرانے نظام کی ہر چیز پر محض اس لئے کہ وہ اسے فرسودہ خیال کرتے ہیں، حملہ کیا
جاتا ہے، یہاں تک کہ مذہب و اخلاق پر بھی، مذہبی عقاید کا ٹھٹھہ اڑایا جاتا ہے
خدا کو گالیاں دی جاتی ہیں ...... ہائے "ترقی پسندی" تیرے نام پر کیا کیا
لکھا جا رہا ہے! (یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ "خدا" کو پرانے نظام سے
وابستہ کیوں کیا جاتا ہے، اور خدا کو گالیاں دینے سے "نئے نظام" کی تعمیر میں
کیا مدد ملتی ہے۔)
ترقی پسند ادب کا عام رجحان ہی یہ ہے کہ زندگی اور حقیقت کے چند پہلوؤں
(زیادہ تر تاریک پہلوؤں پر) خصوصی توجہ کی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ مقاصد کے حصول کے لئے یہ ایک حد تک ضروری ہے لیکن اس کے معنی
یہ بھی نہیں کہ روشن پہلو بالکل نظر انداز کر دئے جائیں۔ ہاں، آج ہمیں اپنے
گرد تاریکی اور برائیاں ہی زیادہ نظر آ رہی ہیں نیکی، اور روشنی کم ہے۔ لیکن انہیں
کم از کم اسی تناسب میں پیش کیا جائے ہمیشہ زندگی اور انسانی کردار کی سیاہ
تصویریں پیش کرنے سے زندگی اور انسانی فطرت ہی سے مایوسی ہو جائیگی

تو پھر آنے والے دور کی امید کہاں رہے گی؟ انسان کی فطرت پر سے بھروسہ اُٹھ جائے تو انسانیت کا مستقبل روشن کیسے نظر آئے گا؟ ساتھ ساتھ اچھے نیک کردار اور انسانی فطرت کی خوبصورتی بھی دکھائی جائے، تو سکون اور مسرت حاصل ہوتی ہے اور یہ احساس قائم رہتا ہے کہ "انسانیت" کی شمع بجھ نہیں گئی، ٹمٹما رہی ہے، اور ایک سازگار ماحول میں اس کی لو پھر سے تیز ہو سکتی ہے۔

اب ہمارے ادب پر یاسیت اور قنوطیت چھائی ہوتی ہے۔ بے چینی ہے الجھنیں ہیں، شکوک ہیں، کوئی رجائی پیغام نہیں، اور یہ بڑھتی ہوئی یاسیت امید کا گلا گھونٹ رہی ہے، ترقی کی راہ میں حائل ہو رہی ہے ہمارے ادب میں بلا کی تیزی ہے قوت ہے جوش ہے لیکن یہ سب کچھ ایک "بغاوت" میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ادیبوں کا لہجہ ایسا ہے جیسے وہ زندگی اور انسانیت سے محبت نہیں ان پر حملہ کر رہے ہیں، ہمارا ادب Literature of Negation بن کر رہ گیا ہے۔ اسوقت یہ بہت ضروری ہے کہ ادیب رجائی پیغام دیں، اثباتی اور تعمیری انداز پیش کریں۔

ادب میں ایک ہی رجحان کبھی قائم نہیں رہتا، ایک دور میں ایک رجحان ہوتا ہے تو اسکے بعد کے دور میں ردِّ عمل کے طور پر بالکل متضاد قسم کا۔ ایچ، جی، ویلس، آرنلڈ بینیٹ اور گیا لسورڈی، کا ردِّ عمل جوئس، ورجینیا وولف اور لارنس تھے، ایک فرد کے ذہن ایک بڑی حد تک خود مصنّف کے خیالات اور احساسات کی تصویر کشی۔ ذہنی تصورات کی عکاسی۔ یہ "داخلی حقیقت نگاری"

کا دور تھا۔ پھر اس کے ردِّ عمل میں بالکل خارجی حقیقت نگاری آئی اس کا
محرک نئے لکھنے والوں کا وہ گروہ ہے جس کی قیادت کرسٹفر اشروڈ، جارج
آرول، سٹیفن سپینڈر وغیرہ نے کی اور جب ہم لوگ تھک چکے ہیں جنگ سے
زندگی کی بڑھتی ہوئی مصیبتوں سے وہ ادب میں بھی انہیں مصیبتوں کا پرتو دیکھنا
نہیں چاہتے، ادب میں فرار ڈھونڈھنا چاہتے ہیں! ایک اور سکول قائم ہو
گیا ہے جنہیں New Romantics کہا جاتا ہے انکی نگارشات میں رومانیت
اور فراریت شامل ہوتی جا رہی ہے — کلاک کی سوئی گھوم پھر کر واپس
آ گئی اور روس جہاں کل تک اس زور و شور سے جنگی اور انقلابی ادب پیش
ہو رہا تھا، اب پرانی تاریخ کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ V. Yan نے
پرانے درویشوں کی قصہ گوئی کی طرز پر "چنگیز خاں" اور "باتو" لکھا ہے۔ Road.
o.t. lahaway. لکھنے والے الکسی ٹالسٹائی "پیٹر دی گریٹ" لکھ رہے ہیں
ادب کے نظریئے بدلتے رہتے ہیں، رجحان بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ مخصوص
نظریئے اور رجحانات ادب کے احاطے کو محدود کر دیتے ہیں ادب وسیع ہو داخلی
خارجی، انفرادی، اجتماعی، المعانی، ابدی، روایاتی، وغیرہ حدود اور خصوصیتوں
سے نکل کر اور ان سب کو اپنے دامن میں لے کر زندگی کی ترجمانی کرے زندگی
جو اس لمحہ ہمارے سامنے ہے، زندگی جو ازل سے ہے فرد کی زندگی، جماعت
کی زندگی، ہر طبقہ کی زندگی، ہر قوم کی زندگی، زندگی اپنی مصیبتوں اور
مسرتوں کے ساتھ، اپنی نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ، غلاظت اور پاکی
کے ساتھ، اپنی امیدوں اور مایوسیوں کے ساتھ، زندگی اپنی کشمکش،

اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ——— اپنی ساری وسعتوں
اور پیچیدگیوں کے ساتھ، اور اپنے تناسب اور توازن کے ساتھ!

طاہرہ دیوی شیرازی

میرے فنّی نظریات

محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی نے ان سطور میں
کرشن چندر، منٹو، احمد علی اور اردو کے ایک زندہ شاعر کے
متعلق ایسے خیالات کا اظہار فرمایا ہے، جن سے شاید ہی کوئی
متفق ہو سکے، نیز ان فنکاروں کی تخلیقات کو رد کرتے ہوئے
انہوں نے چند مقامات پر نہایت سخت گیری سے کام لیا ہے
لیکن ان کے انفرادی نظریات کو صحیح صورت میں پیش کر دینا
مرتب کا اخلاقی فرض تھا۔ اس کا ان خیالات سے متفق ہونا
ضروری نہیں۔

مرتّب

ادب برائے زندگی کا بھلا کون قائل نہیں ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ اس

نظریہ کا صحیح عملی سلیقہ کتنے ادیبوں کو حاصل ہے، اِن کی نگارشات میں خلوص کتنا ہے، اور خود غرضی کتنی ؟ اس سرے سے اُس سرے تک ——— افسانہ نگار اور شاعر زندگی سے کھیلتے ہیں، زندگی کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے زندگی کا صحیح ترجمان ہونے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ خود ان کی زندگی اس رنگ میں ڈوب جائے اگر حیاتِ انسانی کے دُکھ درد کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس درد کی کسک کو خود بھی محسوس کریں ورنہ یہ ڈھونگ رچانے سے کیا حاصل ؟ اردو کے ایک زندہ شاعر ایک مزدورنی کو سرِراہ اپنے نازک ہاتھوں سے جن کو خالق نے رنگ حنا سے محروم کر دیا ہے بھوک سے تنگ آ کر پتھر توڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو فوراً انکی رگ شاعری پھڑک اُٹھتی ہے اور وہ برہم ہو کر آسمان کو وقف مجبوری کئے جانے کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں گویا وہ سب کچھ کیا دھرا صرف آسمان کا ہے خود حضرتِ انسان کا کوئی قصور نہیں ہے اور پھر اگر وہی گرسنہ و تشنہ دہاں کبھی ان کی خلوت میں داخل ہو جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اسکی بھوک پیاس دور کرنے کے لئے وہ کونسا طریقہ اختیار کریں گے ؟ اس سوال کا جواب انہی کے کلام سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ عورت ذات کا مصرف ان کی نگاہ میں کیا ہے

"ان داتا" کے مصنف کی بابت کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قحط زدگانِ بنگال کی مصیبتوں کو پوری طرح محسوس کر کے نہایت دلپذیر انداز میں ناولٹ لکھا ہے، لیکن اگر وہی کرشن چندر ان دنوں بھولے سے چوکے ہی سرزمین بنگال

پر قدم رکھ لیتے اور کسی فاقہ زدہ زندہ لاش کے قریب سے غیر ارادی طور پر گذر جاتے تو ان پر اس کیفیت کا کیا اثر ہوتا۔ وہ ناک پر رومال رکھ کر تیز تیز قدم اٹھاتے اس جگہ سے بھاگتے اور سیدھے فرلو یا ونیگر میں جا گھسُتے اور اس غریب کو اننے پیسے دینا بھی گوارا نہ کرتے جو پُر تکلف ہوٹلوں میں لذتِ کام و دہن حاصل کرنے کے بعد اپنی شان امارت دکھانے کے لئے ہوٹل کے بیرے کو بخشیش کے طور پر دے دیتے۔ پھر بھلا کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان شاعروں یا ادیبوں کی کاوشیں برائے زندگی ہیں یا حقیقت نگر آنکھ سے دیکھا جائے تو ان کی حیثیت فلم کے اُن اداکاروں سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں ہے جو ہر نئی شوٹنگ کے وقت ایک نیا روپ دھار کر تصویر کے پردے میں جلوہ گر ہوتے ہیں جس طرح وہ کیمرہ کے سامنے کبھی بادشاہ، کبھی بھکاری، کبھی معلمِ اخلاق اور کبھی بدمعاشش کا کردار پیش کرتے آتے ہیں، اسی طرح ان ادیبوں اور شاعروں کا قلم بھی افسانے کے خاکے میں مختلف النوع رنگ بھرتا ہے وہ دوسرے کے لکھے ہوئے مکالمے اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں اسی طرح یہ بھی کچھ سنی سنائی اور کچھ پڑھی پڑھائی باتوں کو دہراتے ہیں اور اس طرح ان کی ہر تخلیق میں بھی دراصل اکتسابی رنگ جھلکتا ہے اور جب صورت حالات یہ ہو تو وہ نگارشات جن کو ادب برائے زندگی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ادب برائے ادب کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتیں۔

اگر ادب برائے زندگی کا مفہوم وہ ادب قرار دیا جائے جو خود ادیبوں اور شاعروں کے لئے مفید ثابت ہو سکے تو اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ کیونکہ ان کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ آٹھ دس افسانے یا چالیس پچاس نظمیں لکھ کر کسی ناشر سے دو ڈھائی سو روپے وصول کر لیں اور ناشر اپنی جگہ ہزار با۔ وسو بنالے جس طرح وہ اپنی تحریروں میں غریب مزدوروں یا بیکس رنڈیوں کو ذاتی منفعت کے لئے آلۂ کار بناتے ہیں، اسی طرح ناشران سب کو اپنے فائدے کی خاطر آلۂ کار بناتا ہے جیسے طرح بعض بھیک منگوں کے جسمانی نقائص ان کے لئے وسیلۂ روزگار بنتے ہیں تاہم وہ بھک منگے اپنے جسمانی نقائص دور ہو جانے کے بعد بھی تھوڑی بہت بھیک مانگ سکتے ہیں لیکن دنیا سے مزدوروں یا رنڈیوں کے اٹھ جانے کے بعد یہ ادیب اور شاعر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

میں ذاتی طور پر کسی اصول، قاعدے، طرز تحریر یا مقصد کی پابند نہیں ہوں، جو جی چاہا اور جس طرح جی چاہا، لکھ دیا اسی لئے مستقبل کا کوئی پروگرام میری نگاہ کے سامنے نہیں ہے میں نے ترجمے کئے ہیں، دوسروں کے خیالات کو اپنایا ہے اور طبعزاد کوششیں بھی کی ہیں لیکن یہ سب کچھ اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کے لئے دوسروں کے مفاد اور فلاح و بہبود سے خالی الذہن ہو کر جدید افسانہ نگاری میں جنسی تجزئے کی رو صرف تجزئے کی حد تک بری

نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ بہت آگے بڑھ کر لفظی عیاشی کرنے لگتے ہیں۔ نشۂ شراب کی طرح ان کی تحریریں قارئین پر کیفیت سکر طاری کرتی ہیں اور پھر نتیجہ ظاہر۔ منٹو اور احمد علی کی تحریریں اس ضمن میں پیش کیجا سکتی ہیں۔ سماج کے موجودہ نظام میں عیاشی کے اور محرکات کیا کم ہیں جو غریب ادب کو بھی اس کیچڑ میں رگیدا جائے۔

میں طرزِ تحریر کے ضمن میں آسکر وائلڈ کے نظریے کی حامی ہوں کہ صداقتِ الفاظ پر رنگینیٔ بیان کو ترجیح دی جائے۔ چنانچہ اردو کے ادیبوں میں سے نیاز فتحپوری نے اپنی نگارشات کے ذریعے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اور میں غیر شعوری طور پر انہی کی پیرو ہو گئی، یہی وجہ ہے کہ نذرِ عقیدت کے طور پر میں نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ ((سحرِ بنگال)) ان کے نام سے منسوب کرنا مناسب سمجھا۔ نیاز کے بعد والے دور میں اختر رائے پوری کے افسانے میری نگاہ میں سب سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تحریر میں صداقت اور خلوص صحیح معنوں میں موجود ہیں۔

افسانے

اور

حالاتِ زندگی

تسنیم سلیم چھتاری

"میری رائے میں، ایک افسانہ نگار کے افسانوں کا حالاتِ زندگی سے نہیں
بلکہ خیالاتِ زندگی سے ارتباط ہوتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے میرا سنِ پیدائش
بتانا یا اپنے غیر ضروری حالات کی تفصیل لکھنا بے سود رہے گا۔
عمر کا ایک ایسا دور گزر چکا ہے جس کو مختصر بھی سمجھا جائے گا اور زرین بھی
کہا جائے گا۔ مگر میرے نزدیک جتنی تبدیلیاں میرے اندر اس عرصے میں ہو چکیں
اور جتنے اضطراب و انتشار سے اس گذرے ہوئے زمانہ میں واسطہ پڑ چکا......
وہ اس حد تک مجھے اپنی بقایا زندگی میں صورت نہ دکھائے گا۔ کاش ایسا ہو۔
اب میں نے "کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ" کے بعد اپنے حواس
کا اجتماع کر لیا ہے مگر ایک ایسی کروٹ کے ساتھ جیسے مینہ برستے میں دھوپ نکل
آئے۔ اب بھی اتنا ہنستی ہوں کہ آنکھوں سے آنسو نکل آئیں۔ مگر وہ خوشی کے آنسو
بھی چہرے کو بے رنگ کر جاتے ہیں اس مسرورمی میں بھی پھیکا پن اور بے رونقی ہوتی
ہے۔

اب بھی شرارت سے باز نہیں آتی، مگر اس کے لئے اب سوچنا پڑتا ہے خوب
زرشت کے پہلوؤں پر غور کرنا پڑتا ہے پھر بھی بعد میں نہ وہ سکون ملتا ہے نہ
وہ خوشی...... ہاں کچھ پشیمانی سے واسطہ پڑ جاتا ہے جیسے اب کچھ نہیں

بس مُنہ چڑاتا ہے، اپنے بیتے دِنوں کا........

میں نے لوگوں کو بچپن کی واپسی کے لئے دعائیں مانگتے دیکھا ہے مگر خود میں ماضی کو حال بنانے کی خواہاں نہیں! اگر وہ دور پھر آکر چلا جائے گا اور دوبارہ یہی دشوار گذار راستے ہوں گے۔ تو مجھ میں کوئین مکسچر کے تلخ گھونٹ پینے کی بار بار ہمت نہیں........ اور جو وہ زمانہ ابدی ہو گا تو مجھے اس طرح زندگی گذارنے دنیا پسند نہیں جس میں نہ درد کا احساس ہو نہ خلش کی لذت! نہ آنسو ہیرے کی کنی ہوں جن کو اُگلتے دُکھ ہو اور ضبط کرتے دل کٹ جائے نہ قہقہے ایسے بے اختیار ہوں کہ ہنستے سماج کا تار لرزے اور روکتے جسم کا رُواں رُواں کانپ جائے۔

میں صبح سے شام تک اور کبھی کبھی رات سے صبح تک بغیر سمجھے کتابیں پڑھتی رہتی ہوں اور بے معنی لکھتی رہتی ہوں...... نامکمل افسانہ ادھوری کہانیاں اور لمبے لمبے خطوط...... یہ دلکش دور چار چھ ہفتہ قائم رہتا ہے اور پھر آنکھوں میں تکلیف اور درد کا دورہ...... ایک آدھ مہینہ آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھا کر اونگھتے گذر جاتا ہے جب آنکھیں سنبھلتی ہیں، تو وہی بے مقصد پڑھنا اور بے معنی لکھنا۔

زندگی کا یہ مصرف کبھی کبھی مجھ کو بھی ناگوار محسوس ہونے لگتا ہے مگر کیا کروں! خانہ داری مجھ کو نہیں آتی جو اچھی عورتوں کی طرح چولھے ہنڈیا سے رجوع کروں بیرونی دنیا میں اپنی جگہ بنانا بھی ناممکن...... نہ ادیبۂ ہند بن سکتی ہوں اور نہ خطیبۂ ہند...... ڈاکو یا لیڈر بن جانے کا بھی فی الحال کوئی امکان نہیں۔ اور پھر میرے خاندان والوں کا خیال ہے۔ کہ شہرت عورت کے لئے اچھی

نہیں .... میں ہمیشہ سعادت مند بن کر اپنے بزرگوں کا حکم مانتی آئی ہوں۔

اچھی خاصی بے فکر اور بیکار زندگی کے باوجود دل پر ایک بوجھ اور دماغ پر ایک تھکن سی رہتی ہے .... سُنا ہے کہ جس طرح سُورج ڈوب کر چاند نکلتا ہے اور چاند جا کر پھر سورج آتا ہے اسی طرح انسان کی زندگی میں غم اور خوشی اولتے بدلتے رہتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی آنسو اور مسکراہٹ، رنج و راحت کی ایرا پھیری قائم ہے مگر ایک بات .... جس کا آغاز میری زندگی میں راحت سے ہوا تھا اور پھر لامتناہی رنج .... کون جانے کب ایسا ہوگا کہ وہ گم شُدہ راحت دوبارہ لوٹ کر آئے۔

تسنیم سلیم

تسنیم سلیم چھتاری

ٹوٹ گیا اِک تارا

سائنس کا گھنٹہ تھا اور ماسٹر انومی پڑھائی جارہی تھی، ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا "تارے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟" پروفیسر صاحب اس وقت لیکچر میں گم تھے۔ انہوں نے اس سوال پر دھیان نہیں دیا
اسی لڑکے نے پھر یہی سوال کیا اور پروفیسر صاحب نے دوبارہ بھی نہیں سنا تو میرے قریب سے ایک دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا۔
"مجھ سے پوچھو...... جب کسی کی موت آتی ہے تو تارہ ٹوٹتا ہے"
"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارہ ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے" اس فقرے سے سب کے کان آشنا تھے۔ یہ بات لاکھ مرتبہ چمکتے تارے کی طرح دل کے آسمان پر طلوع ہوئی تھی اور تکلیف کی اندھیری گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

مجھے اس جواب نے وہ ساری کہانی یاد دلادی جس میں ایک تارہ نکلا چمکا اور پھر اپنے پیچھے یاد کی گہری لکیر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

پانچ برس پہلے کی بات! مگر کیا پچاس برس کے بعد بھی میں انجم کو بھول سکوں گا! نہیں! مگر کاش! ان دنوں میں آٹھویں کلاس میں تھا شور و شغب کا عادی اور شرارت پسند! دنیا بھر کے کھیلوں میں حصّہ لیا کرتا تھا اور صبح سے شام تک نت نئی حرکتیں کیا کرتا...... روز کپڑے پھٹتے گھٹنے اور کہنیاں لہولہان رہتیں! اماں ابا کی ڈانٹ بھی پڑتی اور چوٹوں کی تکلیف بھی ہوتی پر اس دکھ میں ایک خوشی کا پہلو تھا میں پھٹے ہوئے کپڑے اور مجروح جسم لیکر انجم کے پاس پہنچتا۔

"انجم خدا کے لئے..... دیکھئے آج اماں سے ضرور پٹ جاؤں گا۔"

"کیا ہو گیا؟" وہ پوچھتیں

"دیکھئے کیسی خراش لگی ہے........ اور یہ قمیص کی آستین مونڈھے پر سے الگ........ اور کوٹ کا بٹن ندارد........ اُف کتنا خون نکلا ہے۔"

"شریر" ایک ہلکا سا تھپڑ میرے بے ترتیب بالوں پر پڑتا "چلو اب خالہ کو دکھا کر لاؤں...... لاڈلے کے ڈھنگ۔"

"ارے ارے...... کیا جوتیاں کھلوایئے گا...... قسم آپ کی چھپ کر آیا ہوں، اب یہاں منہ ہاتھ دھو کر جاؤں گا...... اگر انہوں نے دیکھ لیا اس شان میں تو آپ سمجھ لیجئے کیا ہو گا۔"

"یا اچھا ہے مجھے تو خوشی ہو گی تم مہینے میں چار چھ جوڑے تو چیتھڑے کر لیتے ہو! اور یہ چوٹ روزمرہ کی چیزیں لگتی ہیں...... مجھے تو اس کا ڈر ہے کسی دن ایک آدھ

ہڈی نہ چٹخ جائے ...."

"میرا کیا بگڑے گا .... آپ ہی تیمار داری کیجئے گا"

"ہاں جیسے تمہاری نوکر ہوں نا!"

پھر سچ مچ وہ نوکروں کی طرح سے ہاتھ منہ دھلواتیں کپڑے سینتیں زخموں پر ان کے پرانے دو پٹوں کی پٹیاں بندھتیں جب میں درست ہو کر چلنے لگتا تو وہ ہنس کر کہتیں "پرویز میں کہے دیتی ہوں اگر اب تم نے ...." میں ہنستا ہوا بھاگ آتا اور دوسرے دن پھر اسی حالت میں پہنچتا!

انجم مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ پھر کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں ...... میں اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود ان سے کچھ اس طرح کھل گیا تھا۔ جیسے چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے کا فرق ہی باقی نہ رہا ہو۔ اپنی دلچسپی کی ساری باتیں اُن کو سُناتا اور انکی ساری باتیں بڑے شوق سے سُنتا .... اور کبھی سوچنے لگتا کہ مجھے کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبوں سے کیا تعلق! ——

—— انجم کو ہاکی اور فٹ بال سے کیا واسطہ! مگر یہ نہیں کہ ہم باتیں کرتے اکتاتے ہوں .... ایک کہہ رہا ہے دوسرا محویت سے سن رہا ہے کچھ ایسی باتیں کہ تیسرا آبیٹھے تو حشر تک نہ سمجھے کہ آخر گفتگو کا موضوع کیا ہے۔

ایک سال میں کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی جب شروع میں ہم ان کے یہاں کرایہ دار ہو کر آئے تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ یہ ایک عدد لمبی تڑنگی لڑکی یہاں موجود ہے اُن دنوں میں لڑکیوں سے بے حد گھبراتا تھا۔ آج بھی اسی قدر مگر انجم کو شاید اشرف المخلوقات سے بھی کچھ بڑھ کر پایا اور وہ بہت جلد میرے

خیالات اور احساسات کی شریک بن گئیں۔

دُنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں مجھ میں لاکھوں باتیں نئی پیدا ہوئیں اور پرانی علیحدہ ہو گئیں نئے کھیل سیکھے نئے دوست بنائے نئی باتیں سوچیں اور نئی باتیں سُنیں۔........ آنکھوں میں بھی شاید نئے نئے رنگ تیر تے تھے۔ جب ہی تو جدھر نگاہ اٹھتی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی مگر انجم ! کیا اس ایک سال نے رتی بھر فرق بھی پیدا کیا تھا ! نہیں وہی لبوں کی خفیف سی لرزش پر دھیمی مسکراہٹ کا رقص ! وہی ہلکے سے تھرتھراتی ہوئی پلکوں کے درمیان سے دو تاروں کی شعاعیں وہی سیاہ بالوں میں ڈوبتی اُبھرتی لہریں.......... وہی ہاتھوں کی نرمی اور وہی آواز کا رس! وہ کہیں سے ذرہ برابر نہیں بدلیں اور میں اس یک رنگی سے کتنا مانوس ہو گیا تھا...... کبھی کبھی سوچتا کہ اگر انجم اپنے مخصوص انداز کے بجائے ذرا اکڑ کر ملنا شروع کر دیں خوابیدہ سی آنکھوں کی بجائے اور لڑکیوں کی طرح دیدے پھاڑ کر بات کرنے لگیں تو کیسی عجیب لگیں گی! تجربہ! اور مجھے خیال آتا وہ ہلکے ہلکے رنگوں کی بجائے گہرے رنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیں یا شلوار قمیض کی بجائے ساڑھی باندھنے لگیں تو کیا میں انہیں بیک نظر پہچان لوں گا! اور کیا تب بھی انکے چہرے پر یہی دلکشی ہوگی... ..شاید نہیں۔

ان کی باتیں کیسی اچھی اور کتنی مخصوص تھیں!

میں سونے کے معاملے میں بہت ماہر تھا مگر جب سے انہوں نے بتایا کہ وہ روز صبح کو باغ میں پھول چننے جاتی ہیں اور دیر تک وہاں ٹہلتی ہیں تو آپ سے آپ میری آنکھ صبح سویرے کھل جاتی اور میں سلیپر گھسیٹتا ہوا باغ میں پہنچتا وہ حوض

کے کنارے ٹوکری لئے مجھے اپنی منتظر ملتیں ...... سفید شلوار کے شبنم سے بھیگے ہوئے پائنچے ...... کسی ہلکے رنگ کے باریک سے دوپٹہ میں شگفتہ چہرہ جیسے اوس میں بھیگا ہوا گلاب! اور ایک مخصوص فقرہ!

"کہو...... کیا حال چال ہے؟"

"رات بھر گھٹنے میں درد رہا...... جانیے آپ نے کیا منحوس دوا لگائی تھی۔"

"لو اب مجھے الزام دیتے ہو...... شریر...... اچھا اب میں پھول جمع کرتی ہوں ...... شرط یہ ہے کہ تم کسی پھول کو ہاتھ نہ لگانا۔"

"واہ یہ کیا پابندی ہے" میں جل جاتا۔

"بھائی یہ دوبئر تم مرد ہو...... سنا ہے کہ مردوں کے ہاتھ بہت سخت ہوتے ہیں ...... پھول مرجھا جاتا ہے۔"

میں اس دلیل کو روز مان لیتا اور چپ چاپ بیٹھا انہیں تکتا رہتا۔ وہ پھول توڑ کر واپس جانے لگتیں تو میں ان سے ایک پھول مانگ لیتا

"میرا حصّہ لائیے۔"

وہ کوئی اچھا سا پھول لے کر میرے نائٹ ڈریس کے کوٹ میں لگا دیتیں میں واپس آ کر کپڑے بدلتا اور ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا ......

دن بھر دماغ میں میٹھی میٹھی سوچ کی بارش ہوتی رہتی اور جب شام کو کھیل سے واپسی پر سیدھا ان کے یہاں پہنچتا تو وہ پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بنائے اور مختلف اقسام کے مرہم لئے میری راہ تک رہی ہوتیں!

زندگی کا یہ دور بھی کتنا مطمئن اور پرسکون تھا مجھے ہر صبح شام کا انتظار رہتا
کہ اپنا زخم خوردہ جسم انکی تیمارداری کے سپرد کردوں اور شام گذرنے پر صبح کا
رستہ تکتا کہ ان سے باغ میں جاکر ملوں! اسی چکر میں دن بھاگتے چلے گئے!
رفتہ رفتہ میری یہ کیفیت ہوگئی کہ نہ کسی دوست سے دوستی اور نہ کسی
کھیل سے دلچسپی! ہردم یہی خواہش کہ بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہوں خود بخود یہ بھی
خیال آتا کہ وہ مجھ سے گھبرا نہ جائیں یہ نہ پوچھیں کہ بلا ضرورت کیوں آئے ہو...
... میں وہاں جانے کو لاکھوں بہانے ڈھونڈتا ایسا بھی ہوا کہ دانستہ
ٹھوکر کھائی اور چوٹ مار لی جان بوجھ کر کپڑے پھاڑے اور پہنچ گیا۔ یہ بھی نہیں
تو جاکر منہ بسورنے لگا۔

"خیر تو ہے کیا ہوا؟"

"بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے"۔

"کیوں دوپہر کھانا نہیں ملا تھا؟"

"وہ سب ہضم ہو گیا"۔

"تو پھر" گہری مسکراہٹ سے آنکھوں کی لَو بھڑک اٹھتی

"کچھ کھلائیے جلدی ...."

"ایک شرط پر"

"کہیئے"

"مجھے بازار سے اس رنگ کا اُون لا دو گے؟" وہ نمونہ دکھلاتیں۔

"ایک شرط پر" مجھے بھی شرارت سوجھتی

"وہ کیا؟"

"اگر آپ اُن کے پیسے دیں!"

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہتے مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاتیں اور ہیں بازار سے اُون سلے آتا!

پھر ایک ایسا احساس جو میرے لئے عجیب بھی تھا اور پریشان کُن بھی! میں نے محسوس کیا کہ جب وہ میرے علاوہ کسی اور سے باتیں کرتی ہیں تو مجھے ناگوار ہوتا ہے وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہیں تو میرا جی الجھتا ہے ان سے کوئی ملنے آتا ہے۔ تو مجھے برا لگتا ہے .... خدا جانے کیوں کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں انکے یہاں پہنچا تو اور دو چار لڑکیوں کو بیٹھے پایا میں لوٹنے لگتا تو انجم مجھے روک لیتیں!

"ارے بھئی پرویز کہاں بھاگ رہے ہو؟"

میں ٹھیر جاتا تو .... "یہ تمہارے پسندیدہ پکوڑے ہیں، کھاؤ، نا منہ کیا تک رہے ہو .... ارے بھئی ایسی بھی کیا شرم؟"

ایسے میں انکی میٹھی میٹھی باتیں بھی کڑوی لگتیں .... سب تو جمع ہیں اور میں تماشہ بنا بیٹھا رہوں یہ کیا زبردستی ہے .... اٹھنے لگوں گا تو روکا جاؤں گا اور رک جاؤں گا تو مجھ سے بے فکر ہو کر ادھر ادھر باتوں میں لگ جائیں گی! مجھے بھی اتنا غصہ آتا کہ بیان سے باہر ..... مگر ان سے احتراز تو ناممکن تھا .... ایک نامعلوم سی کشش!

اور ہاں مجھے ایک دُکھ بھی تھا میں انہیں اپنا ساتھی اپنا دوست اپنا رفیق

اپنا سمراز سب کچھ سمجھتا .... اور وہ مجھے ایک کمسن اور نادان بچہ! وہ مجھ سے عمر میں یقیناً بہت بڑی تھیں پانچ یا چھ سال! مگر میں ناسمجھ اور نادان بچہ نہیں میں محبت اور نفرت کو سمجھتا ہوں مجھے آنسو اور ہنسی کی حقیقت معلوم ہے .... بے تکلفی اور محبت کے علاوہ مجھے ان کے سلوک میں ایک طرح کا بزرگانہ اور ناصحانہ انداز دکھائی دیتا اور میں جھنجھلا سا جاتا .... یا تو وہ مجھے اپنے برابر کا سمجھیں۔ میری نگاہوں میں کچھ دیکھیں میری باتوں میں کچھ پائیں .... اور میری کمسنی کا ان کو اسی قدر احساس ہے تو مجھے صحیح معنوں میں بچہ سمجھ لیں .... مجھے دیکھ کر لیٹے سے بیٹھ جاتی ہیں پھسلا ہوا دوپٹہ گلے میں آ لپٹتا ہے .... اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بات پر کہہ اٹھتی ہیں " تم نہیں سمجھتے یہ موہن تم ابھی بچے ہو .... اُف وہ بچپن سے عطر لگانے کا شوق!"

میں چکرا جاتا .... مگر خاموش!

پھر ایک دن ....

" انجم انجم کہاں ہیں آپ؟"

" یہ رہی" وہ ہمیشہ کی طرح ایک آدھ گھنٹے سو مبٹر سے الجھ رہی تھیں،

" آج تو ایسی بھوک لگی ہے کہ زندگی میں نہ لگی ہوگی!"

" ارے تب تو کسی ثقیل غذا کی ضرورت ہے!"

" ہاں بس جلدی کیجیے"

" بلا معاوضہ کے نہیں!"

" کیا چاہیئے؟" میں نے شان کے ساتھ کہا۔

"دیکھو پرویز یہ میں اپنی ایک سہیلی کا سویٹر بن رہی ہوں اور بدقسمتی سے اس میں ایک لچھی اون کم پڑے گا"

"میں تو نہیں لاؤں گا" سہیلی کے ذکر سے میں چڑ گیا۔

"کیوں بھئی یہ خفگی کیسی؟"

"جب دیکھو آپ سہیلیوں کے سویٹر بنتی ہیں.......کبھی ہم کو بھی کچھ بن کر دیا.......میں تو اب ہرگز ہی اُون لا کر نہ دوں گا"

"اچھا یہ بات ہے.........ایمان سے کہنا کبھی تم نے فرمائش بھی کی؟"

"میں کیوں فرمائش کرتا جب آپ کو خود ہی خیال نہ آیا"

"میں چاہتی تھی کہ تم اپنے مُنہ سے کہو"

"میرا دل تھا کہ آپ کو اپنی طرف سے رحم آجائے"

وہ ہنسنے لگیں اور پھر بولیں "مجھے یہ بات تسلیم ہے مگر دیکھو پرویز اگر تم نے اس کا شکوہ کیا تو یہ ہم دونوں کے لئے خوشی کی بات نہیں!"

ان کا یہ سوال! کہنے کا انداز!! اور اپنی مسرت کی انتہا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک ہفتہ بعد جو گیا تو انہوں نے سفید رنگ کا بیحد خوبصورت اور نرم سویٹر مجھے پہنا دیا۔

"بولو پسند ہے؟"

"سویٹر تو پسند ہے مگر آپ کا یہ سوال کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"آپ کا خیال تھا کہ میں اسے ناپسند بھی کر سکتا ہوں؟"

جب اپنی طرف لوٹا تو زمین پر قدم نہیں پڑتے تھے۔ اور آپ سے آپ ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔

اماں نے دیکھ کر کہا "ارے یہ نیا سوئیٹر!؟"

میں نے کہا "جی ہاں انجم نے بن کر دیا ہے"۔

وہ کہنے لگیں "انجم بہت محبت کرتی ہے تجھ سے...... اگر تیری عمر کی ہوتی تو ہم شادی کر دیتے!"

اماں نے یہ فقرہ یونہی سرسری طور پر از راہ مذاق کہا تھا۔ مگر میں اس حد تک حواس باختہ ہوا کہ دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

"انجم کی شادی اور میرے ساتھ.... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر نہیں!! میں ایسا خواب بھی دیکھوں تو پھر آنکھ کھولنے کی نوبت نہ آئے! میں انجم سے محبت کرتا ہوں اُن کا احترام کرتا ہوں! وہ کہیں تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں مگر شادی!! اُن کی تو محض پرستش کی جا سکتی ہے....... اگر کہیں یہ ممکنات سے ہوتا تو بھی میں اسکے لئے تیار نہ ہوتا۔ ...... میری نگاہ میں تو یہ اُن کی توہین ہے .... اور وہ اگر سنیں تو شاید پھر مجھ سے بات بھی نہ کریں۔...... مجھے تو وہ بچہ سمجھتی ہیں...... چھوٹا سا بچہ جو چٹکا کر مسور تا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے .... جو بھوک کی حالت میں ان کے پاس جاتا ہے۔ اور کچھ کھا کر مطمئن ہو جاتا ہے ..... کمسن بچہ جسے ابھی سگرٹ نہیں پینا چاہئے۔ عطر نہیں لگانا چاہیئے....... اور شاید وہ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس دودھ پیتے بچے کو ان سے محبت کرنے کا حق تک حاصل

نہیں ہے .... اسی لئے انہوں نے میری حالت کو قابلِ غور نہیں سمجھا اور مجھے اُن سے اُن لاکھ باتوں میں سے ایک بھی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی جو میں دن رات سوچا کرتا تھا .... میں انہیں ہر دم دیکھنا بات کرنا پاس بیٹھنا ضرور چاہتا ہوں مگر شادی! اگر اسکی کوئی صورت ہوتی تو کیا میں اسے برداشت کر لیتا ..... میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں تاحیات اُن کو باغ کے پھول چنتا ہوا دیکھتا رہوں ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں! وہ سر جھکائے میرے ہاتھ پیروں کی چوٹوں کا معالجہ کرتی رہیں اور میں ٹکٹکی باندھے ان کے بالوں میں گھونگر کی لہریں تکتا رہوں۔ وہ بڑے انہماک سے میرے لئے تکیے تلتی رہیں اور میں پاس بیٹھا ان کے رخساروں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی پلکوں کا سایہ تھرتھراتا ہوا دیکھتا رہوں .... ایسی ہی ایک موہوم سی لرزش جیسے اُن کے سامنے پہنچکر میرے پیر ڈگمگا جاتے ہیں۔

میں جاؤں تو وہ مسکرا کر پوچھیں "ہاں تو کیا حال چال ہے؟" میں واپس آنے لگوں تو ہنس کر کہیں "پر ویز میں کہے دیتی ہوں ..... "شادی تو ان کی جلد ہی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ جو اُن سے عمر میں دو چار سال بڑا ہوگا کہیں نوکر ہوگا .... اور پھر جیسے وہ پسند کریں گی!"

مجھے خیال آیا کہ اگر انکی شادی ہوگئی تو وہ یہاں سے چلی جائیں گی۔ اور میری زندگی کا سہانا خواب بکھر کے رہ جائے گا۔ دل کو زبردست دھکا لگا ...... کیا اب میں ان سے جدا زہ کر بھی خوش رہ سکتا ہوں .... وہ

میری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہیں اُن کی مسکراہٹ اُن کی باتیں اُن کی گہری گہری آنکھیں .... اور میں گہری گھاٹیوں میں ڈوب گیا ......"

اماں نے کہا "کل جاوید آ رہا ہے"۔

میری محویت کا تسلسل ٹوٹ گیا .... چلو اچھا ہے بھائی جان آ رہے ہیں ڈیڑھ سال بعد ان سے ملاقات ہو گی۔ دیکھیں اب بھی پہلے کی طرح سے شعر و افسانہ پسند ہیں یا نوکری نے کچھ تبدیل کر دیا۔!

اُدھر بھائی جان بی۔ اے کر کے نوکر ہوئے اُدھر ابا جان کا تبادلہ ہوا اور ہم یہاں آ گئے۔ اماں بیچ میں ایک مہینہ کے لئے ان کے پاس ہو آئی تھیں اور ابا جان بھی اکثر دورے کے سلسلے میں ان سے مل لیتے بس میں نے ہی ڈیڑھ سال سے نہ دیکھا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ابا جان کو بھائی جان نے لکھا بھی تھا کہ پرویز کو یہاں بھیج دیجئے میں نیم راضی ہو چلا تھا [illegible] کہ "تم ناحق جا رہے ہو گول کر جاؤ۔" میں نے جھٹ سے آ کر اماں جان سے انکار [illegible] گیا اب بھائی جان کو ایک مہینہ کی چھٹی ملی تو وہ یہاں خود ہی آ رہے ہیں بھائی جان کو لینے اسٹیشن گیا وہ حسب توقع خوب صاحب بہادر بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "کیسی جگہ ہے؟ ایک مہینہ خوب شاندار گزرے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا "اب جیسی بھی جگہ ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔"

"یوں نہیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ سوسائٹی کیسی ہے؟ .... سینما ہاؤس کیسے ہیں کلب کتنے ہیں یا"

اُور ہوٹل کہاں کہاں ہیں؟ .... تفریح کا کیا پروگرام رہتا ہے۔"
میں نے کہا "مجھے ہوٹل اور کلب کی تو خود بھی خبر نہیں۔ سوسائٹی اچھی خاصی ہے دو چار سینما ہاؤس بھی ہیں"۔
"انگلش فلم چلتی ہیں؟"
"کبھی کبھی ...."
"لاحول ولا قوۃ"
"کیوں؟"
"وقت ضائع ہوگا یہاں اور کیا .... آخر تم چھٹیوں میں میرے پاس کیوں نہ آگئے ...... کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟ اسکول اور گھر؟ بس؟"
"ہاں بس اور کیا"
"دل نہیں گھبراتا؟ صحت ٹھیک ہے؟"
"کمال کرتے ہیں آپ بھائی جان ...."
بھئی کم از کم میں تو اس طرح نہیں رہ سکتا ...... سوچتا ہوں کہ مہینہ بھر کے بجائے دس پندرہ دن میں بھاگ جاؤں .... تم بھی میرے ساتھ چلنا! سمجھے؟ وہیں اسکول میں داخل ہو جانا .... انسان بن جاؤگے سمجھے؟"
اسٹیشن سے گھر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔
اماں سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کئے!
"یہ کس کا بنگلہ ہے؟ وہ کس کی کوٹھی ہے؟ اُدھر کون رہتا ہے؟"

میں سب بتاتا رہا۔

"اور یہ برابر کا گھر ......؟"

"انجم!"

"کون انجم ؟ یہ کون صاحب ہیں ؟"

اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انتہائی مہمل قسم کا جواب دیا تھا!

"ایک وکیل صاحب ہیں وہ مع فیملی رہتے ہیں۔"

"وکیل صاحب کا نام نذر دار ہے! انجم" بھائی جان نے زیرلب کہا

میں گھبرا گیا "وکیل صاحب کا نہیں انجم تو اُن کی لڑکی کا نام ہے۔"

"اوہ" بھائی جان نے مجھے سرتاپا گھورا "تو کیا بہت دوستی ہے تم سے؟"

"دوستی کیا...... بس" میں ہٹپٹا گیا۔

"خوب! گویا کہ آپ بھی!" انہوں نے معنی خیز طریقے پر ہنسنا شروع کیا۔

"تو پھر تفصیل بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟"

"اچھی خاصی ہیں ...... آپ کی برابر ہونگی" میں نے اُن کا شُبہ مٹانا چاہا۔

"میری برابر؟ اوہ! یوں کہو! میں تو سمجھا تھا کہ آپ! ......"

میں سوچنے لگا کہ جو بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں اُسے بھائی جان یوں لمحوں میں کیسے سمجھے لے رہے تھے!

بھائی جان کرسی پر لیٹ کر کوئی انگریزی کا ناول پڑھنے لگے اور میں نے سوچا کہ دیر تو ہوگئی ہے مگر لاؤ انجم کے یہاں ہو آؤں ...... اُن کو بتاؤں گا

کہ ہمارے بھائی جان آئے ہیں .... دفعتہً مجھے دروازے پر اُن کی آواز سنائی دی "پرویز"

میں نے چونک کر کہا "جی"

"کیا ہوا آج تم ...." وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئیں۔ بھائی جان بھی سر اُٹھا کر گھورنے لگے۔

"یہ میرے بھائی جان ہیں" میں نے تعارف کی رسم ادا کی "بھی" اور بھائی جان یہ انجم ہیں ...... میں نے آپ کو بتایا تھا نا"

بھائی جان نے مسکرا کر اُن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

"Pleased to meet you"

انہوں نے قصداً بھائی جان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور کھڑکی سے باہر نگاہ جما کر بولیں "معاف کیجئے مجھے انگریزی نہیں آتی"

"اوہ" بھائی جان نے سنبھل کر کہا "کوئی حرج نہیں مجھے تو اردو آتی ہے"۔

"اچھا تو میں چلتی ہوں" وہ مڑ کر جانے لگیں۔

"انجم ذرا تو بیٹھئے نا" میں نے سوچا کہ اب بھائی جان اُن کو بد اخلاق اور پتہ نہیں کیا کیا کہیں گے اور میرا جی جلے گا۔

"جی ہاں آپ تشریف لائی ہیں تو بیٹھئے نا" بھائی جان نے بھی کہا۔

"بہت کام ہے .... آج پرویز نہیں آئے تو میں سمجھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی .... اچھا آداب عرض" اور وہ چلی گئیں۔

میں نے بھی ان ہی نظروں سے بھائی جان کی طرف دیکھا کہ کیا کہتے ہیں مگر وہ کسی سوچ میں گم تھے۔

دوسرے دن اسکول کی واپسی پر میں نے سوچا کہ اب ان کے یہاں چلنا چاہیئے......... اور اٹھا ہی تھا جو بھائی جان نے کہا۔

"کہاں چلے؟"

"کہیں نہیں"

"انجم کے یہاں نہیں جاؤ گے؟"

"سوچ رہا ہوں"

"چلو! ہم بھی چلتے ہیں" وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دئے...... میرا دل چاہا کہ کاش وہ میرے ساتھ نہ جاتے میں انجم سے اچھی طرح بات بھی نہ کر سکوں گا اور کل کی سی وحشت پھیلے گی۔

وہاں پہنچے تو انجم کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بھائی جان کو بہت پیار کیا دعائیں دیں وکیل صاحب آ گئے چائے کا دور چلتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا انجم کو دیکھتا رہا جو آج بالکل مہر بہ لب تھیں تھوڑی دیر بعد ہم لوٹ آئے۔ بھائی جان دیر تک اماں سے وکیل صاحب کی تعریف کرتے رہے۔

تیسرے روز میں اسکول کی واپسی پر اپنے معمول کے مطابق سیدھا انجم کے یہاں پہنچا۔ اول گھر جانے میں خطرہ تھا کہ پھر بھائی جان ساتھ چلیں گے! اور انجم سے بات چیت نہ ہو سکے گی۔ میں انہیں یہ بتانے کے لئے مضطرب تھا کہ اس دفعہ مجھے کرکٹ میں کپ ملنے کی امید تھی۔ پہنچا تو دیکھا کہ صوفے پر

لیٹی ہوئی آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہیں۔ میں چُپ چاپ جاکر پیچھے کھڑا ہو گیا اور بصد مشکل یہ شعر سمجھ سکا۔

" نہ جانے آج کیوں دھڑکن مرے دل کی نہیں رکتی
یہ آہٹ آ رہی تھی آپ کے گزرے نقشے ابھی دل سے"

کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر شرارت سوجھی اور پانی کا گلاس میز پر سے اُٹھا کر ان کے منہ پر چھینٹا دیا۔

تڑپ کر اُنھوں نے گردن موڑی اور مجھے دیکھ کر ہنس دیں"۔ اچھا ٹھہر جاؤ بدلہ نہ لیا ہو تو .... بہت شریر ہوتے جا رہے ہو"۔

" آہا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں .... افوہ"۔

" واقعی؟"

" ہاں میں ڈرا تھا۔ کہ کہیں دھوبی گدھے کی تلاش میں ادھر نہ آ نکلے"۔

" تو ہماری آواز گدھے جیسی ہے" انہوں نے میرے منہ پر کشن دے مارا

" نہیں تو یہ ...... معاف کیجئے مُنہ سے سچی بات نکل گئی"۔

" ٹھہر جاؤ بدتمیز تمہارے لئے کھانے کی چیزیں رکھی تھیں اب ہرگز نہ دونگی"

" کھل گئی قسمت ...... آپ بھی کتنی اچھی ہیں"۔

" جی ہاں تب ہی تو یہ قدر ہوتی ہے"

کہہ تو رہا ہوں بھول کر مُنہ سے نکل گیا .... اب کھلایئے نا کیا ہے؟

.... پہلے آپ کبھی ایسی عمدہ نہ تھیں .... کیسے میرا خیال آ گیا؟"

" جاوید صاحب کے لئے بنائے تھے ...... چونکہ تمہاری پسند کے نکلنے

تھے اس لئے رک گئے۔"

"تو کیا بھائی جان یہاں آئے تھے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے!"

"آپ سے باتیں ہوئیں؟"

"ظاہر ہے ابا جان بھی یہاں موجود نہ تھے اور اماں کو تم جانتے ہو کہ وہ کتنی کم گو ہیں۔ ...... بیچارے جاوید صاحب چپکے ہی بیٹھے رہتے!"

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟" میں یہ معلوم کرنے کو بیتاب ہو گیا۔

"وہ اپنے دوران تعلیم کی کچھ دلچسپ باتیں سناتے رہے۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہو گیا .... شاید میں یہ چاہتا تھا کہ انجم کو سوائے میرے اور کسی کی باتیں دلچسپ نہ لگیں!

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روز جب میں اسکول کی واپسی پر ان کے پاس جاتا تو وہ مجھے بتاتیں کہ ابھی جاوید صاحب یہاں سے گئے ہیں .... اور یہ بھی کہ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں .... انجم کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا اسی طرح باتیں، چوٹوں کا معالجہ، کپڑوں کی درستی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہیں .... کوئی ہمارے درمیان حائل ہو گیا ہے! کون!؟ بھائی جان! مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے رقیب تو نہیں ہو سکتے تھے! یہ باتیں اب سوچتا ہوں اس وقت تو ایک ہی خیال تھا کہ وہ مجھ سے نہ چھن جائیں .... اور بس!

اتوار کی صبح بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ ان کے یہاں پہنچے باتوں

بھائی جان ہمیشہ اسی سے شروع کرتے

"کون سا گیت سنو گی انجم؟
گنگناتا سا فسانہ کوئی
یا محبت کا ترانہ کوئی
کیسے بنتا ہے نشانہ کوئی
کون سا گیت سنو گی انجم؟"

اور آخر کار سب ہی طرح کے گیت سُنا ڈالتے [illegible] ھویا کھویا
سا رہنے لگا........ بھائی جان [illegible] یا.......
پہلے دن ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ دن [illegible] ے اور اب اُنہوں
نے بیماری کے نام سے ایک مہینے کی چھٹی [illegible] نکہ یہ بہت چھوٹا شہر
تھا جس میں اچھے ہوٹل اور نہ جمخانہ کلب [illegible] جان خوش تھے اور انجم
بھی.......... اگر میں [illegible] وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر اس
کا تذکرہ کس سے کرتا [illegible] در دل پہ ہر لمحہ ایک بوجھ سا رہتا اور
رُوح [illegible] بند کرنا چاہتی ہو!
و [illegible] رفتار کو میں نہ روکنا چاہتا تھا۔ اور پھر مشیت کو ان کھیلوں سے
کیا ایسے نامکمل افسانوں کے خاکے بہت سے بکھرے پڑے رہتے ہیں......
اگر آنسو کسی لمحہ بھی نہ رُکیں تو ان کا دل سے احترام ہی جاتا رہتا ہے۔

یونہی چپ چاپ وہ دوسرا مہینہ بھی بیت گیا۔
ابا جان نے کہا "جاوید تم نوکری پہ کب جا رہے ہو"

" سمجھ میں نہیں آتا ابا جان"۔
" کیوں؟ چھٹی کون سی تاریخ سے ختم ہوتی ہے؟"
" مجھے آج وہاں موجود ہونا چاہیئے تھا"
" تو پھر تم کیوں نہیں گئے؟"
" سوچتا ہوں کہ اب خود جاؤں یا استعفیٰ بھیج دوں"۔
" استعفیٰ"۔ ابا جان نے چونک کر پوچھا" اب نوکری کا ارادہ نہیں ہے؟"
" یہ نوکری کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اباجان........ پھر ہمارا افسر بڑا سخت ہے بس ذرا ذرا سی بات پر........ اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ وہاں مجھے اچھا کھانا نہیں ملتا........ آپ نے محسوس کیا کہ یہاں آکر میری صحت کتنی سنبھل گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کچھ دن یہاں رہ کر بے فکری کروں"۔
میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں لے جاکر بھائی جان مجھے آدمی بنانا چاہتے تھے وہ جگہ اُن کی نظر میں اب کیوں بے رنگ و بو ہوگئی ہے جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہیں وہاں کھانا کیوں بُرا ملتا ہے جہاں اچھی انگلش فلمیں چلتی ہیں وہاں کیوں دل نہیں لگتا اور جس افسر کی وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے وہ اب بُرا کیوں ہوگیا ہے........ میں یہ سب جانتا تھا اور مجھے بھائی جان سے ہمدردی بھی تھی،
.... وہ میرے رقیب تو نہیں انہوں نے انجم کو میری طرف سے تو نہیں بدل ڈالا........ اور پھر وہ کیا جانیں کہ میں اور اُس رہتا ہوں!
میرے دل میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ کاش انجم کی بھائی جان کیسا تھ شادی ہو جائے! میں انہیں خود کوئی گیت نہ سُنا سکا مگر زندگی بھر گیت سنتے

تو دیکھتا رہوں گا......... اور کیا یہ میرے لئے بہت نہیں!

بھائی جان نے نوکری چھوڑ دی...... انجم سنتی رہتیں ہیں دیکھتا رہتا اور وہ گاتے رہتے!

کوئی فطرت کا بہار ہیں نغمہ؟ چاند تارے دل کا خمار ہیں نغمہ؟
یا شگوفوں کا نگار ہیں نغمہ؟ کون سا گیت سنو گی انجم؟

نغموں کا ایک تانا بانا سا بن کر ہمارے چاروں طرف پھیل گیا ایک طرف بھائی جان تھے ممتاز......... دوسری طرف میں تھا مجبور! بیچ میں انجم ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی! ایک کے حال سے غافل اور دوسرے کی باتوں سے باخبر! میں دن رات اس الجھن میں اپنے لئے سکون کی تلاش کرتا رہتا...... مگر میں چاہتا کیا تھا یہ مجھے آج بھی معلوم نہیں ہے!

ایک صبح جب ابا جان کسی ضروری کام سے ہفتہ بھر کے لئے باہر جا رہے تھے تو چچا جان کی علالت کا تار موصول ہوا!........ ابا جان کو انتہائی ضروری کام تھا۔ انہوں نے بھائی جان سے کہا کہ تم آج ہی شام کو اپنے چچا کے پاس لکھنؤ چلے جاؤ اور ہفتہ بھر بعد جب میں وہاں پہنچوں تو تم واپس چلے آنا۔ بھائی جان اس خبر سے مضطرب ہو گئے مگر لاچار تھے اسی شام کو جانا پڑا انجم سے ملنے گئے تو میں عمداً گھر پر رہ گیا میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ جاؤں! واپس لوٹے تو کتنے افسردہ تھے! مجھے رحم آنے لگا...... بھائی جان کو اسٹیشن پہنچا کر میں نے سوچا کہ انجم کے پاس چلتا ہوں اُن سے کہوں گا کہ بھائی ایک ہفتہ بعد ضرور آجائیں گے!

ان کے یہاں پہنچا وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھیں میری ہمت نہ ہوئی کہ ان کو آواز دوں ا چپ چاپ لوٹ آیا۔

پھر دوسرے دن صبح کو باغ میں گیا ! نومبر کی شروع تاریخیں تھیں اور صبح کے وقت خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی مگر میں صبح کو باغ میں ضرور جاتا تھا اور وہ مجھے وہاں ضرور ملتی تھیں سوچ رہا تھا کہ آج خدا جانے وہ موجود ہوں گی، یا نہیں مگر پہلی نظر میں اُن کو حوض کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھ لیا ! حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے پہلا سوال کیا

" جاوید ایک ہفتہ بعد ضرور واپس آجائیں گے ؟"

" ہاں ضرور"۔ انگلینڈ

" اچھا .... پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا ! سمجھے ؟"

" سمجھ گیا"

انہوں نے پھول توڑے اور جب ایک گلاب کا پھول میرے کوٹ میں لگا کر واپس چلی گئیں تو میں نے سنگ مرمر کے چبوترہ پر بیٹھ کر محسوس کیا آج بہت دن بعد میری بے چین روح کو کسی نے لوریاں دے کر آرام کی نیند سلا دیا ہے ....

اور میں بہت خوش ہوں !

ایک ہفتہ گزر گیا۔

" آج تمہارے بھائی جان کے آنے کا دن ہے ؟"

" جی ہاں آج آجائیں گے !"

" تم اسٹیشن جاؤ گے"۔

"ضرور جاؤں گا۔"

"پھر ان کے ساتھ یہاں آؤ گے؟"

"ضرور آؤں گا۔"

میں شام کو گیا ضرور مگر بھائی جان کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا! انجم کو یہ بتانے کہ چچا کی طبیعت بدستور خراب ہے بھائی جان ایک ہفتہ بعد آئیں گے۔ اور ایک ہفتہ! یہ دوسرا ہفتہ ان کے چہرہ پر اداسی کا رنگ مل مل کر گزر گیا مگر بھائی جان پھر بھی نہیں آئے ...... چچا کی طبیعت ابھی تک خراب تھی!

آخر کار ابا جان اماں کو لے کر وہاں چلے گئے اور میں یہاں تنہا رہ گیا۔ زیادہ وقت اسکول کے علاوہ انجم کے پاس گزارتا وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھ[illegible]آنسو امڈ آتے ...... میرا دل ڈوب جاتا ......

میں اس آتش بداماں جنت سے بھی باز آیا ...... بھائی جان لوٹ آئیں تو پھر بلا سے انجم کی یہ اداسی ساری کی ساری زندگی کے لئے مجھ پر مسلط ہو جائے! مگر ان کے آنسو! جیسے یہ میرا گناہ ہو۔ دو ڈھائی مہینے ایسے عجیب گزرے.... رُکے رُکے اور پھیکے پھیکے ...... ابا جان لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چچا جان اچھی طرح سے ہیں اور اب میں جاؤں گا تو تمہاری ماں کو لے آؤں گا جاوید بھی تب ہی آئیں گے۔"

میں نے انجم کو جا کر بتایا۔ "آ جائیں تب کی بات ہے۔"

اور میں نے سوچا کہ آخر کیوں نہیں آئیں گے ...... ضرور آئیں گے۔

ابا جان دوبارہ گئے واپسی کا جو دن بتا گئے تھے اس کا میں نے لمحہ لمحہ گن کر

انتظار کیا!" آج بھائی جان ضرور آجائیں گے۔"

"دیکھو"

"مذاق نہیں ڈٹ کر ناشتہ کھلانا پڑے گا آپ کو۔"

"اچھا"

اسٹیشن پہنچا گاڑی لیٹ تھی اور مجھے جھونجھل آرہی تھی خدا خدا کرکے ریل آئی تو ابا جان تنہا اُترتے ہیں گھٹ کر رہ گیا۔

"بھائی جان اور اماں کہاں ہیں؟"

"وہیں ہیں"۔ ابا جان نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں آئے۔"

"بس ہفتہ بھر بعد آنے والے ہیں...... جاوید تو انگلینڈ جارہا ہے۔"

"ایں"۔ مجھے ابا جان کی بات کا اعتبار نہ آیا۔

"مذاق نہیں........ سارا انتظام ہو چکا ہفتہ بھر بعد تو یہاں آئے گا اور دو دن ٹھہر کر اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔"

"یہ کیا سوجھا"

"اس کو تو ایسی ہی نئی نئی سوجھتی ہے پہلے کہا نوکری کروں گا میں نے کہا تمہاری مرضی پھر استعفا دیدیا میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اب بیٹھے بٹھلائے تعلیم کا شوق ہوا تو ولایت چل دئے! مجھ کو تو اب خبر ہوئی جب ان کا پاسپورٹ تک بن چکا ہے!"

"آپ نے روکا نہیں"۔ میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"میں کیا روکتا وہ اس ست... خود مختار ہیں اُن کو چاہیئے تھا کہ اوّل مجھ سے
اجازت لیتے ماں رو رو کر جان کا خون کر رہی تھی، مگر صاحب زادے نے قسم کھائی
ہے کہ ولایت جا کر پڑھوں گا۔"

میں سکتے کے عالم میں گھر لوٹ آیا۔ انجم کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی
یہ ولایت کا قصہ اگر وہ سُنیں گی تو کیا کہیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف توبہ!
میں نے کوشش بھی کی تو وہاں نہ جا سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبح کو باغ میں گیا۔

"جاوید نہ آئے تو آپ بھی چھپ گئے!"

"ابّا جان نے کچھ کام بتا دیا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان تو جواب کیا آتے مگر نہ جانے کیوں نہیں آئیں؟"

"جناب شرط ہے اگر اگلے ہفتے سب نہ آ جائیں۔"

"بس جاؤ بھی۔" انجم نے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتے ہوئے جھکی جھکی پلکیں میری
طرف اٹھائیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں سر سے پیر تک لرز گیا!!

اور لاکھ کوشش کی مگر بھائی جان کے ولایت جانے کی بات نہ سنا سکا۔
جس دن پھر ان کے آنے کی خبر تھی اس دن مجھ کو علم تھا کہ وہ ضرور آ جائیں گے۔ مگر
اس یقین میں اتنا دکھ اور غم تھا۔ میں ہی جانتا ہوں وہ آئیں گے اور تیسرے دن
چلے جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی جگہ جہاں سے واپسی کے لئے ہفتے نہیں گنے جاتے
بلکہ برسوں کا شمار ہوتا ہے۔

بھائی جان ریل سے اترے

"آپ ولایت جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں"

"کیوں"؟

"پڑھنے"

"کیا پڑھنے"؟

"بس کچھ....... محض ایک ولایتی ڈگری چاہیئے!" اور وہ ہنسنے لگے۔

گھر آکر انہوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا مجھ سے انجم کے متعلق ایک بھی سوال نہ کیا اور نہ وہاں گئے میں بھی دم بخود بیٹھا رہا!

اماں بہت دن کے بعد آ[illegible] لئے انجم کی والدہ ان سے ملنے کو آئیں اماں نے انہیں بتا د[illegible] پرسوں ولایت جا رہا ہے۔

میں بوکھلا گیا کہ ا[illegible] جا کر کہہ دینگی اور پھر نہ جانے کیا ہوگا! مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غص[illegible] اس طرح بنتے تھے کہ جیسے اُن کو انجم سے بہت محبت ہے اور اب بلا[illegible] ولایت جا رہے ہیں تو اُن سے ملنے تک نہیں.....

.....ان کی زندگی برباد کرنے کے یہ ذمہ دار ہیں ان کا کیا بگڑا انجم بجھ کر رہ جائیگی اور میری دنیا پھیکی اور بے رس! کیا مجھے انجم سے محبت نہیں؟ اور میں اُن کا دکھ خوشی سے برداشت کر سکوں گا! اس گہری سوچ نے دو تین دن شام تک میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں ڈر کے مارے انجم کے پاس بھی تو نہ جا سکا نہ جانے اُن کی کیا حالت ہوگی۔ بھائی جان کے سامان کی مکمل فہرست بنا کر میں کمرے میں گیا۔

جہاں وہ اِدھر اُدھر کی چھوٹی موٹی چیزیں ہینڈ بیگ میں بند کر رہے تھے!— دروازے پر پہنچا تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ اُلجھے ہوئے

سے الفاظ۔ انجم وہاں موجود نہیں! میرے قدم رک گئے۔ کچھ دیر بعد بھائی جان کی آواز تھی۔

"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم"

بھائی جان کو اب بھی جاں نثار اختر کی کوئی نظم یاد آگئی تھی۔ مگر انجم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔

"تو پھر زندگی کیا ہے؟"

بھائی جان کا جواب سننے سے [illegible]ہاں سے لوٹ آیا انجم کے آنسو بہتی آگ کی طرح میری رگوں میں گھل کر مجھے [illegible] رہے تھے!

دوسرے دن صبح کو بھائی جان نے مجھ[illegible] سٹیشن جا کر گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر آؤ۔ میں نے بمبئی جانے والی گاڑی کا [illegible]م کیا جو رات کو ساڑھے دس بجے یہاں سے جاتی تھی اور پھر گھر کی طرف لوٹا۔ [illegible]ھے اپنے باغ کے پھاٹک پر مل گئیں!

"پرویز میرا ایک کام کر دو گے؟"

"کہئے" میں نے ان کی متورم آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے بسی کے ساتھ کہا۔

"جاوید آج جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کتنے بجے!"

"رات کو ساڑھے دس بجے۔"

"اچھا...... تو ان سے کہنا کہ جانے سے پہلے میں ان سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

"اور دیکھو کہنا کہ سات بجے شام کے بعد سے میں ان کا یہاں باغ میں انتظار کروں گی وہ مجھ سے کھڑے کھڑے مل لیں۔"

"مگر انجم یہاں باغ میں تو رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔"

"کوئی حرج نہیں میں ان کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔"

"لیکن آپ خود؟"

"میری پروا نہ کرو .... تو پرویز تم اُن سے کہہ دوگے نا؟"

"ہاں ہاں ضرور۔"

میں دیر تک کھڑا ہوا اُن کو ڈگمگاتے قدموں سے واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا گھر آ کر بھائی جان کو ان کا پیغام سنا دیا وہ سن کر چپ ہو گئے اور پھر سے مہمانوں کا تانتا لگ گیا! ابا جان کے دوست اور اماں کی سہیلیاں سب جمع ہونے لگیں کوئی امام ضامن لیکر آیا تھا اور کوئی صدقہ اتارتا تھا!

شام گذری اور رات ہو گئی۔ "بھائی جان آپ انجم سے مل لیجیے!"

"وہ خود یہاں کیوں نہیں آ جاتیں؟"

"باغ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں نا۔"

"میں کس طرح جاؤں یہاں اتنے لوگ جمع ہیں۔"

"دس پندرہ منٹ کو ہو آئیے اب آٹھ بج گئے اور وہ سات بجے سے وہاں آ گئی

منتظر ہوں گی"۔

"اچھا دیکھو موقع نکالتا ہوں"۔

نو بج گئے۔

"بھائی جان اب نو بج چکے۔۔۔۔۔ آپ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں چلے جائیں گے"۔

"ہاں"

انجم سے مل لیجئے نا"۔

"دیکھو اماں کس قدر رو رہی ہیں۔ یہاں سے اُٹھ کر گیا تو وہ کیا سوچیں گی

"بس پانچ منٹ کے لئے"۔

"کوشش کرتا ہوں"۔

"بھائی جان دس بج گئے"۔

"کیا کروں پرویز سمجھ میں نہیں آتا"۔

"ایک لمحے کو ہو آیئے"۔

"کوئی اٹھنے دے تبھی نا"۔

سوا دس ہوئے تو ابا جان نے کہا۔" بیٹا جاوید اب تمہاری روانگی کا وقت ہو گیا"۔

"چلتا ہوں ابا جان"۔

میں نے مضطرب ہو کر بھائی جان سے کہا۔" بھائی جان انجم"۔

"مجبور ہوں پرویز"

اور جب موٹروں میں بیٹھ کر سب اسٹیشن چلنے لگے۔ تو میرے کانوں میں آپ سے

آپ انجم کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں کاش بھائی جان ان سے لمحہ بھر کو ہی جا کر مل لیتے وہ اس شدت کی سردی میں دھڑکتے دل سے منتظر ہوں گی۔ اسٹیشن پہنچے تو اماں کی روتے روتے بُری حالت ہو رہی تھی بھائی جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے "خط لکھتے رہنا پروین۔"

جب ریل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آنسو پونچھ کر اماں سے کہا "اب واپس چلیئے۔" ابا جان تو بھائی جان کو چھوڑنے بمبئی گئے تھے۔ میں اور اماں لوٹ کر آئے اماں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے ورنہ میں اسی وقت جا کر انجم سے ملتا میرے سینے میں آنسوؤں کے طوفان ابل رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ سارے آنسو میں انہی کے سامنے جا کر بہاؤں ...... ممکن ہے کہ ہم دونوں کو تسکین ہو جائے رات بھر بستر پہ کروٹیں بدلتا رہا اور سینے میں نامعلوم چبھن ہوتی رہی۔

صبح کو چھ بجے کے قریب میں بستر سے اٹھ کر برآمدے میں نکل آیا۔ فروری کا شروع تھا اور گذشتہ رات غیر معمولی سردی رہ چکی تھی۔ کہر کے اثر سے آس پاس کچھ نظر نہ آتا تھا۔ خلا میں نظر جائے خاموش کھڑا رہا جب سے سردیاں شدت کی ہوئیں تو انجم نے صبح سویرے کے بجائے دن چڑھے باغ میں نکلنا شروع کر دیا تھا میرے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اس لئے میں بھی دیر سے جایا کرتا تھا۔ آج ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کہرے اور ٹھنڈ میں نکل جاؤں اور باغ کا چکر کاٹوں اور کوٹ پہن کر میں باغ میں چلا گیا۔ جہاں اوس نے ہر چیز تر تھی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی ...... چکر لگا کر سنگ مرمر کے

چبوترے تک پہنچا اور دفعتہً ٹھٹھک کر رہ گیا......کوئی لیٹا ہوا تھا! شاید انجم!

میں دوڑ کر قریب گیا........ وہی تو تھیں!

"انجم........ انجم" وہ شاید سو رہی تھیں........ وہ اتنے سویرے بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں آ گئی ہیں اور اس برف جیسے سنگ مرمر پہ لیٹی ہیں.......

میں نے حیران ہو کر اُن کا ہاتھ کھینچا "انجم"۔

مگر وہ بے حس و حرکت تھیں کپڑے اوس کے اثر سے بالکل بھیگے ہوئے تھے ہاتھ برف سے زیادہ ٹھنڈے اور چہرہ سنگِ مرمر سے زیادہ سفید کیا انہوں نے ساری رات یہاں گزاری ہے! اور یہ حالت!

بجلی کی طرح ایک وحشتناک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا! اور میں نے انکو پاگلوں کی طرح جھنجوڑ دیا "انجم انجم"۔

انہوں نے آنکھیں کھول دیں چونک کر نہیں بلکہ سہم کر!

"پرویز"

"یہ آپ کیا کر رہی تھیں"۔ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں"۔ انہوں نے گردوپیش پر اپنی ویران نگاہیں دوڑا کر کہا۔

"کب سے یہاں لیٹی ہیں؟"

"کب سے؟ دس بجے تک تو مجھے یاد ہے کہ میں بیٹھی ہوئی تھی؟"

"تو آپ رات بھر یہاں رہی ہیں؟"

"ہاں"

"اس شدید ٹھنڈ میں!؟"

"نہیں زیادہ ٹھنڈ تو نہ تھی۔"

"واہ رات کو قیامت کی سردی تھی جب ہم اسٹیشن سے لوٹ رہے تھے تو دانت سے دانت بج رہا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان گئے؟"

میں اس کا جواب نہ دے سکا

"تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

میں اب بھی خاموش رہا

"اچھا یہ تو بتا دو انہوں نے میرے لئے کوئی بات بھی نہیں کہلوائی؟"

میں نے بیتاب ہو کر اُن سے کہا۔ "انجم میں آپ سے یہاں بات نہ کرونگا خدا کے لئے اندر چلئے آپ کو احساس نہیں آپ کا کیا حال ہے؟"

"چلو" وہ چلنے لگیں مگر لڑکھڑا گئیں۔

"ٹھہرئے" میں نے ان کے بازو کو سہارا دیا ان کے چہرے پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کپڑے تو اس قدر تر تھے کہ نچوڑے جا سکتے تھے۔

میں نے اُن کو پکڑ کر انکے کمرے تک پہنچا دیا اور واپس آتے ہوئے کہا کہ "میں اسکول سے واپسی پر آپ کے پاس آؤنگا۔ آپ جا کر آگ کے پاس بیٹھئے اگر خدا نہ کرے سردی لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔"

اسکول گیا مگر مطلق کام نہ ہو سکا ایسا اضمحلال تھا کہ جس کو بیان ہی نہیں کر سکتا .... واپس لوٹا تو سیدھا ان کے یہاں گیا اور یہ آہستے

میں ہی حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا وکیل صاحب بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں ساتھ تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا

"انجم کی طبیعت خراب ہے!"

میں سمجھ گیا کہ یہ رات کی سردی کا نتیجہ ہے کمرے میں جا کر دیکھا تو بخار کی تیزی سے بیہوش تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گھر آ کر اماں کو بتایا اور بستر پہ گر پڑا

"خدایا اب کیا ہو گا؟"

پھر تھوڑی دیر بعد گیا وہی کیفیت تھی دیکھتا رہا اور پھر لوٹ آیا۔ صبح کو اسکول سے پہلے گیا پتہ چلا رات بھر طبیعت سخت خراب رہی ہے اور اب بھی بیہوش ہیں............

اسکول جانے کی ہمت نہ تھی مگر کہیں سکون بھی نہ ملنا تھا لاچار چلا گیا۔ اور پورے وقت کلاس میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شام کو دھڑکتے دل سے جا کر دیکھا .... سارے گھر میں مردنی چھا رہی تھی۔ برآمدے میں ڈاکٹر اور وکیل صاحب باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا "نمونیہ ہو گیا ہے دونوں پھیپھڑوں پہ اثر ہے .... پوری احتیاط کیجیے آگے خدا مالک ہے۔"

میں وہیں سے بھاگ آیا اور باغ میں ایک تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور دل کو کوئی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا

"اللہ کرے انجم اچھی ہو جائیں اور انکے بدلے مجھے موت آ جائے۔"

رات کو گیا دیر تک پلنگ کے پاس کھڑا رہا اُن کی طبیعت بدستور خراب تھی اور بیہوش تھیں.......... میں نے واپس آ کر ساری رات کرسی پر بیٹھے گزار دی ...... اللہ تڑپ تڑپ کر رو رو اور رو دن!

ڈاکٹروں نے انجکشن دے دے کر ان کے دونوں بازو چھلنی کر دیئے تھے مگر ان کو احساس نہ تھا۔

بیماری کے چار جان لیوا دن گزرنے کے بعد پانچویں دن صبح کو پتہ چلا کہ اُن کی طبیعت بہتر ہے اور ہوش میں ہیں! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا امّاں اکثر وہیں رہتی تھیں اس وقت بھی موجود تھیں میں نے کمرے میں جا کر دیکھا تو انجم آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی تھیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں ایک مدھم سی مسکراہٹ انکے ہونٹوں میں پھیل گئی۔

وکیل صاحب کی بیوی بھی مطمئن تھیں انہوں نے امّاں سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"جاوید میاں کب لوٹیں گے؟"

امّاں نے کہا۔ "دو سال کی کہہ گیا ہے"!

"بہن تم نے ناحق جانے دیا ماشاءاللہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تو ہیں"۔

"آجکل کے زمانہ میں اماں باوا کی کون سنتا ہے جو جی میں آئے کرتے ہیں میں نے تو بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ آیا"۔

"پھر بھی آخر گئے کیوں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بہن آجکل کی لڑکیوں میں شرم کا تو نام نہیں دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے

.... جاوید چچا کی بیماری میں گئے تھے ان کی لڑکی بہت فیشن ایبل ہے۔ بی اے
پاس ہے اور وہ کہنے لگی کہ میں تو اس سے شادی کروں گی جس کے پاس ولایت کی
ڈگری ہوگی اس جاوید کو چڑھ گئی کہ ولایت جاؤں گا... ..... پھر کس کے کہنے سے
رکتا تھا۔

"تو چچا کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"اور کیا یہی تو بات ہے"

وکیل صاحب کی بیوی اور اماں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور میرا دم رُکا جا رہا تھا۔ مجھے
خود کو بھی علم نہ تھا کہ بھائی جان کس وجہ سے دفعتاً ولایت جانے کو تیار ہو گئے ہیں!
اب پتہ چلا کہ چچا کی لڑکی نے یہ فرمائش کی تھی! کاش اماں نے یہ سب انجم کے سامنے نہ
کہا ہوتا میں نے انجم کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں!

وکیل صاحب نے آکر کہا کہ ڈاکٹر نے مریض کے کمرے میں زیادہ بیٹھنے کو منع کر دیا
ہے ہم واپس آگئے!

اماں کی گفتگو نے مجھے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج اُن کی طبیعت
سنبھلی تو یہ خبر سنی اب اللہ جانے اس کا کیا اثر لیں گی۔

شام کو گھر سے نکل ہی رہا تھا جو اُن کا نوکر بھاگتا ہوا آیا میں نے گھبرا کر پوچھا کیا
بات ہے؟!

"بیگم صاحبہ کو جلدی بھیجیے انجم بی بی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔"

میں اس کی بات ختم ہونے سے پہلے بھاگا اور سیدھا ان کے کمرے میں گیا......
یا اللہ کیا عجب عالم تھا تین چار ڈاکٹر پلنگ کے پاس جمع تھے اور بار بار انجکشن

دے رہے تھے! انجم بالکل غافل تھیں اور زور زور سے سانس آ رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ باہر برآمدے میں بھی اس کی صاف آواز سُنائی دے۔

وکیل صاحب نے روتے ہوئے کہا "اب کیا ہوگا؟"

ڈاکٹر نے مایوس لہجے میں جواب دیا "خدا بہتر جانتا ہے دعا کیجئے۔"

میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور بے خبری میں بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ کر اسی سنگ مرمر کے چبوترہ پر گر پڑا جس پر انجم نے ایک رات گزاری تھی! دماغ خیال تھا نہ دل کو صدمے کا احساس! میں پھوٹ پھوٹ کر روتا گیا یہاں تک کہ سر چکرانے لگا۔ ہاتھ پیر ڈھیلے ہوتے گئے......... اور میں بیہوش ہو گیا۔

پھر ہوش آیا رات کا وقت تھا اندھیرا جس میں پھیکی چاندنی کا بس نہ چل رہا تھا......... وہاں اب کچھ باقی بھی ہوگا۔ یا سب کچھ ختم ہو چکا؟ میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ جہاں گہری خاموشی طاری تھی......... یا اللہ اب کیا سنوں گا! میں نے ستون کا سہارا لیتے ہوئے سوچا......... برابر سے ایک نوکر گزرا میں نے بمشکل کہا۔

"انجم"

اس نے کہا "اچھی ہیں"

"اچھی ہیں!" میں پھر بھاگا اور کمرے کے پاس جا کر رک گیا انجم کی والدہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

"انجم کیسی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"میں جا کر دیکھ لوں؟"

"ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ بات چیت نہ کریں۔"

"میں بات نہ کروں گا۔"

"اچھا تو جا کر دیکھ لو۔"

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا وہ آنکھیں کھولے ہوئے دروازے کی طرف رخ کئے لیٹی تھیں۔ مجھے دیکھ لیا۔

"کیا حال چال ہے؟" بہت نحیف آواز سنائی دی۔

میں بے قرار ہو کر پلنگ کے پاس دو زانو ہو گیا۔

"آپ اچھی ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔"

"آنکھیں سوج رہی ہیں! کیا روئے تھے؟"

میں نے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور کوشش کے باوجود آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے ا مسرت کے احساس نے مجھے بیخود کر دیا اور اپنے حواس سنبھالنے کو میں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تکنے لگا۔ جہاں آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمکتا ہوا بڑا سا تارہ ٹوٹا اور اندھیرے میں ڈوب گیا میں نے مڑ کر انجم کی طرف دیکھا تو وہ بھی آسمان کو تک رہی تھیں۔

"یہ تارے کیوں ٹوٹا کرتے ہیں؟" میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔"

میں نے کہا "واہ یہ آپ نے نرالی منطق نکالی"۔

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں"۔

"اچھا خیر ہوگا" میں نے چاہا کہ کسی طرح بات کو ٹال دوں۔

"پرویز تم کو میرا نام تو معلوم ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں"۔ میں اس سوال پر حیران ہو گیا۔

"جانتے ہو انجم کسے کہتے ہیں؟"

میں بات کا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے نہیں معلوم"۔

"ستارے کو کہتے ہیں"۔

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں انکی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"پرویز تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کروں گا"

"معاف کیجئے....... چلتا ہوں"۔ میں انجم کو خدا حافظ کہہ کر اطمینان اور خوشی کے سانس لیتے ہوئے گھر لوٹا۔ اب انکی طبیعت بہتر ہے خدا نے چاہا تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

کئی دن بعد رات کو نیند آئی اور میں بے سدھ ہو کر سو گیا!

صبح کو آنکھ کھلی کمرے سے باہر نکلا تو اماں موجود نہ تھیں۔ میں نے نوکر سے پوچھا

"اماں کہاں ہیں؟"

"وکیل صاحب کے یہاں"

میرا جی دھک سے ہو گیا......... پھر سے طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔

ننگے پاؤں نکل کر دوڑا۔

بہت لوگ جمع تھے میں دیوانوں کی طرح سب کے بیچ میں سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوا رونے کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں .... اور جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو میری نگاہیں انجم کے پلنگ سے ٹکرائیں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ نہ ہنستے ہوئے لب .... صرف ایک سفید چادر .... جس نے ان کا آخری پیغام مجھ تک پہنچا دیا .... "تارہ ٹوٹ چکا تھا"

حمیدہ سلطانہ

ادبی ذوق مجھے ننھیال سے ترکے میں ملا ہے، میری والدہ رقیہ سلطانہ بنت نواب [illegible]خاں نواب زین العابدین خاں عارف، کی پوتی ہیں، ان عارف کی جن کا مرثیہ غالب نے لکھا اپنی ادب نوازی اور ادب دانی کے لئے میرا ننھیال دہلی کا مشہور ترین خاندان ہے۔

ابا جان مرحوم لفٹننٹ کرنل زا النور علی احمد گوہاٹی (آسام) کے باشندے تھے لیکن اُردو فارسی کے شیدا تھے اور اُردو سے اس دلی لگاؤ کا نتیجہ اُن کی اور والدہ کی شادی تھی مجھے ابا جان نے فارسی کی تعلیم بطور خاص دلوائی۔

میرا لڑکپن بہت الّلوں تلّلوں میں گذرا۔ اس لئے میں بلا کی شریر اور ضدی تھی۔ دہلی کے اور مسلمان معزز گھرانوں کی طرح ہمارے ہاں بھی لڑکیوں کو اسکول بھیجنے سے بزرگوں کو اپنی ناک خطرے میں نظر آتی تھی، اس لئے میں نے بھی اسکول میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی اور اس بے قاعدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود متبحر فارسی بزرگ عالم سے فارسی کی تعلیم حاصل کرنے اور یورپین گورنس کے ہر وقت ساتھ رہنے کے نہ فارسی ہی پوری آسکی نہ انگریزی ہی۔ ہاں ٹانگ ان دونوں زبانوں کی توڑ لیتی ہوں۔

ادھوری تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرھواں سال ختم ہونے سے پہلے ہی مجھ پر شعر کہنے اور الٹی سیدھی کہانیاں لکھنے کا بھوت سوار ہو گیا۔

اگر میں نے کوئی کالج کی اعلیٰ سی ڈگری لی ہوتی تو آج شان سے لکھتی، بی۔اے ہوں، ایم۔اے ہوں اور یہ لکھ کر خود میں محسوس ہوتا اب تو اپنا کچا چٹھا لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔

حمیدہ سلطان

ناگن

ماہ جولائی کا روشن اور چمکیلا چاند پوری آب و تاب سے آسمان پر جلوہ گر تھا
ہمارے کلب کی طرف سے ممبروں کو جمنا کے کنارے پکنک پارٹی دی گئی تھی۔
ہوا کے جھونکے جوہی کے پھولوں اور لیموں کی تیز خوشبو کے ساتھ ساتھ بھیگی بھیگی گھاس
بھینی باس لا رہے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی چاندنی اور سامنے لہریں لیتی ہوئی
ماحول کو بے حد دلکش بنا دیا تھا پھر اس حسین منظر کو سپید جھلملاتے ہوئے لباسوں
الی ماہ وش خواتین کی موجودگی سے اور بھی چار چاند لگ گئے تھے۔ جنت ارضی کی یہ
دریں اس وقت دنیائے آب و گل کی رہنے والی معمولی عورتیں نہیں بلکہ آسمانی مخلوق
علوم ہو رہی تھیں۔ میں دلآویز موسم کی رنگینیوں میں غرق اور ماحول کی دلکشی میں کھوئی
ئی بیٹھی تھی ہر طرف دلبستگی کا سامان مہیا تھا۔ مجمع چونکہ مخلوط اور کافی بڑا تھا اس
لئے اپنے اپنے مذاق کی ٹولیاں الگ الگ بن گئی تھیں۔

کسی جانب کوئی کافرادا حسینہ ستار پر ملہار کی دھن سنا رہی تھی اور کہیں کوئی پریت کا مارا برہا کے گیت گا کر من کی آگ کو راگ کے پردے سے ہوا دے رہا تھا ایک جانب تاش پارٹی جمی ہوئی تھی تو دوسری طرف بحث کے شوقین نوجوان کمیونزم، فاشیزم، سیاسیات، ترقی پسند ادب، غرضیکہ دنیا بھر کے موضوعات پر مغز زنی کر رہے تھے۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا اور ہر ایک اپنی دھن میں مست، یہاں جو قلب تھا وہ مطمئن تھا۔ اور جو فرد تھا وہ مسرور۔ اس مسکراہٹوں اور قہقہوں کی دنیا کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ اسی ملک میں مفلس کنگال [illegible] مارے بھی رہتے ہیں خواتین کی لوچدار اور سریلی ہنسی کے زمزموں کے ساتھ ملے جلے گونجتے ہوئے مردانہ قہقہے ماحول کے سکوت کو توڑ رہے تھے۔ لیکن ہمارے کلب کا دلچسپ ممبر اور نوجوان شاعر جمال جس کو "ترقی پسند مصنفین" کے حلقے میں امتیازی درجہ حاصل تھا، آج خلافِ معمول نظر نہ آتا تھا نہ وہ نوعمر مصنف پرویز تھا اور نہ وہ گھونگر یالے بالوں والا ادیب فرخ! جس کو ہندوستان سے زیادہ روس سے شغف تھا۔ اور جو اپنی گفتگو کا آغاز ہی "کامریڈ اسٹالین" سے کرتا تھا۔ اور "ہمارا لینن"، "نیشنلزم" اور یہ اور وہ۔

میں نے مسز خان سے جو میرے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ کہا "یہ دلکش موسم اور یہ رنگین فضا! آج جمال کا عیاں نہ ہونا سب کو محسوس ہو رہا ہو گا تعجب ہے وہ تو ایسے موقعوں پر کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا۔ اُسکے مدھر گیتوں سے کائنات کی رنگینیاں دوچند ہو جاتی ہیں۔ پرویز اور فرخ بھی نظر نہیں آتے کلب کے تینوں خاص ممبر غائب یہ حادثہ ناقابلِ برداشت ہے"۔

"آپ ذرا دیر سے آئی ہیں یہ سب مس نوشابہ کے ہمراہ کشتی کی سیر کے لئے گئے ہوئے ہیں اس ناگن کا زہر ان پر اثر کر چکا ہے۔" انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"یہ نوشابہ کون صاحبہ ہیں؟" میں نے جلدی سے سوال کیا۔

"ارے ہاں آپ تو ایک ماہ بعد آئی ہیں شملے گئی ہوئی تھیں اس نئے اس سانحے کی آپ کو خبر نہیں نوشابہ ہمارے کلب کی نئی ممبر ہے۔ اُسکے والد ایرانی نژاد اور موتیوں کے مشہور تاجر ہیں۔ نوشابہ ایرانی حسن کا مکمل نمونہ ہے۔ شاعرہ بھی ہے جب سے وہ اس کلب کی ممبر ہوئی ہے کلب کے تمام نوجوان ممبر دیوانے ہو رہے ہیں ہر وقت اسکے گرد اس طرح منڈلاتے ہیں۔ جیسے شمع پر پروانے۔" مسز خاں نے لمبی سانس لے کر کہا۔

"لیکن پرویز کی منگنی تو پروین سے ہو چکی ہے۔ پروین بھی دلکش صورت کی مالک ہے۔ بہت شیریں ادا بھولی سی لڑکی ہے اُس کی دلربا آواز پر تو فریفتہ ہو کر پرویز نے اُس کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"تو یہ کمبخت تو ناگن ہے ناگن، جس کو نظر بھر کر دیکھ لیتی ہے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اُسکے بس کا آنا ہی نہیں دیکھو نہ پروین کو وہ بیچاری تو ادھر چنبیلی کے کنج میں افسردہ و حیران بیٹھی ہے اور اسکے قریب وہ دُر دانہ ہے جس کے لئے نوشابہ کو دیکھنے سے قبل جمال دیوانہ ہو رہا تھا۔ لیکن اب تو اُس کے علاوہ جیسے مرد دوسری عورتوں کو بھول ہی گئے ہیں۔ جدھر جاؤ جس سے سنو ہر جانب اُس کا تذکرہ ہے کمواسے تو خیر بیوی والوں کی نیت بھی اس چھوکری نے ڈانواں ڈول کر دی ہے جمشید جیسا بڑے مرتبے کا آدمی اپنی عزت اور بیوی بچوں کا خیال چھوڑ کر اسکے

اردگرد بھی تار ہنا ہے۔" مسز خان آنکھیں نچا کر بولیں۔

یکایک مجمع میں ایک ہلچل سی مچ گئی سب لوگ اپنے مشاغل چھوڑ کر جمنا کی جانب دیکھنے لگے۔ ایک خوبصورت کشتی آہستہ آہستہ کنارے کی جانب جا رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جمال کا دلربا ترنم میرے کانوں میں تیر گیا وہ اپنا کوئی سجیلا رسیلا گیت گا رہا تھا۔ میں وفورِ اشتیاق سے بیخود ہو کر نوشابہ کو دیکھنے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ کشتی اب بالکل قریب آ گئی تھی۔ سفید جارجٹ کی تاروں بھری ساڑھی میں لپٹی ہوئی نوشابہ عنفوانِ شباب کے کسی حسین خواب کی تعبیر معلوم ہو رہی تھی۔ ہوا سے جب ساڑھی میں جنبش ہوتی تو ستارے جگمگا کر اس دلربا اور سڈول جسم کی رعنائیوں کو دوبالا کر دیتے تھے۔ ایک ادائے ناز سے وہ فرخ کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جمال جھوم جھوم کر والہانہ انداز سے اپنا بہترین کلامِ حسن و جمال کی بارگاہِ ناز میں پیش کر رہا تھا۔ اور پرویز و ظفر ہاتھوں میں پتوار سنبھالے ہوئے کشتی کنارے کی جانب لا رہے تھے۔ کشتی کے کنارے لگتے ہی پہلے جمال اور پھر فرخ کودا۔ فرخ کا ہاتھ تھام کر نوشابہ دلربایانہ شان سے اتری۔

میرے قریب آ کر وہ ذرا ٹھٹھکی اور مسز خان نے جلدی سے میرا تعارف اس سے کرا دیا۔ " یہ ہیں۔ ہمارے کلب کی مخصوص ممبر اور مشہور افسانہ نگار خاتون"

اس نے بڑے دلکش انداز میں میری لکھی ہوئی کہانیوں پر تنقید کی اور میرے ادبی کاموں کی موزوں الفاظ میں داد دی اس کی وسعتِ مطالعہ پر میں حیران رہ گئی۔

قدرت نے بڑی فیاضی سے اس کو دلکش صورت و سیرت عطا کی تھی۔

اب ہم سب کھانے کی میزوں کے گرد آ گئے تھے۔ نوشابہ واقعی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی چلتی تھی۔ اور اس کے انداز رفتار میں شاہانہ استغنا تھا۔ اس سے کھیلا یا

تکلم اور دلکش اداؤں نے مجھے جلد ہی موہ لیا۔ مجلسی زندگی کے آداب سے وہ بخوبی واقف تھی۔ میں نے اکثر اُس کو بیک وقت کئی لوگوں سے اُن کے محبوب موضوع پر گفتگو کرتے دیکھا اور پوری دلچسپی کے ساتھ۔ اُس کی دلکش ہنسی اور نیلے سمندر کے مانند عمیق آنکھوں کی سحر کارانہ جنبش دلوں کو جیت لینے میں کمال رکھتی تھی۔ جب وہ اپنے اشعار سناتی تو ہر دل کا ساز اُسکی دلآویز ترنم ریزی پر بجنے لگتا اور کائنات اس ماہ وش کی زمزمہ سرائی پر مدہوش ہو کر رہ جاتی۔

اُس سے ہر ہفتے کی شام کو کلب میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ روز بروز اُس کے چاہنے والوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ لیکن وہ سب سے بخندہ پیشانی ملتی کسی کو مایوس نہ کرتی۔ ہر ایک کے ساتھ اُس کا برتاؤ مخلصانہ تھا۔

بار ہا میں نے دیکھا ابھی وہ جمالی کی نظموں پر جھوم رہی ہے۔ وہ اٹھ کر گیا۔ اور وہ پرویز کی بنائی ہوئی تصاویر کے دیکھنے میں محو ہو گئی۔ ظفر کی درخواست پر اسکے ہمراہ ٹینس کھیلنے چل دی۔ لیکن جیسے ہی اُس کو فرخ کی صورت نظر آئی کھیل چھوڑ چھاڑ اُس سے نئی کہانی سنانے کی فرمائش کر دی باپ نے گھر چلنے کے لئے کہا تو مطمئن انداز سے کہہ دیا۔ "آپ جائیے پاپا میں جمشید صاحب کے ساتھ ابھی ذرا برج کھیلوں گی۔ وہی مجھے گھر چھوڑ دینگے۔"

گویا وہ آزمودہ کار بلی تھی اور یہ سب سادہ لوح چوہے جن سے وہ کھیلتی رہتی تھی۔ اُس کی دلربا صورت پسندیدہ صفات اور دلکش شاعری نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ لیکن ان لاابالی حرکتوں کے باعث میری نظر میں اسکی وقعت کم ہو گئی۔ حیرت ہوتی تھی کہ اتنے سلجھے ہوئے مذاق اور لطیف ذہانت کی مالک اور یہ بیگ

حرکات ! سچ تو کہتی تھیں مسز خان۔

ایک شام اندر کے شور سے گھبرا کر غروب آفتاب کے وقت میں باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا زرد گلاب کی جھاڑیوں کے قریب نوشابہ کھڑی ہے۔ اور اس کے قدموں کے قریب دو زانو پرویز بیٹھا ہے۔ میری جانب ان دونوں کی پشت تھی۔ یہ کیا سین ہو رہا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے میں مہندی کے پودوں کی آڑ میں ٹھٹھک گئی۔

"کہئے آپ مجھ سے تنہائی میں کیوں ملنا چاہتے تھے" نوشابہ کی شیریں آواز میرے کانوں میں آئی۔

"آہ میں کیا سمجھاؤں۔ کیا واقعی آپ نے میری پریشانی اور وارفتگی کا اندازہ ابھی تک نہیں کیا؟" پرویز نے اور بھی سرنگوں ہو کر بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"میں کس طرح کسی کے دل کا حال بغیر بتائے ہوئے سمجھ سکتی ہوں پرویز" نوشابہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا میں یہ درخواست کر سکتا ہوں۔ کہ آپ اپنی معیت کا مجھے موقعہ دیں جب آپ جیسی ذہانت کی مالک میری رفیقۂ حیات ہو گی تو میں یقیناً لافانی شہرت حاصل کر لوں گا۔ میرا فن آپ کے حسین تخیل کا سہارا پا کر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا" پرویز نے عاشقانہ انداز سے اُس کے قدموں پر تقریباً جھک کر کہا۔

"اوہ یہ بات ہے۔ جس کے لئے آپ اتنی دیر سے تمہید باندھ رہے تھے مگر آپ کی منسوبہ تو پروین ہے وہ تو مجھ سے زیادہ حسین ہے اور پھر آپ کے خاندان کی لڑکی ہے تعلیم یافتہ اور شائستہ بھی"۔ وہ جلدی سے بولی۔

"بے شک پروین میری منسوبہ ہے وہ حسین بھی ہے اور آپ کی ملاقات سے قبل اس کی حسین صورت میرے دل میں نقش تھی لیکن آپ کو دیکھنے کے بعد میں اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اب اس میں پروین نہیں آپ جلوہ گر ہیں آہ میں اس الھڑ دل کو کیسے سمجھاؤں"۔ پرویز نے پُر شوق نظر نوشابہ پر ڈال کر کہا۔

"لیکن آپ کی محبت تو موسموں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے مجھے اس کا اعتبار کیسے ہو آج میرے لئے آپ پروین کو بھول گئے، کل کسی اور کے لئے مجھے فراموش کر دینگے" نوشابہ نے مسکراتے ہوئے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ آپ کو کون بھول سکتا ہے آپ کی دلکش ادائیں، آپ کا دلربا حسن، آپ کی سی ذہانت آپ کا سا بلند ادبی ذوق کسی اور عورت کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور اس اعلٰے ترین نسائیت کے سامنے جو سر نہ جھکا دے وہ کافر ہی ہوگا" پرویز کی بھرائی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔

"مگر آپ صرف میرے دوست رہیئے۔ اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے نہ رکھئے میں مردوں کی جانب سے کچھ خوش گمان نہیں ہوں۔ مجھے آپ کی صنف سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ پروین جیسی بھولی خوبصورت گڑیا آپ کے لئے موزوں ہے۔ میں اتنی بیوقوف نہیں کہ محبت کے جال میں پھنس کر اپنی انفرادیت کا خاتمہ کر دوں۔ تم مرد ہم عورتوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے ہو بھولی بھالی اور معصوم لڑکیوں کے کانوں میں محبت کا منتر پھونکتے ہو اپنی ہوس کار فطرت پر عشق کی پاکیزگی کا ملمع چڑھا کر اپنی جھوٹی ریاکار محبت کا ڈھول پیٹتے ہو اور خوب ڈھونگ رچاتے ہو جب لڑکیاں سچا پرستار سمجھ کر تمہاری جانب متوجہ ہوتی ہیں تو تم ان سنہری

چڑیوں کو دامِ محبت میں پھانس کر دوسری جانب متوجہ ہو جاتے ہو۔" اُس نے تیز لہجے میں کہا۔

پرویز سرنگوں کھڑا رہا۔ چند منٹ بعد حسبِ معمول شیریں لہجے میں بولی۔" پرویز! میرے عزیز دوست، پروین بہت اچھی لڑکی ہے مجھے اُس سے محبت ہے تم اُس سے ضرور اور جلدی شادی کر لو میں اسی محبت کا جو تم کو مجھ سے ہے ہمیشہ لحاظ رکھونگی لیکن اس سے زیادہ میں تمہارے لئے کچھ نہ کرسکوں گی۔ مجھے تم کبھی نہ پاسکو گے اس فضول خیال کو دل سے نکال دو۔ اور اپنی زندگی خوشگوار بناؤ، پروین جیسی لڑکی سے شادی کر کے ازدواجی زندگی کی مسرتوں میں غرق ہو کر یقیناً تم کو سکون حاصل ہو جائے گا۔"

پرویز تعظیماً اس کے سامنے جھکا اور آہستہ قدم اٹھاتا ہوا منفعل انداز میں چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد نوشابہ کا ایک ہلکا سا طنزیہ قہقہہ سُنائی دیا۔
"اُف یہ بیوقوف مرد! کتنے جذباتی ہوتے ہیں۔ جہاں کسی لڑکی نے ذرا مہربانی کا برتاؤ کیا اور یہ سمجھے کہ بس ہم پر عاشق ہوگئی اور پھر عورتوں کو ناقص العقل کہتے ہیں بڑے عقلمند بن کر" اُس نے ناز سے انگڑائی لے کر کہا اور خراماں خراماں چل دی۔

اس واقعہ کے دو مہینہ بعد پرویز نے پروین سے شادی کر لی پہلے کی طرح اب وہ پھر پروین کا عاشق زار بن گیا۔ نوشابہ سے حتی الامکان اب دُور دُور رہتا تھا لیکن نوشابہ کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُس کی شگفتہ روی، اُسکے دلربایانہ انداز جنوں کے فنوں تھے۔ کچھ روز بعد میں نے سُنا کہ نوشابہ جمال سے صرف اس

لئے برہم ہے کہ وہ اس کی اور اپنی محبت کے جھوٹے افسانے اپنے دوستوں کو سناتا رہتا ہے۔ نوشابہ اُس سے ان دنوں اتنی سخت ناراض تھی کہ بات کرنا تو درکنار جمال کی طرف رُخ بھی نہ کرتی تھی۔ اُس کی برہمی کے چند مہینے بعد ہی جمال صاحب پھر دُردانہ کی جانب متوجہ ہو گئے اور آخر موسم بہار کے رُومان آفریں دنوں میں دُردانہ جمال کی رفیقۂ حیات بن گئی اس شادی میں نوشابہ اس طرح مسرور اور شاداں پیاری اداؤں کا قافلہ سا ساتھ لئے ہوئے زرکار اور جھلملاتے ہوئے لباس میں ملبوس پھر رہی تھی گ[illegible] قدرت نے اُسے اچانک کوئی خوشی کا خزانہ عطا کر دیا ہو۔ اور شادی کے ل[illegible] اس کی شاعری پر وہ والہانہ انداز سے پھر جھومنے لگی

اب کلب میں نوشابہ اور فرخ کی محبت کا افسانہ ہر کہہ و مہ ک[illegible] تھا۔ جہاں یہ دونوں ساتھ نظر آتے۔ اور سرگوشیاں شروع ہو گئیں [illegible] جانب نظریں لگ گئیں۔ یہ خیال ہر ایک دل میں جاگزیں ہو چکا [illegible] نوشابہ نے فرخ کی وجہ سے پرویز اور جمال کو ٹھکرا دیا۔ فرخ کی دلکش [illegible] کھوئے ہوئے انداز، دلچسپ گفتگو گھونگریلے بالوں اور چمپئی رنگ [illegible] مغرور حسینہ کو موہ لیا ہے لیکن ایک دم جب فرخ امریکہ چلا گیا [illegible] سے ڈیڑھ سال بعد واپس آیا تو اکیلا نہ تھا۔ ایک امریکن مہ جمال اُس [illegible] حیات بن چکی تھی تو سب مایوس ہو کر رہ گئے۔

اب نوشابہ ظفر کی جانب متو[illegible] پیشگوئیاں میں سنتی رہتی تھی۔ حالانکہ ظفر میں سوائے اچھا کھلاڑی [illegible] ے اور کوئی خوبی نہ تھی۔ ایک بیڈول سا لمبا تڑنگا سیدھی سادی [illegible] خالی الذہن لڑکا تھا۔ نوشابہ سے

عمر میں بھی دو سال چھوٹا اُس کے سامنے گھنٹوں بے تکی ہانک لگایا کرتا تھا اور
وہ پوری دلچسپی سے اسکی باتیں سُنا کرتی۔ ایک شام خلاف معمول وہ صوفے پر
نیم دراز تھی۔ اداسی اُسکے چہرے پر تکان ظاہر تھی اُسکے مقابل بیٹھا ہوا ظفر برابر بول
رہا تھا۔ میرے پہنچ جانے سے وہ میری جانب متوجہ ہوگئی اور ظفر اُٹھ کر چلا گیا۔
[illegible]ں نے محسوس کیا اس وقت وہ کچھ چڑچڑی سی ہو رہی ہے" اس تکدر کا سبب کیا
[illegible] میں نے اطلاقاً اُسکو اکر دریافت کیا۔
[illegible]سنے اس بیوقوف لڑکے کی احمقانہ گفتگو نہیں سنی؟ مسلسل آدھ گھنٹے
[illegible]ل بکواس سن رہی تھی اور یہ ذہنی کوفت برداشت کر رہی تھی۔ لوگ
اس [illegible] سکتے ہیں میرے معبود! اور بغیر کسی خاص موضوع کے بعض اوقات
جی چاہتا [illegible] مغز چاٹنے والے کیڑے کو اپنے قریب آنے سے روک
دوں، لیکن [illegible] خوش خلقی مجھے ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔" اُس نے
اداس ادا سے [illegible]

[illegible] ہو مگر عام طور پر [illegible] چاہیے۔ کہ آپ ظفر کو بے حد پسند کرتی ہیں بلکہ
شریک حیات بنانا چاہتی [illegible] نے جلدی سے سوال کیا۔
"چرچے کا ذکر چھوڑ [illegible]گ تو کسی دوشیزہ کو آزاد خود مختار اور
سکون کی زندگی گذارتے [illegible] سے نہیں دیکھ سکتے میں ان چہ میگوئیوں
سے بے خبر نہیں جو میرے متعلق آ[illegible] میں ہوتی رہتی ہیں سنتی ہوں اور
مسکرا کے رہ جاتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی ز[illegible] ہے اس لئے کسی اور کی پروا
نہیں کرتی، ظفر جیسے کمزور، بیوقوف اور چھچھ[illegible]کے سے میں شادی کرونگی

جس کو نشست و برخاست کے آداب بھی نہیں معلوم" اُس نے ہنس کر لاپروائی
سے کہا۔ اور پھر وہ جمشید صاحب کی جانب متوجہ ہو گئی جو ابھی آئے تھے۔

یہ بڑی جائیداد کے مالک اور ایک مشہور فلم کمپنی کے ڈائرکٹر تھے۔ نوشا[illegible]
اکثر گیت انہوں نے اپنی فلموں کے لئے گراں قدر معاوضے پر حاصل ک[illegible]
خوبصورت، خاندانی بیوی کے شوہر اور تین بچوں کے باپ ہوتے [illegible] شابہ
پر جان و دل سے فدا تھے۔ اکثر قیمتی تحائف اس کو دیتے رہتے [illegible] وہ جاتی
اُس کے ساتھ اُن کی نظریں پھرتی تھیں۔ میں بھی اس متمول [illegible] سے جو جاہ وحشم
کے علاوہ صورت کے لحاظ سے بھی اگر خوبصورت نہیں ت[illegible] ہے نوشابہ کے
دل کو جیت لیا ہے وہ اکثر اُنکی عالیشان پیکارڈ میں [illegible] کلب جایا کرتی تھی
اور گاہ بگاہ سینما بھی چلی جاتی اپنے ملنے والوں [illegible] سب سے زیادہ جمشید صاحب
سے ہی بے تکلف تھی۔ اور اُن کی خوش قسمتی س[illegible] قابلِ رشک تھی۔

میرا گھر کلب کے تھوڑے فاصلے [illegible] لئے گرمی میں اکثر میں ٹہلتی
ہوئی کلب سے واپس آجاتی تھی ایک [illegible] ب سے واپسی پر میں نے جمشید صاحب
کی گاڑی دیکھی اور اس سے کچھ فا[illegible] میں وہ خود نوشابہ کے ساتھ کھڑے
نظر آئے، میں ان دونوں کی گ[illegible] کے اشتیاق میں گاڑی کی اوٹ لے کر
کھڑی ہو گئی۔

جمشید کی بھاری [illegible] کان میں آئی "میں سمجھتا ہوں تمہارا یہ انکار الھڑ
پنے کی ضد یا دوشیزگی کی شرم کے علاوہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم میری ہو اور
میری بن کر رہو گی"۔ اپنا فقرہ پورا کرتے ہی انہوں نے نوشابہ کے نازک جسم کے

گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا حلقہ کر لیا۔ مگر نوشابہ تڑپ کر اس طرح علیحدہ ہو گئی
جیسے کسی ناپاک چیز نے اُسے چھو لیا ہو

اُس نے بپھرے ہوئے لہجہ میں کہا "ہوش میں رہیئے جمشید صاحب، میں [illegible]نا بھائی سمجھتی ہوں۔ آپ مجھے عزیز ہیں لیکن بھائی کی طرح، آپ کو یہ [illegible]ئی کہ ناجائز طور پر مجھے اپنانا چاہیں۔ شادی شدہ اور سوسائٹی کا کا ذمہ[illegible]کہ میں نے آپ پر اتنا اعتماد کیا تو اس کا مطلب آپ بالکل غلط سمجھے مجھ جیسی [illegible]ر عورت ایک ایسے مرد کی بیوی بننا ہرگز پسند نہ کرے گی۔ جو ایک خوبصورت باد[illegible]ہر ہو کیا میں اپنی ایک بہن کے محبت بھرے دل کو توڑنا چاہوں گی کیا آپ نے اپنی [illegible] جذبات کا بندہ اور ہوس کار سمجھا ہے؟ پردہ نہ ہونے کے معنی یہ تو نہیں کہ [illegible]بھی میری فطرت سے زائل ہو گیا۔——

—— میری معصوم فطرت [illegible] آزادہ روی کو کسی بدکار مرد کی ہوس آلودہ نظریں انشاءاللہ کبھی داغدا[illegible] گی۔ میری پاکیزگی ہمیشہ برقرار رہے گی۔

—— آپ جائیے اور کسی بیوقوف [illegible]پرست لڑکی سے یہ عشق و محبت کا ڈرامہ کھیلئے آپ کے فلموں میں کام کرنے [illegible]ت اور آزاد طبع لڑکیاں موجود ہیں وہ آپ کے ایک اشارے پر سر تسلیم خم [illegible]پھر اُن کو چھوڑ کر مجھ غریب پر یہ محبت کا ہتھیار آپ نے کیوں آزمایا؟ می[illegible]ل اور خوش طبعی کے سمجھنے میں آپ کو بہت مغالطہ ہوا میں اپنے پہلو میں حساس دل رکھتی ہ[illegible]سم میں ایک منزہ روح جیسے دل و دماغ پر آپ کی ہوس کار محبت کا ہلکا سا نقش بھی نہ[illegible]س لئے میں آپ کے بے حیا اقدامات کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کبھی نہ کر سکوں گی۔

اور نہ آپ کی اس بے پناہ محبت کی کوئی قدر میرے دِل میں ہے۔ میرے سامنے سے آپ دُور ہو جائیے۔"

قوی اور طاقتور رعونت پسند مگر شکست خوردہ جمشید بھیگی بلی بنا سر جھکائے نادم اور پشیمان گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا، یہ نازک اندام حسینہ اب تنہا کھڑی تھی اُسکے پھول سے رُخسار شرم اور غصے کی ملی جلی کیفیات کے باعث سُرخ ہو رہے تھے۔

"آہ کوئی نہیں میرے خیالوں کا دیوتا میرے من مندر کا موہن جو میرے تصور میں رہتا ہے پاکیزہ بلند اور لطیف خیالات کا مالک۔ اسے کاش وہ مجھ کو نظر آجائے"

اُس نے لانبا سانس لے کر کہا اور پھر وہ ساڑھی کا آنچل درست کر کے آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی چل دی۔

اُف میرے خدا! اس عجیب و غریب ذہنیت کی مالک اور پُراسرار خیالات رکھنے والی لڑکی کا محبوب کون ہے؟ کون ہوگا؟ بڑا خوش نصیب ہے وہ!

ناگن! لیکن اس ناگن کو تو ہزاروں ناگ ڈسنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ابھی تک کسی ناگ کا زہر اس پر کارگر نہیں ہوا۔ ناگن! ٹھیک ہی تو ہے!

نام۔ ۔ خدیجہ مستور
پیدائش ۔ دسمبر ۱۹۲۷ء
مقام پیدائش۔ لکھنو۔

ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوئی۔ پانچ سال کی عمر سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پڑھنے لکھنے سے نفرت تو نہ تھی۔ لیکن عام بچوں کی طرح کھیل کود میں پہلے حصہ لینا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ بچپن میں مجھے بیک وقت دو قسم کے پڑھانے والوں سے سابقہ رہا۔ ایک قسم مولوی صاحبان کی، جو ڈنڈے کے زور پر مذہبی تعلیم دیا کرتے، دوسری قسم ماسٹر صاحبان کی جو ایک ہی وقت میں اُردو، انگریزی سے لے کر تاریخ اور جغرافیہ تک پڑھوڈالنے کی کوشش فرماتے۔ بڑے ہی پیار سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحبان کے ڈنڈے کے خوف سے نو سال کی عمر میں قرآن پاک تو ضرور ختم کر لیا۔ لیکن باقی مذہبی مسئلے پھر پڑھا رکھے اور ماسٹر صاحبان سے کچھ زیادہ مستفید ہی نہ ہو سکی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ مجھ پر جو چند گنی چنی کتابوں کے پڑھنے کی پابندی لگائی گئی تھی، میں اسے کسی طرح گوارہ نہ کر سکتی تھی۔ گھر میں علم و ادب کا چرچا تھا اور کتابوں کی فراوانی، میں ہر وہ کتاب شوق سے پڑھتی جس کے لئے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ ماسٹر صاحب یا مولوی صاحب اسے پڑھائیں گے،

۱۹۳۶ء میں اسکول میں داخل ہوئی۔ انہیں دنوں اچانک محسوس ہوا کہ میں بھی وہ کچھ لکھ سکتی ہوں جو رسائل میں چھپ سکتا ہے۔ ایک دن کہیں اتنا کہ یہ بات

گھر میں بھی کہہ دی۔ بس ایسا مذاق اڑایا گیا کہ اس احساس کو انتقام کا جذبہ سلگنے
بجا گتنے ہی بن پڑی۔

۱۹۳۶ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی اقتصادی حالت آہستہ
آہستہ خراب ہونے لگی اور اس طرح میری باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن خاندان
کے اور تمام افراد کے مقابلے میں اپنی علمی کم مائگی کا احساس بھی فوراً ہی شروع ہو گیا
اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ جیسے بھی ہوا جہالت کے طعنوں سے بچنے کے لئے پڑھوں گی
اسکے بعد بس کتابوں ہی کو اپنی زندگی سمجھا۔ خاندان کے پڑھے لکھے افراد کی خوشامد کر کے
بدلے میں جھڑکیاں کھا کے اور کتابوں کا کیڑا بن کے بس پڑھتی ہی رہی۔ خیر خوش قسمتی
یا بد قسمتی سے کوئی تعلیمی سند نہ حاصل کر سکی۔ کیونکہ سند کو تعلیم حاصل کرنے کا مقصد سمجھنے
کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور نہ شاید کبھی آئندہ ہی یہ ضرورت پیش آئے۔

۱۹۴۲ء کے اوائل میں پہلا افسانہ لکھا اور خاندان کے بعض قدامت پرست
حضرات کی سخت مخالفت کے باوجود آج تک لکھ رہی ہوں —— لکھنا اور پڑھنا ——
ہی میرے محبوب مشاغل ہیں۔ لیکن مجھے اپنے ان محبوب مشاغل سے ایک زبردست
شکوہ ہے۔ کہ انھوں نے آج چھ سال سے میری آنکھوں پر عینک کا ناقابل برداشت
بوجھ ڈال رکھا ہے اور اس بوجھ میں ہر دوسرے تیسرے سال ڈاکٹروں کے مشورے
سے اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

خدیجہ مستورہ

خدیجہ مستور

ہُنھ

"ہائے —— رات دو بجے آئے تھے۔" —— رونق میاں کی بیوی نے ایک طویل
سرد آہ بھری اور پھر اپنی جٹھانی کی طرف دیکھنے لگی جو جلدی جلدی روٹی پکا رہی تھی۔ "یہ
رنڈیاں —— اللہ توبہ ہے بھابی، دس ہانڈیاں کھانے کی ان کو عادت ہوتی ہے حرام
زادیاں، کمائی کرنے سے ڈرتی بھی نہیں، مُنہ کالا ہوگا مرتے وقت۔" اس نے کروٹ
لے کر بھابی کو مخاطب کیا۔ وہ بھی اتنے زور سے کہ اسکے پچھواڑے رہنے والی رنڈیاں چھبیلی
اور بسم اللہ سُن لیں۔ بھابی نے کوئی جواب نہ دیا صرف مسکرا کر رہ گئی وہ اٹھی اور پورا
پلنگ دھوپ میں کھینچ کر پھر لیٹ گئی۔

رات رونق میاں دو بجے تک غائب رہے تھے اور غائب رہنے کی وجہ وہ خوب
جانتی تھی جب رات بھی وہ دیر سے گھر آتے ان سے تو کچھ کہنے سُننے کی ہمت نہ ہوتی،
بس سارا غصہ رنڈیوں کو بُرا بھلا کہہ کر اُتارتی۔ اپنے بچے کو بغیر کسی بات کے دھول دھو

پیٹ کر رکھ دیتی، کھانا کھاتی چپکے چپکے ٹسوے بہاتی، میاں سے منہ پھیر کر چلتی اور محلے ٹولے والیوں کو اپنی بپتا سناتی لیکن رولق میاں کو جب غائب ہونا ہوتا تو کوئی اُن کا دامن تھامنے والا نہ تھا۔ ان سے تو اُف کرتے بھی کانپتی۔ بس لے دے کے سارے غصہ کا نشانہ رنڈیاں ہی بنتیں۔ مگر واہ ری چنبیلی اور بسم اللہ۔ کیا مجال جو کبھی اپنے خلاف ہزاروں باتیں سننے کے بعد بھی آدھی بات پلٹ کر کہہ جائیں جیسے ان پر کچھ اثر ہی نہ ہوتا۔ شاید کانوں کی بہری تھیں وہ، یا پھر اپنی اوقات سمجھتے ہوئے شریف ادیوں کے منہ لگنے کی ہمت ہی نہ رکھتی تھیں۔

چھوٹا سا اجاڑ قصبہ۔ یہاں یہ نہ تھا کہ رنڈیاں شریفوں سے دور ـــــ بہت دور دکانیں سجا کر گناہ کا لین دین کریں بلکہ یہاں تو چنبیلی اور بسم اللہ دس شریفوں کے محلے میں رہتیں۔ بہت دن ہوئے جب چنبیلی نے زمیندار رولق میاں کی حویلی کے پچھواڑے پڑی ہوئی زمین اچھے داموں خرید کر یہ مکان بنوایا تھا۔ اور جب اپنے نئے مکان میں اُٹھ کر آئی تو جلد ہی کچھ کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور اور کچھ کے دل کا کھٹکتا ہوا کانٹا بن گئی۔ عورتیں بسم اللہ اور چنبیلی سے بہت جلی کٹی رہتیں۔ جب سے وہ یہاں آکر رہی تھیں۔ ان کا محلے میں ایک دوسرے سے ملنا جلنا بند ہو گیا تھا۔ کہ کہیں رنڈیوں کا سامنا نہ ہو جائے ـــــ رنڈیوں کا سامنا ـــــ یا ہزار مردوں کے سامنے ننگا کھڑے ہونے کے برابر ہوتا ہے، کہاں وہ کمائی کھانے والی رنڈیاں اور کہاں وہ گھر بیٹھنے والی شریف زادیاں۔ ان کا محلے میں رہنا ایسا ہی تھا۔ جیسے فرشتوں پہ شیطان کا سایہ۔ بیچاری گھر بیٹھنے والیاں جو کمائی کے تصور ہی سے کانپ اٹھیں، تو یہ تلملا جائیں۔ انہیں یہ کب گوارا ہوتا کہ رنڈی ان کے محلے میں رہے جب ان کا دل چاہتا اپنے گھر میں چیخ

پیٹ کر رکھ [illegible] ہر ایک کچھ سکتا ہے۔ اچھے اچھے لوگ عہدیداروں کے پیچھے بھاگتے
تو [illegible] کے تلوے تک گھس ڈالتے ہیں۔ اس لئے بسم اللہ کی بات ماننا ہی پڑتی
[illegible] ں اور قصبوں میں رنڈی بیچارئے بنا تقریب بالکل سونی ہی رہتی ہے۔
[illegible] میاں کی بیوی صبح سے جو دھوپ میں پلنگ ڈال کر پڑی تو اٹھنے کا نام
نہ [illegible] ساری دھوپ سرکتے سرکتے پیروں پر آگئی۔ اور وہ پھر پلنگ دھوپ
میں گھ [illegible] یٹ گئی۔ رات رونق میاں جو غائب رہے تو اس نے اس غم
میں صبح سے [illegible] منہ میں نہ ڈالا تھا۔ اسکی جٹھانی نے کتنا ہی اصرار کیا کہ کچھ کھا
کر پانی پی لے [illegible] ار رو پڑی کہ جب دل کو سکھ ہی نہیں ہے تو پھر کھانا کھا
کر کیا کرنا ہے؟ [illegible] ب ہو رہی کہ سچ ہے دل کو سکھ ہو تو سب کچھ، ورنہ
کچھ نہیں۔ سو وہ تو اپنا جنم [illegible] ب کا سمجھتی تھی۔ بیچاری کب سے بیوہ جٹھانی جوانی کے پہاڑ
سے دن گذار رہی تھی۔ نہ [illegible] پوچھنے والا نہ تری کا۔

"اللہ قسم بھابی، میرا بس [illegible] ری دنیا کی رنڈیوں کو ہنسیا سے کاٹ کر پھینک
دوں۔ کمائی کی کھائے دے الیاں، [illegible] یں پھر کھانا کھاؤں گی۔" اس نے جوش
سے بلبلاتے ہوئے کہا۔ اسکے دل میں [illegible] لگ رہی تھی۔

"ارے چپ بھی رہا کرو دلہن، کبھی [illegible] تمہارے منہ لگیں تو عزت پر بن
جائیگی" جٹھانی نے آہستہ سے کہا۔ اُس [illegible] زبان سے ڈر ہی لگا رہتا۔

"ہنھ! ہمارے منہ لگیں گی —— ؟ اُن [illegible] کتنوں کو کھلا دوں لونڈیاں
گنتے گئے" وہ غصے سے سرخ ہو کر بولی اور دودھ پینے [illegible] ں دھوں پیٹ کر
کھرے پلنگ پہ چٹک دیا سو لیسے ہی اُس نے صبح سے ایک [illegible] یا یا تھا بھلا [illegible]

کہاں سے اُترتا لیکن بچہ دودھ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ غصہ نہ آئے تو کیا ہو؟

"تم بھی تو ظلمی ہو۔ ناحق بچے کو مار دیا، کس کا غصہ کس پر اُتر تے۔" جھبّانی نے بچے کو اُٹھا کر اپنے کندھے سے لگا لیا اور وہ دوپٹے کے پلو سے منہ چھپائے ہوئے لیٹ کر پھر روتے لگی۔ اور روتے روتے یہ وقت آ گیا کہ دھوپ صحن اور دیواروں سے رینگتی ہوئی غائب ہو گئی۔ غضب خدا کا۔ سارا دن یوں ہی بھبو کا پیاسا پڑے گزر گیا تھا۔ رونق میاں کو کیا معلوم کہ بیوی کی کیا حالت ہو گئی۔ وہ تو مزے سے کھا پی کر صبح ہی کام پر چلے گئے تھے۔

"ارے اُستاد جی ہماری بسم اللہ کے لئے دُودھ جلیبی لے آؤ جانے کب مجرے سے لوٹنا ہو۔ کھا کر جائیے۔" شام کے اداس سناٹے میں چھبیلی کی آواز رونق میاں کی بیوی کے کانوں میں جا پہنچی۔ نہ جانے کیوں رنڈی کی آواز سے ہی اُسے طیش آ جاتا اور یہ طیش اس حالت میں زیادہ آتا جب رونق میاں رات گھر سے غائب رہے ہوں۔ ویسے تو وہ روز ہی دن میں کتنے ہی بار چھبیلی اور بسم اللہ کی باتوں کی آواز سنتی مگر زیادہ غصہ نہ آتا۔

"بیٹا کمائی کرے اور ماں بیٹا کو دُودھ جلیبی کھلا کھلا کر ــــــ" اللہ اکبر قریب کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر سر ڈھانکتے ہوئے جلدی جلدی دعا کرنے لگی، یہ وقت دعاؤں کے مقبول ہونے کا تھا، اس لئے رنڈی جیسی گندی چیز کا نام لے کر زبان کا اثر کیوں کھوتی۔ جھبّانی بھی چولہے میں آگ جلاتے سے اُٹھ کر وضو کرنے لگی۔ جب سے وہ بیوہ ہوئی تھی پابندی سے نماز پڑھا کرتی۔ در اصل نماز پڑھوں، جہاں

بیواؤں اور مولویوں کے حصے میں زیادہ آتی ہے اس لئے وہ بھی کبھی نماز قضا نہ کرتی۔ اور سارے محلے والوں نے اس کے شوہر کے مرنے کے بعد یہی صلاح دی تھی کہ بس اب اللہ سے لو لگائے اسکے علاوہ دُنیا میں اسکے لئے کچھ نہیں ہے۔

دعا ختم کرنے کے بعد اُس نے اپنا بستر بچھایا اور بچے کو جھولے سے اُٹھا کر لٹا دیا۔ غریب معصوم جب سے پیدا تھا سہما سوئے جا رہا تھا اور سوتے میں بھی بار بار سسکیاں لے رہا تھا۔ وہ خود بھی لیٹ گئی اور بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کس کا غصہ اور اترا اس معصوم پر۔ اُس نے زور سے بچے کو اپنے سینے سے بھینچ لیا اور پھر جگا کر اُسے دُودھ پلانے لگی جھٹانی نماز پڑھ کر کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔ جب سے اُس کا شوہر مرا تھا۔ وہ جاڑوں میں ہمیشہ مغرب کے بعد کھانا چڑھاتی اور نو دس بجے تک سب کو کھلا پلا کر خود گیارہ بجے تک کھاتی۔ اسکے بعد دیر تک آگ کے سہارے بیٹھی رہتی اور جب تک ننھے ننھے انگارے راکھ میں تبدیل ہو کر سو نہ پڑ جاتے وہ نہ اُٹھتی۔ اس طرح جاڑوں کی طویل وحشتناک راتیں کچھ جلدی کٹ جاتیں۔ غریب بیوہ دیور کی روٹیوں پر زندگی گزار رہی تھی۔

آج مغرب کے بعد ہی کہرا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اسی لئے رونق میاں اپنے گاؤں سے جلد ہی کام دیکھ بھال کر لوٹ آئے، اور یہ دیکھ کر ان کی جان جل گئی کہ بیوی سرِ شام ہی لحاف کی قبر میں پڑی ہے۔ وجہ ان کو اچھی طرح معلوم تھی۔ پھر بھی وہ بیوی کی ان حرکتوں کو ڈھونگ سمجھ کر سخت چڑ جایا کرتے اسے تو بس اپنے کھانے، کپڑے، بچے کی پرورش اور شوہر کی مرضی سے کام رکھنا چاہیئے نہ کہ باہر کی باتوں میں ہاتھ ڈالتی پھرے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی ان باتوں سے تنگ آ کر مہینوں اس سے بات نہ کرتے۔

وہ بیوی سے بغیر کچھ بولے کھونٹی سے تہبند اتار کر کپڑے بدلنے لگے اور پھر چولھے کے پاس ہاتھ سینکنے بیٹھ گئے۔ کھانا تیار تھا بھاوج نے نکال کر سامنے رکھ دیا اور وہ کھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے" دروازہ بند کر لینا نذیر احمدؐ کے ہاں جا رہا ہوں "

ایک گھنٹے بعد وہ نذیر احمد کے ہاں سے واپس آئے تو دیکھا کہ بھاوج بیوی کے سامنے کھانا لئے بیٹھی ہے اور وہ نوالہ ہاتھ میں لئے زار و قطار رو رہی ہے، بس جیسے ان کے تن بدن میں مرچیں لگ گئیں ۔

" تم نے بھابی اُسے اور بھی سر چڑھا لیا ہے۔ اٹھالے جاؤ کھانا" انہوں نے غصے سے کہا۔

"چپ رہو تو" ان کی بھابی نے پیار بھرے غصے سے جواب دیا اور دلہن سے کھانے کی ضد کرنے لگی۔ مگر اسکے لئے تو اب کھانا اور بھی حرام ہوگیا۔ اس نے نوالہ سینی میں رکھ کر سامنے سے سینی کھسکا دی اور پھر منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ اسکی جٹھانی نے کتنی مشکل سے تو اُسے کھانے پر راضی کیا تھا اپنا سا منہ لیکر رہ گئی اور سینی اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ رونق میاں اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی ذرا دیر میں خراٹے لینے لگے۔ ادھر بیوی ان کے خراٹوں سے مطمئن ہو کر اطمینان سے سسکیاں بھرنے لگی۔ خراٹے اور سسکیاں ــــ رات کا سناٹا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عجیب سا ساز چھیڑ دیا گیا ہے جس میں بیک وقت سکون اور اضطراب کے ملے جلے نغمے پیدا ہو رہے ہیں۔

"اری بسم اللہ تو نے کھانا بھی نہیں کھایا، دودھ پی لے پھر سونا، بھیا تجھے تھکا

رات کے خوفناک سناٹے کو چیرتی ہوئی چھبیلی کی آواز اسکے
ہ بالکل چور کر دیتا ہے"۔
ہنکے پار ہوگئی اور وہ اپنے آنسو پونچھ کر سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے سوچنے
ل۔ دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی، کمائی کی کھانے والی اور اسکے لئے دنیا کے سارے
مثل صبح اٹھے تو دودھ کا پیالہ ہونٹوں سے لگا دیا جائے۔ ماں واری جائے۔ استاد جی
صدقے ہیں، دوستوں میں اچھے اچھے سیٹھ ساہوکار نثار ہوں۔ افوہ —— اس نے
سنا تھا کہ جب بسم اللہ پیدا ہوئی تھی تو چھبیلی نے بڑی خوشی منائی تھی۔ قصبے کے سارے
جان پہچان والوں کی دعوت کی تھی، مسجد میں منتیں منوائی تھی۔ کہ بچی جیتی جاگتی رہے لیکن
وہ بدقسمت جب اپنے گھر پیدا ہوئی تھی تو اسکے باپ نے اس رنج میں کہ لڑکی ہوئی ہے۔
کئی دن کھانا نہ کھایا تھا۔ ماں بھی یہ کہنے سے نہ چوکی کہ اللہ بیٹا دیتا تو اچھا تھا۔ بچپن میں
کبھی ایسا نہ ہوا کہ اس نے اپنے باپ سے چار پیسے ملائی کی برف کھانے کو مانگے ہوں۔
تو اسے رلائے بغیر دئے ہوں اور پھر پیسے دینے کے بعد وہ اس سے کتنا کام کروا
لیتا۔ "بیٹا دوڑ کر بھینس کے آگے بھوسا ڈال دے۔ ٹوکرے میں اُپلے بھر دے، دوڑ کے
ملو کی دکان سے چار پیسے کا گڑ لے آ۔" ماں بھی اس کی عمر کے مطابق سارا دن کام لیا کرتی۔
کہاں کا لاڈ کہاں کی محبت —— بھینس کا سارا دودھ دودھ والے کو دے دیا جاتا اور
جب وہ بہت ضد کرتی تو تھوڑا پھر اسکے لئے بچا لیا جاتا۔ خیر —— بچپن تو پھر بھی اچھا کٹ گیا
لیکن شادی کے بعد تو اسے سکھ ہی نہ ملا۔ جب تک ساس زندہ رہی رات دن اسکے
کچوکے لگاتی رہی۔ اس سے چھٹکارا ملا تو نندوں نے سر اٹھایا جب تک اپنے گھر کی نہ
ہوگئیں اسے گھن کی طرح کھاتی رہیں —— اسکے بعد اس نے سوچا تھا کہ اب مزے
سے گزرے گی مگر سدا کی اٹھتے بیٹھتے گھرکی۔ شادی کے کچھ ہی سال بعد سارے

چوچلے ختم ہوگئے۔ اگر وہ ذرا بھی مُنہ سے اُف کرے تو گھر سے نکالنے کی دھمکی۔ چھ چھ۔ اس سے تو اچھی وہ کمائی کی کھانے والی رنڈیاں۔ وہ عیش تو کرتی ہیں اور —— وہ سوچتے سوچتے چونک سی پڑی، توبہ —— یا اللہ توبہ ہے وہ زیرلب بدبدائی اور ہولے ہولے گالوں پر ہاتھ مارا۔ کیسا غضب ہے کہ اس نے شیطان کے بھڑکانے سے اپنے کو رنڈی سے ملا لیا۔ بھلا کہاں وہ گھر میں بیٹھنے والی شریف زادی جو کمائی کے خیال ہی سے کانپ اُٹھے اور کہاں وہ کمائی سے پیٹ بھرنے والی رنڈی؟ اسکی دنیا اچھی ہو تو کیا، مرنے کے بعد تو وہ دوزخ کا کندہ بنے گی۔ اگر وہ مصیبتیں جھیل رہی ہے تو کیا، مرنے کے بعد اسے جنّت تو ملے گی۔ اللہ اُسے گناہ سے بچائے اور —— "اوہ" رونق میاں نے کروٹ بدلی اور اس نے اپنا کھلا ہوا مُنہ جلدی سے لحاف کے اندر کر لیا۔ اب وہ بار بار کروٹیں بدل رہے تھے جیسے نیند اچاٹ ہوگئی ہو۔

"کیا جاگ رہی ہو؟"

"ہوں"۔

"میں نے کہا سوتے سوتے آنکھ کُھل گئی۔ ذرا پاؤں تو دبا دو"۔ آج انہوں نے بہت دن بعد پاؤں دبانے کو کہا تھا لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے وہ اپنی بیزاری افسردگی کا اظہار کر کے انہیں خوشامد کی دعوت دے رہی ہو۔

"سنا نہیں تم نے؟" انہوں نے ذرا غصّے سے کہا۔

"میں نہیں دباؤں گی جب تم میرے نہیں تو کیوں خدمت کروں؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور سمجھا کہ اب وہ اس کی منتیں کریں گے۔ مگر وہاں تو جیسے آگ پہ تیل پڑ گیا۔

"تم کیا تمہارے باپ دبائیں گے پاؤں سمجھیں۔ ہم سے زبان نہ لڑانا۔ ورنہ اپنے گھر کا راستہ لو ——" وہ لحاف پھینک کر بیٹھ گئے۔

"راستہ کیا لیں۔ تم مار کر چھٹی کر دو"۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ہم کیوں مار کر گنہگار بنیں؟ تم خود ہی مر جاؤ۔" وہ پھر لیٹ گئے اور پاؤں انیٹھا انیٹھا کر چھت کی کڑیاں گننے لگے۔ وہ چپکے چپکے رونے لگی۔

"چلو بس رونا چھوڑو اور پاؤں دبا دو، بڑی اینٹھنی ہو رہی ہو" تھوڑی دیر بعد انہوں نے پھر کہا۔ اور وہ سردی میں کپکپاتی اٹھ کر ان کے پائنتی بیٹھ گئی اس کا دل چاہ رہا تھا۔ کہ وہ اپنی اور ان کی جان ایک کر دے، اف وہ ظالم مارے اور رونے نہ دے۔

"لحاف ڈال لو اپنے اوپر۔ سردی میں کیوں بیٹھی ہو؟" انہوں نے نرمی سے کہا اور وہ جو اپنی اور انکی جان ایک کر دینے کی سوچ رہی تھی محسوس کرنے لگی کہ اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے۔ جیسے پاؤں دبانا عورت کا فطری حق ہے اور اگر اس سے نہ دبوائے جائیں تو سارے زمانے کا غم اس پر پھٹ پڑتا ہے بھلا اس کا شوہر اور اسکی خدمت سے محروم رہے کیونکہ جیے کوئی؟

چار دن سے رونق میاں کی بیوی بڑی خوش تھی، بات بات پر اسکے دانت نکلے پڑتے جب بھی رونق میاں اس سے سیدھے منہ بولتے اسکی یہی حالت ہوتی، لیکن آج رات وہ پھر دو بجے تک غائب رہے تھے اور وہ صبح سے اٹواتی کھٹواتی لئے دھوپ میں پڑی سوکھ رہی تھی۔ نہ کھانا نہ پانی بس پلو سے منہ چھپائے پھسر پھسر روئے جا رہی تھی، جٹھانی نے کیسا کیسا سمجھایا کہ یوں روز روز غم کرنے سے ایک دن جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ لیکن اس نے کچھ نہ سنا۔ شریف زادیاں آخر شریف زادیاں ہیں

ہمیشہ جان پہ کھیلتی رہتی ہیں۔

"اری بسم اللہ! آج تو نے کھانا بھی نہ کھایا۔ بس صبح سے یوں ہی چپکی پڑی ہے۔ جانے بعض دن تجھ کو کیا ہو جاتا ہے۔ وہیں واری اُٹھ جا" چنبیلی کی تیز آواز اسکے کانوں میں اُتر گئی۔ اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی کچھ پھریری سی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"رنڈیوں کے چوچلے خدا کی مار ہے۔ کمائی کر کے پیٹ بھرنے والیاں اور یہ ٹھسّے" وہ اپنی جٹھانی سے مخاطب ہو گئی، روز کی طرح آج بھی اس کا غصّہ رنڈیوں پر ہی اتر رہا تھا لیکن کوئی پوچھے کہ ان کی کیا خطا؟ پر وہ انصاف کے نام سے تو واقف ہی نہ تھی چنبیلی اور بسم اللہ کو باتیں سنا سنا کر شیر ہو گئی تھی۔

"منہ کالا ہوگا مرتے وقت کمبختیں کر لیں خوب ——"

"بس بی بی بس۔ بہت سنا ہم نے"۔ ایک غصّے سے بھرائی ہوئی آواز سُن کر ذوق میاں کی بیوی چونک پڑی اور اسکی نگاہ چنبیلی کے کوٹھے کی طرف اٹھ گئی تو دیکھا کہ بسم اللہ غصّے میں لال بھبھوکا اپنی چھت پر کھڑی ہے رنڈی کا سامنا غضب —— اُس نے جلدی سے اپنا مُنہ دوپٹے کے پلو سے چھپا لیا اور جٹھانی بھی صحن سے ہٹ کر دالان میں دبک گئی۔

"بڑی یہ ہمت کیتی، کمائی کرنے والی" اُس نے چیخ کر کہا

"کمائی کمائی" بسم اللہ نے ہاتھ مٹکا کر اسکی نقل اتاری" اگر ہم کمائی کر کے پیٹ بھرتے ہیں تو تم بھی کمائی کر کے پیٹ بھرتی ہو۔ اور تم۔ تم کیا دنیا جہاں کی عورتیں اس کا کھاتی ہیں جس کا ہم لیکن ہم ہزار کے سر چڑھ کرتے ہیں اور کسی کے ذلیل نہیں، پر تم —— تم کمائی سے پیٹ بھی بھرو عمر بھر میاں کی جوتیاں بھی اُٹھاؤ۔ کیا کہتی ہو ہم کو جب جانیں کہ تم اپنے میاں سے یوں ہی دمڑی کپڑا لے لو بڑی ہم کو کہنے والی آئی ہیں —— جیسے ہم کچھ

جانتے ہی نہیں۔ ہاں ۔ مچھلی کے سے سفلے اکھاڑ کر رکھ دُوں۔ بی بی جی اور ـــــ"

چھبیلی بیزاری کیا کرتی ہے بسم اللہ" کہنی اُسے زبردستی چھت پر سے نیچے دھکیل لے گئی۔ باہر کئی محلے والے لڑائی کی آواز سن کر جمع ہو گئے تھے اور چیخ چیخ کر بسم اللہ کو سمجھا رہے تھے اور وہ سب رو رو کر کہہ رہی تھی " تین سال سے چپ ہیں۔ ہر دم باتیں سنیں اور مُنہ سے کچھ نہ کہا"

ادھر رونق میاں کی بیوی اس طرح اچانک رنڈی کی زبان سے کھری کھری سُن کر کچھ دیر تو مبہوت رہی لیکن پھر اپنی بے عزتی کا خیال کر کے زور زور سے رونے لگی

" اُفوہ، بسم اللہ کی اتنی مجال کہ اسکے منہ کو آئی"

بڑی مشکل سے جٹھانی نے سمجھا بجھا کر چپ کرایا۔

شام کو جب رونق میاں گاؤں سے واپس آئے تو باہر انہیں محلے والوں سے لڑائی کا حال معلوم ہوا انہیں گھر آتے ہی بیوی پر برس پڑے آخر اسے ضرورت ہی کیا تھی کہ رنڈی کے مُنہ لگے؟ انہوں نے تاؤ میں آکر دو تین ہاتھ اسکے مار دیئے۔

رات وہ رنج اور غصے سے مُنہ لپیٹے چپکے چپکے رو رہی تھی۔ رونق میاں اس کے قریب ہی دوسرے پلنگ پر پڑے خراٹے لے رہے تھے اسے اس بات کا اتنا ملال نہ تھا کہ شوہر نے اسے مارا آخر اسکی خطا تھی۔ رنج تو اس بات کا تھا کہ بسم اللہ نے اسکی شرافت پر حملہ کر دیا۔ بھلا وہ پیٹ بھرنے کے معاملے میں اسکی ایسی حیثیت رکھتی ہے۔؟

" ارے بسم اللہ، اللہ جار، کھانا کھالے۔ تو رنج کاہے کو کستی ہے، کہنے والوں کو کہنے دے ہم تو یہی کہیں گے کہ چاند پہ تھوکا منہ پر پڑے گا" چھبیلی کی آواز آئی۔

اور اسکی جیسے کوئی رگ پھڑک اٹھی۔

"منہ سڑے کھنے والی کا" ——— وہ بڑبڑانے لگی"۔ کمائی کمائی — وہ بھی اسی کی طرح پیٹ بھرتی ہے رنڈی، بدمعاش، وہ شریف زادی ہے شریف زادی بھلا وہ رنڈی کی طرح اپنا پیٹ بھرتی ہے؟ رنڈی، کمینی، ہُنھہ"۔

ڈاکٹر رشید جہاں

آپ شیخ عبداللہ بانی علیگڈھ گرلز کالج کی سب سے بڑی لڑکی ہیں ازبلا تھوبرن
کالج سے ایف۔ایس۔سی اور لیڈی ہارڈنگ کالج دہلی سے ایم۔بی۔بی۔ایس
کیا۔ پھر صاحبزادہ ڈاکٹر سعید الظفر خاں کے بیٹے صاحبزادہ محمود الظفر خاں
سے شادی ہوگئی۔ آپ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم کارکن ہیں اور اردو ادب
میں ترقی پسندی کو رواج دینے میں آپ کا حصہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ان
دنوں لکھنو میں قیام فرما ہیں۔

ڈاکٹر رشید جہاں

قانون اور انصاف

شام کا وقت ہے۔ انگلش کلب میں آج بہت رونق ہے۔ بے گول پردہ دار موٹریں
کھڑی ہیں۔ دیواروں پر چقیں کے نیلے پردے کسے ہوئے ہیں جو اندر کی کاروائی گندہ
غلیظ ہندوستانی آنکھوں سے چھپائے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی صاحب
صاحب یا کسی ہندوستانی افسر پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ کچہری کے سامنے ہاکی کا ایک
میدان ہے جس پر اپنے کئی ہندوستانی بھائی جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ ٹہل پھر رہے ہیں
گھاس پر لیٹے ہیں، لیکن منہ سب کے کلب کی طرف ہیں۔ نہ معلوم وہ کیوں جمع ہیں
پردوں اور موٹروں کی چہل پہل نے ان میں ایک خواہش ایک جستجو پیدا کر دی ہے
تماشہ دیکھنے کے انتظار میں جمع ہیں۔

"یار وہ دیکھو بجلی والے صاحب ہیں۔"

"اور میم کس کی بغل میں دبائے ہیں۔"

قہقہہ پڑتا ہے ——

" اجی یہ لوگ بھی خوب ہیں۔ چاہے کوئی میم ہو۔۔۔۔۔"

" اے یار، اور کیا تیری طرح کہ جورو جیب سے لایا ہے۔۔۔۔۔"

" ارے یہ کون ہیں یہ تو کالے ہیں۔ اُن کا یہاں کیسے گزر ہو گیا؟"

" کوا چلا ہنس کی چال۔ اپنی بھی بھول گیا۔" اس پر بہت زور کا قہقہہ پڑا۔

" اجی وہ دیکھو موٹر سے وہ جج صاحب اُترے۔"

" اے یار بڑا انصاف کرتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ خدا قسم! اُ

جب میں فتو والی پارسیٹ میں پھنس گیا تھا تو جج صاحب نے صاف چھوڑ دیا ——"

" ابے سالے، جیب بھی رہ نہیں تو کھینچ دوں گا ایک ہاتھ، فتو سے تو پوچھ۔۔۔۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی"

" چلو یار چھوڑو اس مردود کو یہاں۔ وہ جنٹ صاحب کی لڑکی تو آتی نہیں نظر آتی۔"

آج صبح رابنسن صاحب کی [illegible] پارٹی ہے۔ وہ آٹھ مہینے کی چھٹی پر ولایت شادی کرنے جا رہے ہیں۔ اپنے زمانے کے صحیح جج ثابت ہوئے۔ کلب میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ شہر کے انگریزوں کی تو وہ گویا جان تھے۔ ہندوستانی اعلیٰ افسروں کی پیٹھ بھی کافی تھپک دیتے تھے۔ کبھی کبھار ان کو کھانے یا چائے پر بلا لیتے تھے اسلئے وہ بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ باقی "نیٹو" آبادی پر صاحب کا کافی رعب داب تھا۔ بعض لوگ کلکٹر صاحب سے اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا کہ اُن سے۔ ان کی ایمانداری کی شہر میں بہت کافی دھاک تھی۔ قانون کو تو ایسا سمجھتے تھے کہ صوبہ میں کم جج اُن کا مقابلہ کرتے تھے۔

بس یہ کہو کہ قانون کی ترجمانی کروں گی۔" اس کے دل نے کر سکتا تھا۔

کالے آدمیوں تمہارے میں رہ رہتا اپنی زندگی کے بارے میں ہزار چھپائیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ خبر باہر چھپ آتی ہے۔ تین سال ہوئے جو رابنسن چھٹی کا کچھ حصہ شملہ پہ گزار رہے تھے کہ اتفاقاً مسز بلیک سے ملے۔ مسز سلویا بلیک ہیں اکیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی کوشش ہی پہلے ایک کرنل بلیک سے شادی کر کے ہندوستان آئی تھی۔ ویسے آپ پھر وہ ہر ایک کے دل میں جگہ کئے ہوئے تھی۔ کرنل صاحب فیروزپور میں تھے۔ اور حال نہ ہوا تھا آتے جاتے رہتے تھے۔ بیوی کی وجہ سے اُن کی بھی سوسائٹی میں بہت پوچھ ہے۔ جب رابنسن صاحب وہاں پہنچے تو دو تین دن ہی بعد دونوں میں اتنی شناسائی ہو گئی کہ خاصے دوست ہو گئے اور بہت جلد دوستی عشق کی حد تک پہنچ گئی۔ رابنسن ان خوش قسمت انگریزوں میں تھا جس پر کئی عورتوں کی آنکھ تھی اور رابنسن جہاں جاتا ان کی آنکھوں کا تارہ بنا رہتا۔ عشق ایک نہیں کئی ہوئے تھے۔ شادی شدہ غیر شادی شدہ ہر قسم کی عورتوں سے۔ لیکن یہ عورت ہی کچھ اور تھی اور مسز بلیک تو ــــ بس دنیا و مافیہا کو بھول چکی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا سوسائٹی میں خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ پردہ فاش نہ ہو۔ اُس کو تو یہ کھیل جیسے آتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کا جی چاہے پڑھ لے۔ ہر طرف جیک رابنسن لکھا ہوا تھا۔ رابنسن نے اس کو سمجھایا بھی۔ اُس کا جواب یہی ملا "مجھے تو کوئی ڈر نہیں جو تمہیں ڈر ہو تو مجھ سے نہ ملو۔"

آخر کو اور بھی عورتیں ہوٹل میں تھیں۔ جن میں سے اکثر رابنسن پر ریجھی ہوئی تھیں تو مسز سلویہ بلیک کے حسن سے خار کھائے بیٹھی تھیں جو عشق برابر ہوٹل میں چلا رہی

کرتے تھے چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق چھپ کے [illegible] کرنا بھی کچھ بُرا نہ تھا

لیکن ایسا کھلم کھلا عشق وہ بھی ایک شادی شدہ ... " وسائٹی کیسے برداشت

کر لیتی پہلے یہ چہ میگوئیاں ہوئیں پھر باتیں ہوئیں۔ آو ...... ہنسے گئے کرنل صاحب

بھی آئے بیوی کا رنگ ہی اور دیکھا۔ بات کو پی گئے لیکن کیا؟" ان تک ایک روز

مسز بلیک شملہ سے غائب ہو گئیں۔ تین دن سہارنپور جا کر [illegible] کا قہقہہ لگانے والوں

نے لگا لیا پھر ادھر دو لوں کا ڈر بھی نکل گیا۔ رابنسن ہندوستان [illegible] برس سال سے

تھا۔ اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن پھر کیا کرتا مجبور تھا بانی۔ خدا اختیار میں نہ تھی

معاملہ برداشت از بام ہو گیا اور آخر کو مسز بلیک گھر چھوڑ کر نکل جا ــــ ئیں۔ کرنل

بلیک کو بھی ضد ہو گئی کہ وہ ضرور رابنسن پر اپنی بیوی کو بھگا لے جانے کا مقدمہ کریگا.

بلکہ اس نے وکیلوں وغیرہ سے باتیں بھی شروع کر دیں۔ رابنسن بہت چپ لیکن کرتا

تو معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔ خود کرنل سے ملا، دوستوں سے کہلوایا لیکن بلیک اپنی

ضد پر اڑا رہا۔ اسطرح کھلم کھلا انگریزوں میں مقدمہ بازی کرنا انگریزی رعب داب میں فرق

ڈالتا تھا۔ لہٰذا ادھر گورنر تک اور ادھر کمانڈر انچیف کے کانوں تک خبر پہنچائی گئی

ایک زبردست دباؤ کے بعد کرنل صاحب راضی ہو گئے کہ وہ بجائے رابنسن پر [illegible]

کا مقدمہ چلانے کے اپنی بیوی کو طلاق دیدے گا۔ ادھر مسز بلیک کو فوراً ولایت روانہ

کیا گیا کہ وہ جبتک طلاق کی کاروائی پوری نہ ہو وہیں رہیں۔

اس عرصہ میں کہ طلاق کی کاروائی جاری تھی۔ رابنسن ولایت ایک مرتبہ ہوائی

جہاز سے اپنی معشوقہ سے مل آئے تھے اب وہ آٹھ ماہ کے لئے جا رہے تھے ایک

ایک لمحہ ہندوستان میں کاٹنا مشکل تھا ــــ چلنے سے پہلے سلویہ کا ایک تار ملا تھا

"میں تم کو وینس پر مل جاؤں گی۔" اُس تار نے رابنسن کو بالکل ہلا دیا۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے سلویہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا عورت ہے؟ غضب کی۔ پہاڑوں کی چاندنی راتیں، ہوٹل میں چھپ چھپ کر ملنا۔ ہزاروں نگاہوں سے چھپ کر راتوں کو اس کے پاس آنا۔ بلیک کی نگہداشت کے باوجود بھی آنا۔ اور پھر اُسکی گود میں سر رکھ کر آہستہ سے کہنا کیا کروں بہت کوشش کرتی ہوں لیکن جیک تم سے محبت نہیں جاتی؟" اس کا خیال ہی چکرا دیتا تھا۔ اور پھر وہ رات وہ گردن وہ جسم! جب وہ پہلی دفعہ اسکے ساتھ آئی تھی تو کیا کچھ سین ہوٹل میں نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے کیا کیا ناک بھوں نہ چڑھائی تھی۔ لیکن اُس نے آ کر نہایت سادگی سے صرف اتنا کہا۔ "جیک میں آگئی" گو رابنسن پارٹی میں گھوم رہا تھا۔ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا لیکن اُس کا دل وہاں نہ تھا۔ اس کو تشویش تھی تو یہ کہ وہ سلویہ جیسی لاجواب عورت کو خوش بھی رکھ سکے گا یا نہیں ——

× × × × × × × × × ×

"بھولا! تمہارے کھلاف مسمات گجریا کو دوسری دفعہ بھگانے کا جو جرم لگایا ہے وہ ثابت ہے۔ مجرم کو تین سال کا سکت سزا کا حکم سنایا جاتا ہے۔"

یہ حکم سُنا کر رابنسن صاحب کانسٹیبل کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "لے جاؤ مولزم کو۔"

اُن کا یہ کہنا تھا کہ ایک گندمی رنگ درمیانہ قد کی سولہ سترہ سال کی لڑکی چند مردوں کو چیرتی ہوئی جا کر بھولا سے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی اور چیخنے لگی کچہری میں عورتوں کی چیخ و پکار روز ہی سُنی جاتی ہے لیکن اُس کی تڑپ میں کچھ جادو تھا کہ راہ چلتوں کے پیر روک لیتا تھا۔ کچہری کا کمرہ بھر گیا۔

بھولا بیس سال کا ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ کالے چہرہ پر کالی آنکھیں ناگ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گجریا کے بین اور رونے کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ "اے بھولا میں تو کو نہ جانے ووں گی ——— اے جج صاحب ایسا ظلم نہ کرو۔ موکو بھی سنگ ہی بھیج دو۔ اے سپیا میں ہا ہا کھاؤں موکو بھی لے چل۔ یا کے سنگ موکو بھی بند کر دیجیو۔"

"ہٹ ہٹ چھوڑتی نہیں ٹسری"

"مولو۔ پکڑو نہ اس ——— کو ——— نے گجب اٹھا رکھا ہے"۔

ادھر سے اس کے بھائی نے اور تین سپاہیوں نے پکڑا ادھر کانسٹیبلوں نے بھولا کو دھکا دیا ——— "چل بے ——— کھڑا کیا دیکھتا ہے"۔ اس کو گھسیٹ کر کمرہ سے لے گئے ——— "بھولا ——— او بھولا ——— کہاں چھوڑ چلا" پیچھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ چار مردوں کی آہنی گرفت سے کہاں جا سکتی تھی۔ زمین پر مچل گئی۔ ایڑیاں رگڑنے لگی "بھولا ——— ہائے بھولا ——— بھولا ——— بھولا ——— "

"کورٹ صاحب اس عورت کو باہر نکالو۔ شور نہیں [illegible] ———

× × × × × ×

بھولا قوم کا گڈریا تھا کانسرو کے جنگل میں گائے بیل چرایا کرتا تھا۔ چھوٹا مست آدمی تھا۔ اپنے بھائی بھاوج کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بھاندرودے میں رہتا تھا۔ بچپن سے اسی جنگل میں رہا پلا بڑھا۔ جنگل میں اس کا من لگتا تھا۔ سونگ ندی میں گاؤں کے اور نوجوانوں کے ساتھ مل کر نہانا اور پھر اس کی آواز بھی کیا غضب کی تھی۔

اس کا پتوں کے ڈھیر پر لیٹ کر اور لہک لہک کر گانا "نینوں سے نینیاں ملاؤ میری جان"
گاؤں کی کئی لڑکیوں کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتا تھا۔

کانسرو کا جنگل فروخت ہوا اور کئی بڑھئی درختوں کو کاٹنے اور گرانے پر لگے اُن
میں سے ایک مڑو بھی تھا۔ وہ مع اپنی نوجوان گجریا کے وہاں آیا، بڑھئی اپنی عورتوں کو
جنگل کے کام پر نہیں لے جاتے ہیں۔ لیکن مڑو کا چچا بچا ندوالے میں رہتا تھا۔ لہٰذا وہ
گجریا کو بھی ساتھ ہی لے آیا، گجریا سولہ سترہ سال کی گندمی رنگ کی بھرے بھرے جسم کی
ایک گرما گرم لڑکی تھی۔ گاؤں کی اور عورتوں کے ساتھ ندی پہ پانی بھرنے جاتی تھی ہر راستہ
بھر ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ چہلیں کرتی بھاگ دوڑ مچاتی ہوئی جاتی تھی۔ راستہ ادھر
سے نکلتا تھا۔ جہاں گاؤں کا ایک آدھ گڈریہ گایوں اور بیلوں کے واسطے پڑا رہتا تھا۔
اکثر ان مردوں اور عورتوں میں چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ "تو بڑا جلبلی ہے رے
بھولا"۔ اُس کی بھاوج جو بھولا کے مذاقوں کو پسند کرتی تھی بن کر جواب دیتی۔ کوئی
لڑکی کہتی: "اے بھولا ذرا وہ ہولی تو سنا دے"

"کیا دے گی؟" بھولا آنکھ مار کر پوچھتا۔

لڑکی اٹھا کر پتھر مارتی: "دیکھو بھابی یہ بھولا گالی دیتا ہے"۔

گجریا کے گاؤں میں آنے سے بھولا کی زندگی میں بہت تبدیلیاں ہونے لگیں
اب وہ پہلے سے بھی زیادہ گانے لگا تھا۔ اب اس کے مذاق بھی زیادہ تیکھے ہو گئے تھے
وہ گجریا کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ گاؤں کی گلی میں گجریا اس کو اکیلی
ملی تھی لیکن گجریا کو دیکھ کر اسکے پاؤں بند ہو جاتے تھے اور منہ تو جیسے کسی نے کیل دیا ہو
جب گجریا سامنے نہ ہوتی تو بڑی بڑی باتیں سوچتا۔ لیکن اس کو دیکھ کر سب بھول جاتا۔

ایک دن جب وہ جنگل میں گا رہا تھا۔ گجریا اور عورتوں کے ساتھ ادھر سے گذری اس کو دیکھکر بہت عورتیں رُک گئیں۔ وہ اسی طرح بیٹھا گاتا رہا پھر گجریا کی طرف دیکھا۔ اُس نے نیچی نگاہ کر کے مسکرا دیا بھولا گانا وانا سب بھول گیا۔ گجریا اور عورتیں چلی گئیں۔ لیکن اس دن سے گجریا اور وہ آنکھوں اور مسکراہٹ میں باتیں کرنے لگے۔

ایک دوپہر کو گجریا کا پانی جلدی سے ختم ہوگیا اور اس کو اکیلے جنگل پانی لینے جانا پڑا راستہ میں بھولا مل گیا ہمت کر کے بولا "گوری آج اکیلی اکیلی کہاں؟" گجریا بگڑ گئی بھولا ڈر گیا مگر ہمت کر کے چھیڑتا ہی گیا۔ گجری بھی ہنس دی۔ بھولا نے آنکھ کر اُس کی کوئی بھر لی۔ وہ گھبرا کر الگ کھڑی ہوگئی۔ لیکن وقت اور جگہ مقرر ہوگئی۔

بھولا کی بے چینی کا عجیب حال تھا۔ تین رات سے اُسی جگہ گجریا کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ آئی نہ تھی۔ آخر کو چوڑیاں بچھوے اتار کر دبے پاؤں گاؤں کے باہر لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے آکر کھڑی ہوئی۔ اور چپکے سے بھولا کو بتایا کہ اس کا میاں منڑو پٹے وقت اس کے ساتھ ہی سوتا رہا وہ کوئی بہانہ نہ لگا سکی۔ اب پیٹ میں درد اور جنگل کا بہانہ کر کے آئی ہے اور بہت جلدی جانا ہے۔ اب یہی قصہ چلنے لگا۔ کہ بھولا رات رات بھر گجریا کے انتظار میں جاگا کرتا۔ اور وہ اگر موقع لگ جاتا تو آجاتی۔

بھولا اپنی اور سب آشنا عورتوں کو بھول گیا جہاں سگائی ہوئی تھی اس کی بھی شدھ بدھ نہ رہی تھی بھائی کے بہت بگڑنے پر کہدیتا۔ "ابھی میں نا کرتا۔"

پریم کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ دونوں انجام سے بے خبر جب ہی تک زندہ رہتے جب تک ایک دوسرے کی آغوش میں ہوتے۔

گاؤں کے آس پاس لکڑی کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک رات کچھ لوگ جاگ رہے تھے:

حقہ پی رہے تھے کہ گیرپا نکلی اور جنگل کی طرف چلی۔

"کون گئی؟" ایک نے شک کے لہجہ میں آہستہ سے پوچھا۔

دوسرے نے کہا "مٹرو کی معلوم ہوتی ہے۔"

"یا وقت وہاں اس کا کیا کام ہے؟" کہ اتنے میں آہستہ آہستہ بھولا بھی اُسی راستہ سے جاتا دکھائی دیا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے!!"

"لو ——— کو اور بھی کوئی نہ ملا یہ گڈریا کا ہی رہ گیا تھا؟ ———"

گاؤں میں ایسی بات آگ کی طرح پھیل جاتی ہے دوسرے روز آہستہ آہستہ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ لیکن مٹرو کے منہ پر کون رکھے۔ آخر کو کاشی بڑھئی نے حقہ پیتے پیتے مٹرو کی طرف دیکھ کر کہا "مٹرو تیری عورت ہے تو بڑی سندر" مٹرو نے غضبناک آنکھیں نکال کر کاشی کی طرف دیکھا۔

"تجھ سے کا؟"

"نا بھیا میں تو بات کہتا تھا کہ کسی سندری کا قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیوں ٹھیک بات ہے نا بلدیوا؟"

بلدیوا نے بھی سر ہلا دیا۔

مٹرو نے بگڑ کر پوچھا "کون کا بات ہے؟"

"کچھ نا بھیا۔ کل رات تیری عورت ادھر ہی کے جنگل میں جا رہی تھی ——— تھوڑی دیر بعد بھولا بھی ادھر ہی گیا" ———

"کون بھولا!"

"وہی گنڈا سا لگا۔"

"ہوں!"

"نا بھیا کچھ دیکھا دیکھا نا صیں۔ بس جو بات تھی کہہ دی۔"

مٹرو کے دل میں تو جیسے کسی نے چھری بھونک دی ہو۔ گھر میں آکر گجریا کو خوب پیٹا تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن اب ہر وقت وہ گجریا کو آنکھوں میں رکھنے لگا۔ اور ادھر اُس نے اپنی چاچی سے بھی کہہ دیا۔ "چاچی اس کا دھیان رکھنا ادھر ادھر اکیلی نہ ڈولے" گجریا پر اب بہت سختی ہونے لگی۔ مٹرو بات بے بات مارنے لگا لیکن اس نے بھولا سے ملنا نہ چھوڑا۔ دو ہی منٹ کو مل لیتی، گلے ہی لگ آتی۔ ہات ہی چھو لیتی۔ رفتہ رفتہ چاچی بھی بات کو بھولنے لگی اور مٹرو بھی ذرا غافل ہو گیا۔

ایک رات مٹرو کی آنکھ کھلی گجریا غائب تھی۔ چپکے چپکے جھونپڑی میں ڈھونڈا باہر نکل کر ڈھونڈا کہیں نہ ملی تھوڑی دیر بعد اُس نے دیکھا گجریا دبے پاؤں گھر کی طرف جا رہی ہے اور کچھ فاصلہ پر بھولا بھی ہے .... بات صاف، گجریا کے پیچھے پیچھے گھر چلا اور اس سے پہلے کہ وہ گھر میں گھسے اس کا ہات پکڑ لیا۔ گجریا کا دم ہی تو نکل گیا۔ لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی رہی چھ مہینے کی متواتر محبت نے اُس کو تھوڑا سا نڈر بھی کر دیا تھا۔

"کہاں گئی تھی؟"

"جنگل"

"ساتھ کون تھا؟"

گجریا چپ تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ....؟" ایک طمانچہ زور کا منہ پر پڑا پھر گھونسہ لات اور گھونسہ لات اور گھونسہ لات! ویسے جب گجریا پٹتی تھی گاؤں کی اور عورتوں کی طرح وہ بھی واویلا مچاتی تھی لیکن آج رات وہ مار کھاتی رہی اور چپ رہی، گھونسوں کی آواز سنکر چچی نکل آئی۔ مٹرو کو اندر لے گئی گھر والوں میں صلاح ہوئی کہ اپنی عزت کی بات ہے بات دبا دینی چاہیئے اور اس ——— کو اسکے باپ کے گھر پہنچا دینا چاہیئے۔

دوسرے روز سویرے سجائی گجریا وہاں سے آٹھ میل پر پرکوٹ پہنچا دی گئی اور ساتھ ہی مٹرو اس کی ساری بات بھی کھولتا آیا۔ وہاں پر باپ اور سوتیلی ماں بھائی اور بھاوج نے ہر وقت کی چوکیداری شروع کر دی لیکن ایک گڈریہ کے لئے آٹھ میل کیا ہوتے ہیں تھوڑے ہی دنوں پیچھے پھر دونوں آٹھویں دسویں چھپ کر ملنے لگے۔ ایک روز بھتیجے نے دیکھ لیا آکر گجریا کے بھائی سے کہا بھائی مٹرو سے بھی زیادہ بہن کی مرمت کی اور اب گھر والے رات کو اُسے کوٹھڑی میں بند کر دیتے تھے۔ جون کا مہینہ چھوٹی سی کوٹھڑی۔ گجریا تھی کہ وہاں سے ادھ مری ہو کر نکلتی تھی۔ ایک شام کو وہ گھر سے غائب تھی، سارا گاؤں جنگل ڈھونڈ ڈالا پتہ نہ لگا مٹرو کے پاس آدمی راتوں رات گیا، معلوم ہوا کہ دو دن سے بھولا بھی غائب ہے۔ دوسرے دن پولیس میں اطلاع ہوئی۔ وارنٹ کٹوایا گیا کہ بھولا نابالغ لڑکی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ آٹھ روز کے بعد دونوں پکڑے ہوئے لائے گئے عدالت میں گجریا نے گواہی دی۔ اپنی محبت اور خود اپنی مرضی سے بھولا کے ساتھ جانے کا اقبال کیا۔

بھولا نے بھی بہت کہا کہ مجھ کو اس کی عمر کی کیا خبر تھی، کیا اسکے ماتھے پر لکھی ہوئی

تھی مجھ کو اس سے محبت ہے یہ خود میرے ساتھ چلی آئی۔ لیکن قانون تو قانون ہی ہے اس میں چوں و چرا کی کیا مجال۔

اور پھر جب رابنسن جیسا قابل جج قانون کی ترجمانی کرے تو بھولا کو تین سال کی سزا سے کیا کم مل سکتی تھی۔

× × × × × × × × ×

کلب میں آج شام ہر طرف چہل پہل تھی۔ چالیس کے قریب انگریز مرد اور عورت تھے اور تین چار ہندوستانی مع اپنی بیویوں کے رونق افروز تھے۔ آج رابنسن کی بہت قدر تھی۔ ہر طرف ان کی پوچھ تھی۔ ہر انگریز ان کے "ہوم" جانے پہ رشک کر رہا تھا انگریز یہاں خواہ کتنے ہی آرام و آسائش سے ہی رہیں۔ لیکن "ہوم" "چھٹی" پہ جانا ایسا ہی محسوس کرتے تھے جیسے کوئی چڑیا پنجرے سے چھوٹ کر خوش ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قدر تو وہ اکٹھا ہی کرتے ہیں یعنی جب پنشن پا کر عمر بھر کے لئے "ہوم" جا کر ہوم بساتے ہیں۔ آج تو رابنسن اور بھی غیر معمولی طور پر خوش تھا کہ اب وہ شادی کرنے جا رہا تھا ایک میز پہ وہ، ہم، ساجرس ایک اور انگریز اور مس فوکس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے یہ لوگ ہوتے تو "امیوشنیل" ہیں بالکل"۔

"اب دیکھو جو آتے پہ لڑکر کیپٹن مارٹن کے پرانے چوکیدار کے چھرا بھونک دیا"۔ مس فوکس نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"روگ (ROGUE) کہیں کا مجھ کو وہ آدمی بالکل پسند نہیں تھا۔ نہ معلوم مارٹن نے اس کو کیا کیوں ہٹا تھا"

"مجھے تو بہت خوشی ہے کہ میں جا رہا ہوں۔ ورنہ اس کو پھانسی کی سزا بھی مجھ ہی

کر دینی پڑتی"۔ رابنسن نے کہا "پھانسی کی سزا مجھ کو بالکل پسند نہیں" ٹم راجرس نے کہا۔ جو ابھی تین مہینے پہلے ہندوستان آیا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اُس کو ایک عجوبہ معلوم ہوتی تھی۔

"پھانسی کی سزا پسند نہیں! مس فوکس زور سے چیخیں"۔ اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو تو یہاں کے وحشی "نیٹو" ہم میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں"۔

"ارے چلئے بھی مس فوکس آپ کتنی عجیب باتیں کرتی ہیں"۔ ٹم راجرس نے جس پہ ابھی تک کیمبرج کا رنگ چڑھا ہوا تھا ہنس کر مس فوکس کو چھیڑا۔

"لیکن اس بیرا کو تو ضرور پھانسی ملنی چاہیئے رات بھر اس چوکیدار کی عورت اتنے زور زور سے روئی ہے کہ مارٹن کے کمپونڈ اور ہمارے کمپونڈ میں کسی کو سونے ہی نہیں دیا"۔

"تو بیرا کے پھانسی لگنے سے کیا چوکیدار کی بیوی کا رونا رک جائے گا"۔ ٹم نے پھر پوچھا۔

"مسٹر راجرس تم ابھی ابھی ہندوستان آئے ہو تم اپنے جوش میں بہت سی باتیں بھول جاتے ہو۔ لیکن مس فوکس نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو تو اس وحشی ملک میں ہر وقت قتل و خون ہوا کرے ہمارے قانونوں کی برکت سے امن و امان قائم ہوا ہے"۔

"ہاں چلئے چلو ...." ٹم راجرس نے کہا۔

"یہ ہمارا ہی بنایا ہوا قانون ہے جس کے سامنے ہر چھوٹا بڑا بغیر کسی قوم و ملت کے برابر سمجھا جاتا ہے اور جبھی ہر ہندوستانی کہتا ہے کہ اس انگریزی راج میں شیر اور بکری ایک جگہ پانی پی سکتے ہیں؟"

"سچ مچ تو یہاں کے قانون اور اپنے "ہوم" کے قانون میں فرق ہے؟" مسٹر راجرس نے مسکرا کر سوال کیا۔

اس پر تینوں انگریز جو کئی سالوں سے ہندوستان میں تھے ہنس پڑے۔ مسٹر بالکل سرخ ہو گیا۔

مس فوکس نے کہا "تمہارا مطلب کیا ہے؟ تمہارے خیال میں ہم میں اور "نیٹوز" میں کچھ فرق ہے؟"

"میرا مطلب یہی ہے کہ قانون ہندوستان میں چھوٹا بڑا یا اونچا نیچا نہیں دیکھتا میں اپنی طرف سے بلکہ سب انگریزوں کی طرف سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دل میں کبھی ایسے خیال نہیں آئے۔ ہم تو قانون سب کے لئے برابر سمجھتے ہیں"۔ بیرا ملنس نے کہا۔

اتنے میں سوشیل کمار گپتا ایک ہندوستانی آئی۔ سی۔ ایس بھی اس گروپ کے قریب آ نکلے اور ہیلو رابنسن کہکر میز کی طرف بڑھے۔

"دیکھو گپتا آپ نے مجھے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا اور خود جلدی چلے گئے"۔ راجرس نے شکایت کی۔

"میں بہت سویرے گیا تھا اور پھر میری فیملی بھی ساتھ تھی افسوس کہ آپ کو ساتھ نہ لے جا سکا۔ لیکن مجھ کو دو تین روز بعد پھر جانا ہے"۔

"آپ کہاں گئے تھے؟" رابنسن نے پوچھا۔

"کانسراؤ کی طرف۔ ہاں وہاں ایک گاؤں ہے چاندو والا۔ وہاں پر کل ایک عجیب واقعہ ہوا (مسٹر رابنسن) اور اسکے ذمہ دار رابنسن تم بھی ہو"۔

"میں؟" رابنسن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہؤا؟" مس فوکس نے سوال کیا۔
"ایک جوان لڑکی نے اپنے شوہر کے گھر کو آگ لگادی اور پھر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ میں گھس گئی۔"
"تو میں کس طرح ذمہ دار ہؤا؟" رابنسن نے مسکرا کر پوچھا۔
"تم نے دو عاشق و معشوق کو جدا کر دیا۔ آدمی کو جیل بھجوا دیا۔ لڑکی خود جل مری۔ گھر بھی ساتھ پھونک گئی۔"
"کون سا کیس؟" رابنسن نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔
"کہانی مجھ کو معلوم ہے کیس کی مجھ کو خبر نہیں" گپتا نے کہا۔
"مسٹر گپتا ضرور ساری بات سُنائیے" مس فوکس نے اشتیاق سے پوچھا۔
گپتا نے کہا کہ "مس فوکس کہانی بہت دلچسپ ہے ایک بڑھئی کی عورت کا ایک گڈریہ سے عشق تھا۔ جب بڑھئی کو خبر لگی تو اس نے مارا پیٹا۔ کچھ نہ ہؤا دونوں ملتے رہے۔ لوگ تو کہتے رہے تھے کہ وہ دونوں نہ چیتے سے ڈرتے تھے نہ شیر سے اور چھپ چھپ کر راتوں کو جنگلوں میں ملتے تھے۔ پھر بڑھئی نے اس کو اُس کے باپ کے ہاں پہنچا دیا وہاں اسکے رشتہ دارں نے مارا پیٹا، بند کیا، لیکن پھر بھی کوئی اثر نہ ہؤا اور وہ برابر چھپ چھپ کر راتوں کو جنگلوں میں ملتے رہے۔ آخر ایک دن وہ اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہردوار سے دونوں پکڑے آئے تب ایک مقدمہ قائم ہؤا۔ رابنسن صاحب کے ہاں لڑکا ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ ان دونوں نے پھر چھپ کر ملنا شروع کیا اور پھر بھاگ گئے۔ اب کے بمبئی جا رہے تھے کہ دہلی پکڑے گئے اب دو مقدمے قائم ہو گئے۔ ہمارے رابنسن نے لڑکے کو تین سال کی قید کر دی۔"
"اچھا ہندوستان میں بھی لوگ محبت کرتے ہیں؟" مس فوکس نے نہایت تعجب سے پوچھا

گپتا اور ٹام قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"قانون ہے جناب میں کیا کروں"۔ رابنسن نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا

"اوہ جیک!" مس فوکس نے تین سال کی ناامیدی کا بدلہ اپنی آواز میں بھر دیا۔

"میری بات ٹھیک ہے مارابنسن اگر گپتا کسی عورت کو لے کر بھاگ جائے تو تم یہی سزا دیتے؟"

"میرا نام کیوں لیتے ہو میری بیوی تو قریب ہی بیٹھی ہے۔ اپنا ذکر کرو۔"

"اچھا میرا ہی سہی۔ اچھا سچ بتاؤ رابنسن اگر میں اس مرد کی جگہ ہوتا تو تم یہی سزا دیتے (ٹھہر کر) اور فرض کرو تم اس کی جگہ ہوتے تو تم کیا مجھ سے یہ امید کرتے کہ تم کو یہی سزا دوں؟"

ٹام راجرس نے جو رابنسن کی عشقیہ ہسٹری سے بالکل ناواقف تھا یہ سوال کیا۔

"تمہیں مذاق کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ چلو اب اٹھو گے بھی یا رات یہیں گزارو گے۔"

زہرہ جبیں

پیدا ہوئی ہوش سنبھالا اور ابھی ہوش میں ہوں۔ اپنی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ شاید اس لئے کہ اپنی ذات سے زیادہ میں دنیا کی اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے سکی اور اس دلچسپی کی وجہ "غالباً" یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق میں انوکھے نظریے رکھتی ہوں۔ میں نے آج تک کسی چیز کے متعلق سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ میری افسانہ نگاری کی رفتار کبھی سست اور کبھی تیز رہی ہے۔ میرا ہر کام میرے موڈ کے ماتحت ہوتا ہے گو پینٹنگ کا مجھے جنون سا ہے۔ تاہم اگر موڈ میں نہ ہوں تو کئی کئی ہفتے میرے PAINTS پڑے سوکھتے رہتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ

I must Know Something about every Thing and every Thing about Something.

اسی خیال کے پیش نظر میں بیک وقت کئی فنون کی مشق کر رہی ہوں یعنی پینٹنگ، جرنلزم، افسانہ نگاری، کمرشل آرٹ وغیرہ۔ نتیجہ یہ کہ کوئی فن بھی کسی معیار تک نہیں پہنچا۔

رہی ہوں اور بی بی ہیں کہ مجھے گھورے جا رہی ہیں ——— یک نہ شد دو شد، یہ کلثوم بی بی
آ رہی ہیں، اختری بی خیر شانوں پر تو دوپٹہ رکھے ہوئے تھیں، چھوٹی صاحبزادی کے
ہاں سرے سے دوپٹہ ہے ہی نہیں اور تنگ قمیض میں کسی کسائی مٹکتی چلی آ رہی ہیں جیسے
حسن کے مقابلے میں شامل ہونے چلی ہیں۔ نگوڑی انگریززادیوں کی طرح۔ بھئی میرے تو کوئی
لڑکی ہوتی! نماز روزہ کی باتیں سمجھا کر یہیں پہلو میں بٹھائے رکھتی، مجال ہے جو اسکول
کالج کی ہوا بھی لگنے دیتی، پر شکر ہے کہ نہ کوئی اولاد ہوئی، نہ یہ ٹنٹا گلے پڑا ورنہ ———
کیا ہے، آخر ہے کیا جو تم اختری کو گھسیٹے لئے جا رہی ہو؟ تیتریاں؟ باغیچے میں تیتریاں پکڑو
گی تم؟ چودہ پندرہ برس کا سن اور تیتریاں پکڑنے چلی ہیں باغیچے میں سڑک کے کنارے،
اجنبیوں کے سامنے ——— مردود، آ لینے دو میاں جی کو، ایسا سبق پڑھاؤں گی
کہ قبر میں بھی بلبلا اٹھو گی ——— تیتریاں! ہنھ!

"نہیں نہیں" میں نے کہا۔ "ایسا نہ کہیے" مجھ موئی ماری کے لئے آپ اپنی جان
قربان کرنے چلے ہیں! آپ میرے بالوں اور آنکھوں کو پسند کرتے ہیں نا، تو میں بال
کُتر دوں گی اور اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گی، تاکہ آپ کے دل سے میری محبت مٹ جائے
اور آپ جئیں، صدیوں تک جیتے رہیں، اور میں بیشک اندھی لولی لنجی بھکارن بن کر
گلی کوچوں میں اپنی زندگی گذار دوں" ——— اور انہوں نے رو کر کہا تھا، اوہ، مرد
جب روتے ہیں تو کیسے عجیب سے لگتے ہیں بے چارے، انہوں نے رو کر کہا تھا "مگر میں
یہ دیکھ کر کیسے زندہ رہ سکتا ہوں، کہ تم میرے عقد میں نہیں آ سکتیں، صرف اس لئے
کہ میں نیا نیا وکیل ہوں اور میری آمدنی محدود ہے، رضو پیاری، تم ہی بتاؤ ایسی زندگی

سے کیا موت بھلی نہیں؟" ——— اور پھر بیاہ کی پہلی رات کو ہم کتنے ہنسے تھے اپنی ان بچگانہ سی باتوں پر، انہوں نے مجھے چنبیلی کے پھولوں تلے چھپا کر آنکھ مچولی کھیلنے کی ٹھانی، اور پھر کہنے لگے "! کہیں تم خوشبو بن کر ان پھولوں میں حلول نہ کر جاؤ، اور میں تمہیں ہواؤں میں تلاش کرتا پھروں" ——— ہائے ری کیسی کیسی عجیب سی اول جلول انگڑائیاں آ رہی ہیں مجھے!

پھر چلیں چھت پر اور دو بیٹے سیڑھیوں پر پڑے ہیں، اری نا ہنجارو، میں کہتی ہوں پڑے ہی ہیں کالج کے چھوکرے رہتے ہیں، ابھی چند روز کی بات ہے ان میں سے ایک چھوکرا افیون کھا کر چل بسا اور خط لکھ کر رکھ گیا۔ کہ فلاں صاحب کی فلاں لڑکی نے کسی دوسرے سے عشق کر لیا، اس لئے اس کی زندگی اب بیکار ہے، اخباروں میں نام چھپ گئے، اور اچھے اچھا کی پگڑیاں اچھل گئیں، یہ لڑکے یہاں شہروں میں پڑھنے نہیں آتے، دلہنیں ڈھونڈتے آتے ہیں ماں کے لاڈلے، اور پھر ایسی لڑکیاں تو انہیں خدا دے، جو چھت پر پڑی بھاگ رہی ہیں۔ اور چہک رہی ہیں اور اپنی عزتمند ماں کی ناک کو جڑ سے کاٹ رہی ہیں کمبخت میرے ہتھے چڑھ جائیں ایک بار، تو قسم ہے مرشدین کے ڈربے میں دھکیل دوں اور بیا جی کے آنے تک ان آفتوں کو وہیں چیخنے چلانے دوں، اور جب وہ آئیں ——— جب وہ آئیں ———

آتے ہی انہوں نے میرے سامنے ریشم کے کپڑوں کا انبار لگا دیا، اور کہا: "تم نے صرف عطر کہا، کسی خاص عطر کا نام نہ لیا! اس ملتے میں حنا، گلاب چنبیلی غرض جو

عطر بھی ملا اٹھا لایا۔ کیا حرج ہے اپڑا رہے، کبھی کام آئے گا'' ——— عطر کی بے شمار
شیشیاں، اور قسم قسم کے تیل اور غازے اور سنگ مرمر کا سنگار دان جس کی جالی جیسے
تاج محل کے معماروں نے تیار کی تھی، ۔۔ ——— کہاں رکھا ہے وہ سنگار دان ———
دوزخ میں جلے یہ موئی شبراتن، اس نے تو گھر بھر کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ یعنی یہ کیسی
عجیب بات ہے۔ کہ مجھے مرمر کا سنگار دان نہیں مل رہا۔ نہ الماریوں میں نہ مینٹل شیلف
پر، اس بکس میں کہاں ملے گا؟ یہاں تو کپڑوں کے انبار ہیں ——— ارے وہی ریشمی کپڑے
اور ——— وہی سنگار دان، ہائے ہائے کیسا بجھا بجھا لگتا ہے بیچارا، اس کی
جالی میں یہ گرد کیسی ہے، بند بکس میں غبار کیسے گھس آیا؟ ——— جھاڑن کہاں ہے،
شبراتن ——— اے شبراتن، اے جہنم جلی، میرا لٹسر کا جھاڑن کہاں ہے؟

دونوں کیسی چپ چاپ بیٹھی ہیں، موم کی مورتیں، چینی کی گڑیاں، گلاب کی کلیاں، کیسی
پیاری پیاری لگتی ہیں۔ جیسے بے چاریوں کو مسکرانا تک نہیں آتا۔ مطالعہ کرتے وقت انسان
کتنا سیدھا سادا سچا انسان بن جاتا ہے، کیسی منہمک ہیں، میں انہیں کیوں برا بھلا
کہتی رہی، میری مرحومہ نند کی لاڈلی بیٹیاں، ہائے، کیسا کیسا جی چاہتا ہے۔ کہ چپکے
سے جاؤں اور ان کے سفید سفید کنول کے سے ماتھے چوم کر ان کے پاس چپ چاپ کھڑی
ہو کر مسکرانے لگوں اور دلوں کا سارا میل دھل جائے، چونک نہ پڑیں، برا نہ منائیں!
مگر نہیں، وہ کتابوں میں بری طرح غرق ہیں، انہیں میرے قدموں کی آواز سنائی نہیں
دے رہی۔۔۔ ——— کیا چوموں، ماتھا یا گال، یا گردن ——— کیا پڑھ رہی ہو میری
بچیو؟ افسانے؟ افسانے پڑھ رہی ہو، عشق و محبت کی کہانیاں، کیسے رات کی خاموشیاں

میں جھلستے ہیں، کیسے سینماؤں میں ملاقاتیں ہوتی ہیں، کیسے کالجوں میں نظارہ بازی ہوتی ہے ـــــــ شرم نہیں آتی؟ و یدوں کا پانی ہی ڈھل گیا۔ چھپلیائیو! ہائے میں کیا کروں، کب آئیں گے میاں جی، یہ شیطانیں تو تباہی کے غار کی طرف لڑھکی جا رہی ہیں دن دہاڑے۔ وہ کب آئیں گے؟

جانے وہ کب آئینگے، کسی مُردار کے تبادلے پر کوئی پارٹی دی جارہی ہوگی، یا دفتر میں بیٹھے کاغذوں کے سمندر میں غرق ہوں گے، کیسا کیسا جی چاہتا ہے، کہ وہ ابھی ابھی آجائیں تاکہ میں ان آندھیوں سے پیچھا چھڑاؤں اور انہیں سمجھاؤں کہ آبرو کی قدر ہے۔ تو ان مصیبتوں کو اپنے گھر واپس بھیج دو، کہہ دو کہ یہاں چیچک پھیل رہا ہے یا ہیضہ پھوٹ رہا ہے، یا زلزلہ آنے کو ہے، ـــــ اور پھر جب یہ چلی جائیں اور شیرا تن بھی چلی جائے اور سڑک پر خاموشی مسلّط ہو جائے تو میں ـــــ میں انہیں بتاؤں ـــــ میں انہیں بتاؤں کہ میں نے لڑکیوں کو کہوں اتنی جلد واپس بھجوا دیا۔ اور جب بتا چکوں نا ـــــ جب یہ بتا چکوں ـــــ تو ان سے کہوں کہ وہ دیر سے نہ آیا کریں۔ اور اگر دیر ہی سے آنا پڑتا ہے۔ تو میونسپل کمشنری اور وکالت سب کو چھوڑ دیں اور یہیں بیٹھے رہیں، میرے سامنے، میری آنکھوں کے سامنے، ـــــ مگر نہ جانے وہ کب آئیں گے، کسی وقت بھی آئیں مگر آئیں ضرور شاید نہ ہی آئیں، شاید کوئی حادثہ ـــــ ہے ہے میری زبان جل جائے ـــــ یہ کیا کہہ دیا میں نے، کیسی خاموشی ہے! ارے کوئی بولو، شور مچاؤ، ناچو، کودو، سنتے ہو، سنتے ہو؟

سبحان اللہ، سونے پر سہاگہ اسی کو کہتے ہیں، شبراتن تمہارے ساتھ آئے
سینما گھر تک! واری جاؤں ان چونچلوں کے، یعنی اگر تم سینما نہیں دیکھو گی تو کیا
تمہارا کھانا ہی ہضم نہ ہوگا۔ نہیں، میں تمہیں سینما نہیں جانے دوں گی، جب تک
میاں جی نہیں آتے میں تمہیں اب چھت پر بھی نہیں جانے دوں گی، اختری دوپٹہ
سیدھی طرح اوڑھو اور اے کلثوم، بالوں کی یہ لٹیں کانوں کے پیچھے چھپی رہیں تو انسانیت
میں کمی نہیں آجاتی، ہوا سے تمہارا دوپٹہ بھی اڑ رہا ہے، ہم نے وہ زمانہ بھی دیکھا
ہے۔ کہ ادھر دوپٹہ سر پر سے ذرا سا سرکا اُدھر ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے لپکا - اور
دوپٹے کو ماتھے تک کھینچ لیا، صرف کھینچا ہی نہیں چپکا لیا، اور اب؟ اب تو لڑکیوں
کے اللے تللے دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، جب سے میں نے تمہاری
چہلیں دیکھنا شروع کی ہیں، خدا بخشے زرینہ بہن سامنے بیٹھی رو رہی ہیں بیچاری
تمہاری قسمتوں کو، سو میں نے ایک مرتبہ کہہ دیا کہ تم سینما نہیں جاؤ گی اور اگر جاؤ گی
تو پھر اس گھر میں نہیں آؤ گی، ہاں، مجھے سچی صاف سیدھی بات کہنے کی عادت ہے۔
میں لگی لپٹی نہیں اُٹھا رکھتی، بس میاں جی کو آنے دو۔ جاؤ باورچی خانے میں بیٹھ جاؤ۔
شبراتن سے کوئی کہانی سُنو سمجھیں، اور بھول جاؤ کہ اس شہر میں کوئی سینما گھر بھی ہے
بس میاں جی کو آلینے دو، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

آتے ہی ہوں گے، اب تو وہ آتے ہی ہوں گے، میرے ان کپڑوں پر یہ دھبے کہاں
سے آئے، ریشمی جوڑا ہی کیوں نہ پہن لوں، ہاں، ریشم بھی تو آخر پہننے ہی کے لئے

تنا جاتا ہے، اور وہ عطر، عطر کی شیشیاں کہاں ہوں گی، ریشمی کپڑوں میں عطر نہ لگا ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کاغذ کے پھول سونگھے جا رہے ہیں، اسے ہئے وہ کنگھی کتنی اچھی تھی، جو شبراتن کی بچی نے توڑ ڈالی اپنی جٹاؤں میں پھنسا کر، ادھر بالوں میں پھرتی تھی، ادھر لٹیں سانپوں کی طرح کنڈلیاں مار کر ننھے ننھے حلقوں کا جالا سا بُن دیتی تھیں، مگر سیدھے بال بھی تو اپنی جگہ حسین ہوتے ہیں، بالکل کرنوں کی طرح، یہ برآمدے سے کس کے قدموں کی چاپ آ رہی ہے، وہ آ گئے، آ گئے وہ، ہائے اری کتنی اداس ہوں اُن کے لئے، جیسے اُنہیں برسوں سے نہیں دیکھا، چپکے سے دروازہ کھول کر برآمدے میں چلی جاؤں اور پیچھے سے اُن کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دُوں، پہچان جائیں گے۔ فوراً پہچان جائیں گے مگر کیسا لطف آئے گا ——— اے! بدذاتو یہ جھریوں میں سے میرے کمرے کے اندر جھانک رہی ہو، غارت ہو جاؤ مُردودو، کیسی اکڑا اکڑا کر ہنس رہی ہو ملعونو ——— اور وہ میاں جی آ گئے، آ گئے میاں جی، میرا دوپٹہ کہاں ہے، اے میرا دوپٹہ کہاں گیا؟ اے شبراتن، اے رانی کی بچی، کہاں گیا میرا دوپٹہ!!!

سحاب قزلباش

مصنّف یا مصنّفہ کے قلم سے

انکشاف کتنا عجیب ہوتا ہے، — جیسے ہم حسین سے خواب دیکھ رہے تھے اور کسی نے چونکا دیا، — اگر میں اپنی صفتیں سُنانے لگوں تو مجھے محسوس ہوگا جیسے میں کسی بنگالی خاندان میں پیدا ہوئی ہوں، اور جب کوئی لڑکا لڑکی کو پسند کرنے آتا ہے تو وہ باقاعدہ اسی طرح سے سوال کرتا ہے — "تم کب پیدا ہوئیں؟ تاریخ یاد ہے؟ کہاں تک پڑھا ہے؟ خانہ داری کا شوق ہے؟ کیا کیا پکا سکتی ہو؟ گانا آتا ہے؟ گانے والوں میں تم کو کون زیادہ پسند ہے؟ ڈانس آتا ہے؟ کر کے دکھاؤ! گانا سناؤ! ہوں! آواز اچھی ہے! بالوں میں کونسا تیل ڈالتی ہو تاکہ ذوق کا پتہ چل سکے؟ کپڑے شوخ رنگ کے پسند ہیں یا سوفیانہ تاکہ طبیعت کی شوخی معلوم ہو جائے، زیور پہننے کا شوق ہے؟ کتنی زبانوں پر اچھی طرح سے عبور ہے؟ اور سینا پرونا جانتی ہو یا نہیں؟" —

اپنی اٹھارہ سال کی زندگی میں کیا کیا ہوا — اور کچھ بھی نہ ہوا — تین سال بیکاری میں گذر گئے، اس عرصہ میں کافی مواد ملا جو رفتہ رفتہ کام میں لاؤں گی۔ سب سے بڑی وجہ یہی ہے جس نے مجھے لکھنے پر اکسایا، اس عرصہ میں کئی دفعہ زندگی کو میں نے اتنا قریب سے دیکھا کہ مجھے دنیا سے نفرت ہو گئی۔ اکثر سوچتے سوچتے مجھے آنجہانی مشفق باباجان (آغا شاعر مرحوم) یاد آجاتے ہیں کتنی صحیح تھیں ان کی باتیں جب کبھی مجھے خاموش بیٹھا دیکھتے تو مسکرا کر فرماتے "بیٹیا ابھی تو تم کو دنیا میں رہنا ہے، ابھی تو تمہارا بچپن ہے، تم ابھی سے خاموش کیوں ہو؟ زندگی ابھی

کئی مسلسل رات اور دن آئیں گے جب انسان مجبور ہو جائے گا، اور خاموشی میں کتنے ہی دن ایسے گذر جائیں گے، تم بہت حساس ہو، اور اس دنیا میں ایسے آدمی کو جینا نہیں چاہیئے میرے پاس بھی ایک حساس دل ہے جس کا کچھ حصہ قدرت نے تم کو دیا۔ ظلم کیا میری بیٹی پر ——— اور وہ اداس سی نظریں آسمان میں گاڑ دیتے: ——— کہاں ہے ایسا نجومی ——— میرا حساس دل شاعر جس کی قدر اس دنیا نے نہ کی ——— مجھے اس دنیا سے کچھ بھی نہیں کہنا ہے اور نہ ہی اپنے بارے میں ؎

جنہوں نے رنگِ تبسم دیا زمانے کو
انہیں کچل دیا دنیا نے آزمانے کو

واقعی جینا بھی کتنی شدید بیکاری ہے!

(محترمہ سحاب آغا شاعر کے ایک خط سے اقتباس)

سحاب قزلباش

آگ جل رہی تھی

پروِر۔ او پروِر .... پروِر کی بچی کہاں ہے بھئی .... اللہ
میں نے جھنجلا کر رخسانہ کو چپکے سے کوسنا شروع کیا —— کمبخت میرے پیچھے ہی لگی رہتی
ہے —— مگر میں بھی تو اسی اندھیرے میں کھڑی ہوں اُف اللہ کس قدر سردی
ہے۔ میرے ہاتھوں میں فرائی پان کانپنے لگا۔ شاید سردی سے یا .... ڈر سے۔
مگر ڈر کس بات کا۔ میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا —— نہیں ...... میرے خیال میں
عزت میں بٹہ لگنے والی کوئی بات ہے —— پھر مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

آخر کوئی بات بھی ہے —— اسی کشتی رخسانہ کی۔ برابر ڈالی خانہ میں پپیتوں کے
پیڑوں کے جھنڈ میں کھڑی نبکارے جا رہی ہے۔ اونہہ بکے جائے میری بلا سے ......
...... یہ بات بھی تو ہے۔ دوسروں کی باتیں چھپ چھپ کر سننا بری بات ہے۔ یہ تو
معلوم ہے۔ مگر پھر بھی ایک عجیب سی خواہش تھی جو کروٹیں بدل رہی تھی۔ اکسا رہی تھی کہ

...... ان غریب نیچے طبقے کے لوگوں کی اندرونی دنیا کیسی ہوتی ہے؟ انہیں انکی محبت کی کتنی مقدار
ہے۔ کیا انکی محبت کے شعلے بھی کھو کھلے ہوتے ہیں۔ ذرا طوفان آیا اور ڈھے گئے اور پھر ایسے
نیست و نابود ہو جائیں جیسے یہاں عمارت تھی ہی نہیں۔ کسی کے خون آرزو میں گوندھی
ہوئی نیو پڑی ہی نہیں تھی ——— ذرا وقت پڑا اور صفاچٹ میدان۔ اتنی اونچی اونچی
رنگین عمارتیں۔ کہ بس آزمائش ہی ہیں ——— اڑا اڑا دھم جب آنکھ کھلے تو اپنے
چاروں طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار۔ ایسا گرد و غبار ——— جس میں ٹٹولتے ہی رہجاؤ
مگر راستہ نہ ملے۔ مجھے بے حد سردی لگنے لگی۔ فرائی پان میں اب انڈے کی زردی
زور زور سے سفید لیس دار پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی، ارے امی جان نے مجھے کب کا
بھیجا تھا کہ ان انڈوں کا آملیٹ بنا لاؤ ——— آج وہ پھر خدائی مارے آپا جان کے
لگے سگے آدھمکے کمبخت جتنا ہم پر پڑتی ہے۔

باورچی خانے میں منو کی ماں پھر زور سے ہنسی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ چھوٹی سی اینٹ
پر میں نے ڈرتے ڈرتے اچک کر دیکھا۔ اینٹوں کی جالیوں میں سے۔

آگ خوب تیز جل رہی تھی، دھڑا دھڑ لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کچھ چھوٹی چھوٹی
چھپٹیاں چرچرائیں اور بھڑک کر دھیمے دھیمے جلنے لگیں

چولہے کے سامنے منو کی ماں میلی سی چادر اوڑھے۔ آہستہ آہستہ بے انتہا
ہنس رہی تھی۔ سانولا رنگ اب بے حد سرخ ہو گیا تھا ——— چھوٹی چھوٹی
سی چندھی سی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میلا سا پانی۔ میرا جی متلانے لگا۔ آنسو کیسے
رستے رہتے ہیں ——— اور پھر ——— وہ لمبی ڈاڑھی والا خانساماں جو خیرے
... اس وقت اپنی چندھی بیوی کی آہستہ آہستہ باتیں کیسے مسکرا مسکرا کر

سن رہا تھا، پھر بھی کیسی پرسکون ہے ان کی صحبت۔ یہاں امی جان اور بابا جان کے تو نرالے ہی ڈھنگ ہیں۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ آپا بن ٹھن کر جانے کے لئے موٹر مانگنے بابا جان کے کمرے میں کیسے معصومانہ انداز سے داخل ہوتی ہیں۔ گھبرائی گھبرائی سی آنکھیں بنانی خوب آتی ہیں ——— حیران سی مسکراہٹ لئے ——— بابا جان مجھے آج موٹر چاہیئے۔ فلاں جگہ میٹنگ ہے۔ فلاں جگہ مشاعرہ ہے۔ آج کالج میں ڈبیٹ ہے۔ میں دیر سے آؤں گی ——— موٹر چاہیئے ——— مگر ہائے رے اس وقت کتنی معصوم سی لگتی ہیں۔ جیسے ڈرتے ڈرتے کسی بہت ہی اہم کام کو انجام دینا ہے اور جس میں باپ کی اجازت ضروری ہو ——— کیسی وفاباز ہیں اور جواب کے انتظار میں ساڑھی کے پلو کو انگلیوں سے کیسے زور زور سے لپیٹتی ہیں۔ جیسے ابھی پھاڑ ہی تو ڈالیں گی، اس وقت بابا جان مسکرا کر امی جان کو نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا کہہ جاتے تھے ——— اور امی جان مسکرا کر ——— محبت سے آپا جان کی دل ہی دل میں بلائیں لیتی ہوں گی ——— اس وقت میں اور رخسانہ پردے کے پیچھے جل ہی تو جاتے تھے ——— جیسے پھڑ پھڑ کرتی ہوئی چھپکلیاں۔ ہمارے سینے کے اندر جل رہی ہوں اور پھر دھیمے دھیمے جلنے لگتیں ———

خانساماں نے ایک بڑی سی لکڑی اور چولہے میں سرکا دی۔ آج منو کی ماں کتنی بڑی ہے۔ ابھی آٹا گوندھنا ہے ——— خانساماں نے مسکرا کر مطلبی انداز میں منو کی ماں کی طرف دیکھا ———

ہاں میں گوندھے لیتی ہوں۔ بیوقوف، خانساماں کے دھوکے میں آ گئی ——— ——— یہ مرد ——— ہر جگہ اپنی ہیکڑی جتاتے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے نوکر تم ہو

—— نام ہے میاں کماتا ہے۔ مگر اسے یہ خیال نہیں آیا کہ سردی ہے اور وہ بھی انسان ہے کیا آٹا گوندھتے ہوئے اسے سردی نہ لگے گی —— سردی —— مجھے بھی تو نہ جانے کتنی دیر سے لگ رہی تھی —— مگر —— کیا احمق پن ہے کہ باہر جاکے کھڑی اُن کی باتیں سن رہی ہوں۔ ادھر آملیٹ بھی تیار کروانا ہے —— رخسانہ بھی اب شاید اندر بھاگ گئی۔ اندھیرے باغ میں ڈر گئی ہوگی اور پھر شاید سردی بھی لگ رہی ہوگی۔ —— اتنے موٹے سوئیٹر میں بھی سرد سرد بگولے کلیجے میں کیسے لگتے ہیں —— اور یہ دونوں ہماری لکڑیاں کیسی بیدردی سے جلا رہے ہیں۔ کل ہی تو بابا جان نے نرسری سے کیکر کی سوکھی ہوئی پتلی پتلی لکڑیوں کا ٹھیلہ بھیجا تھا —— اور یہ ان نازک سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو کیسے جلا رہے ہیں۔ چڑ چڑ...... چڑچڑاتی ہوئی سلگ رہی ہیں —— سُنا ہے —— سوکھی کھوکھلی لکڑی میں آگ بڑی جلدی لگتی ہے —— اور جب لگ جاتی ہے تو بجھنی بھی بڑی مشکل سے ہے —— وہ بھڑکنا جانتی ہے —— سلگنا نہیں —— اور گیلی لکڑیاں چاہے کتنا ہی جلاؤ سُلگتی رہتی ہیں بھڑ بھڑا کر نہیں جلتیں —— جیسے آپا جان سوکھی لکڑی کیکر کی نازک سی۔ اور پڑھ پڑھ کر شاید کھوکھلی بھی ہوگئی ہوں —— ذرا سی گرمی پہنچی اور...... رخسار سُرخ انگارہ سے، ہونٹ جلتی ہوئی آنکھیں —— پھر کہاں آپا جان تھیں بھڑ بھڑ جلنے —— چڑچڑاتی تک نہیں —— اسی پر ماں باپ ہیں نہال نہال۔ اور نہ جانے آپا جان کو دیکھ کر مجھے کیوں جلن سی ہونے لگتی ہے۔ جیسے آگ سلگنے لگتی ہو...... ...... دھیمی دھیمی جس کا دھواں دم گھونٹے لیتا ہو...... چڑچڑ...... روشنی اور بھی تیز ہو جاتی۔ چولھے کی لپک دیوار پر آگ کی روشنی سے کانسامان اور خانساماں کے سائے اور بھی

بڑے بڑے ہو جاتے ۔ امنہ چڑاتے ہوئے میلی کچیلی دیوار پر سنہری سی روشنی پھیل جاتی جس میں مکڑی کے جالوں میں چھوٹے چھوٹے مکڑیوں کے بچے بےخبر پڑے سو رہے تھے۔ آگ کی گرمی سے —— ورنہ شاید باریک سے جال میں انہیں سردی سے نیند بھی نہ آتی۔ . . .

"منو کی ماں میں نے گرم پانی کر دیا۔ لے اب تو ذرا جلدی ہاتھوں آٹا گوندھ۔ تو میں ذرا بیڑی پی لوں" ————

میں نے پھر ایک گرانیٹ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر سے دیکھا ————

چندھی سی آنکھیں . . . . . مسکرا رہی تھیں "اے منو کے باپ تم نے کیوں گرم پانی کیا کیا میں نے سردی میں کبھی کام نہیں کیا" وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا۔ تھا۔ پانی آنکھوں سے اور بھی رسنے لگا۔ جیسے اب آٹے میں ٹپک ہی تو پڑے گا۔

اوہ۔ میں جھلا اٹھی کمبخت کتنی گندی ہے اس رستے ہوئے پانی سے گندھے ہوئے آٹے کی ہم روز روٹی کھاتے ہیں۔ توبہ۔ میرا جی متلانے لگا۔ اب تو اندر جانا ہی پڑے گا میں نے چپلوں کو زور زور سے مارتے ہوئے زمین پر چلنا شروع کیا ————

"ارے آج پرور بی بی کیسے آگئی؟ اور پھر اس سردی میں"! خانساماں نے اپنی آنکھوں سے رستے ہوئے پانی کو میلی چادر سے پونچھتے ہوئے خوشامدی لہجے میں کہا ——

"ارے آپ نے منو کی ماں کو آواز دے لی ہوتی اوپر سے ۔ آخر یہ کس لئے ہے۔ اور وہ لطیف کہاں مر گیا" ———— خانساماں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ——

"وہ موٹر صاف کر رہا ہے۔ جلدی سے آملیٹ تیار کر دو اور کھانا بھی۔ بیگم صاحبہ کہیں باہر جانے والی ہیں۔ کھانا جلدی چاہئیے" میرے ہاتھ اب ہلکے ہو چکے تھے۔ ہماری سافرانی پان اب تیز تیز بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں گھرا ہوا تھا جلتے ہوئے گھی میں

انڈے کی زردی اور سفیدی اور گلابی گلابی پیاز کیسی شور مچا رہی تھی چھن چھن چھن چھن جیسے رات کے گیارہ بجے جاڑے کی خاموش راتوں میں جب گھر بھر بے خبر سو جاتا ہے اور اندھیرے کمرے میں چپکے سے ریڈیو کھول دیا جائے اور اس وقت قسمت کی خوش نصیبی سے مدراس آرکسٹرا بج رہا ہو۔ اور سب کی نیند کا خیال کرتے ہوئے صدا بہت ہی کم کر دیں اس وقت، بالکل ایسی آوازیں بھنچی بھنچی سی آتی ہیں جیسے اس وقت فرائی پان میں سے آ رہی تھیں ——— انڈے کی زردی اب گول دائرے میں پھیل گئی تھی۔ جیسے چھوٹی سی ٹکیہ —— جس کے کناروں پر سفید لیس دار سا پانی پھول پھول کر پوڈر کی صورت میں جم گیا تھا ——— میں نے جھک کر کیکر کی ایک سوکھی ہوئی نازک سی ٹہنی چولہے میں جھونک دی ——— چڑچڑ ۔ ایک چھوٹی سی سوکھی ہوئی شاخ چیخی اور پھڑ پھڑ کرتی ہوئی تیزی سے ٹہنیاں جلنے لگیں ———
جیسے آپا جلی بھنی جا رہی ہوں ——— مجھے خوشی سی ہوئی
جیسے سلگتی ہوئی لکڑیوں پر کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ مگر اُف یہ کڑوا کڑوا دھواں
دھیما دھیما ...... جیسے سانس سا گھٹ رہا ہو ———

"پرور .... پرور ..... جلدی آملیٹ لاؤ ......
کتنی دیر لگا دی" .... آپا سیڑھیوں پر کھڑی چیخ رہی تھیں۔ اُدھر میں پھر سلگنے لگی ——— بڑی نواب زادی ہیں نا جو حکم چلا رہی ہیں۔ ہم ہی نوکر رہ گئے ہیں جو اس سردی میں مریں آکر ——— اور وہ رخسانہ بھی مزے سے آتش دان کے پاس گرمی میں بیٹھی پڑھ رہی ہوگی۔ میرا بھی تو ٹیسٹ ہے ——— مجھے ہوش

آیا —— کتنی لاپرواہوں۔ کل کیا خاک لکھوں گی جا کر وہاں، بھاڑ میں جائے
سب کچھ "منو کی ماں تم دے جانا اور کھانا بھی جلدی سے" چولھے میں بڑی تیز آگ جل
رہی تھی اور مجھے اس اندھیرے میں سردی میں ابھی اوپر جانا ہے۔ میں نے جمپر کو خوب لپیٹ
لیا اور تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ کتنی جلدی چڑھ گئی تھی۔ کمرے میں پردوں کے
پیچھے کوئی سسکیاں لے رہا تھا۔ اندھیرے میں پردے کے پیچھے گرم ساحل میں ڈر گئی

"کون! رخسانہ! ارے تم یہاں کیوں چھپی رو رہی ہو" ——

خاموش —— اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ اور کان کے پاس منہ لاتے
ہی اُن پر دوبارہ رقت طاری ہو گئی۔

"ارے کچھ کہو گی بھی" میں پھر سلگنے لگی ——

"آپا نے مجھے آج پھر ڈانٹا۔ —— پرویز بھیا کو ایک منٹ اکیلے نہیں چھوڑتی
جب وہ یہاں آجاتی ہیں —— کالج میں تو نہ جانے کیا حال ہو گا۔ کتابیں بغل میں دبائے
پھرتی ہوں گی کہ کہیں ان کے شربتی آنکھوں والے کو کوئی ان ہی جیسی بے صبری اچک نہ
لیں۔ اونہہ وہ غریب تو ننھے سے دودھ پیتے بچے ہیں نا، اتنی بھی کیا محبت جو تکی ہی پڑتی
ہے اور کوئی تو جیسے بھوکا ہے۔ اونہہ اتنی کس قدر رہیں۔ ابھی تو خیر سے شادی بھی
نہیں ہوئی اور ...... وہ .... وہ۔ پرویز کیسے۔ آپا کے سامنے آتے ہی کیسے
بھیگی بلی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ نگاہیں تک نہیں اٹھاتے۔ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔
جہاں اوجھل ہوئی اور جیسے کینچلی بدل ڈالی رخسانہ تم خاموش کیوں ہو۔ کیا خفا ہو۔ تمہارے
بال کتنے سنہری اور ملائم ہیں اور پھر میرے بالوں میں اپنی لرزتی ہوئی انگلیاں کس بے
تکلفی سے پھیرنے لگتے ہیں۔ جیسے ان کا واسطہ اب شاید آپا سے پڑے گا ہی نہیں۔ مگر

آپا کی پرچھائیں نظر آئی، اور کیسے بدل گئے جیسے یہ ہیں جانتے ہی نہیں۔ نہ جانے کیا عادت ہے۔ اف اللہ" —

وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اسکے ٹھہرے ہوئے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ میں حیران تھی کہ آخر آج یہ کیا بک رہی ہے۔ اس کا ہاتھ یا چہرہ کتنا گرم ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر لگا شاید بخار ہو گیا ہے ——— آخر تم کب تک اس پردے کے پیچھے کھڑی رہوگی میں نے جل کر کہا۔ تم کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ شاید سردی لگ کر اور غصے سے بھی۔ غصہ! وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسکی کھلی ہوئی آنکھوں سے مجھے آگ کی گرمی محسوس ہوئی چمک دار تیز سی آگ کی روشنی۔ جیسے باریک سیاہ پردوں کے نیچے آگ کے شعلے دہک رہے تھے۔ سچ مچ سُلگ رہی تھی بیچاری مجھے رحم آ گیا ——— ساتھ ہی مجھے اپنا بھی خیال آیا ——— مجھے بھی تو نوکر سمجھا تھا۔ اتنی سردی میں نیچے خانساماں کے پاس بھیجا۔ پرویز کے بچے کے لئے آملیٹ بنوا لاؤ جب تک ان کے حلق سے دو تین سالن نہ اتریں کھانا تھوڑی کھا سکتے ہیں۔ نواب زادے........ ہم دونوں اپنے کمرے میں لیمپ کی روشنی میں سُلگ رہے تھے۔ سردی میں ———

امی جان، بابا جان سینما نائٹ شو گئے ہوئے تھے ـ ـ ـ ـ اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں اکیلے کمرے میں سلگتی ہوئی آگ آنسوؤں سے بجھا رہے تھے۔ آتش دان پہ آپا جان اور پرویز بھیا نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اب میں سمجھی رخسانہ۔ میں نے جلتے ہوئے کہا۔ تم کو کیوں اٹھایا تھا وہاں سے۔ کیونکہ ان کو بھی سردی لگ رہی تھی اور تم کو وہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ سمجھیں"

رخسانہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے آپا کی دبی دبی ہنسی

کی آواز آرہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا ــــــ شاید رخسانہ کا بھی دھڑک رہا ہوگا۔ مگر چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ میں نے اشارہ سے کہا "چل دیکھیں" اُس نے سر ہلا دیا "نہیں" ــــ "اوہو ــــ جب تو جناب چھپی کھڑی تھیں پردے کے پیچھے اور اب میں نے جب کہا تو ــــ نخرہ۔ جاؤ۔"

میں نے چپکے سے پردے میں سے جھانکا۔ آتشدان میں خوب تیزی سے سوکھی ہوئی کیکر کی لکڑیاں جل رہی تھیں ــــ بھر بھر ــــ آپا نیلی شال اوڑھے چپ رہی تھیں سُرخ رُخسارے۔ انگارہ سے کانپتے ہوئے ہونٹ، جلتی ہوئی آنکھیں اور یہ کمبخت پرویز لیلیا کس غضب کے خوبصورت لگ رہے تھے نیلے سوٹ میں سرخ چہرہ ــــ آگ کی روشنی میں کیسا سُرخ ہو گیا تھا۔ ــــ بھوری بھوری آنکھیں جیسے اب رو ہی دیں گی۔ ابھی تو ہنس رہے تھے دونو ــــ مگر اب کیا ہو گا۔ جیسے اب دونوں چیخیں مار کر رو دیں گے مجھے ڈر لگنے لگا۔ اکیلے ٹھیک نہیں ــــ میں آہستہ سے رخسانہ کے پاس آئی کیسے بے خبر کرسی پر ٹانگیں چڑھائے کہنیاں میز پر ٹیکے کتنے غور سے جلتے ہوئے لیمپ کو دیکھ رہی تھی "رخسانہ ــــ رخسانہ" وہ چونک پڑی "کیا ہے" وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ خالی خالی نظریں ــــ حیران گھبرایا ہوا معصوم سا چہرہ ــــ میں ہنس پڑی "پگلی کیا ہوا تجھے ــــ؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔

"تو چلو آپا کو دیکھو کیسے بیٹھی ہیں نیلی نیلی شال میں سفید سا ماتھا۔ سُرخ سے عنابی ہونٹ۔ کالی کالی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔ سیاہ چمکدار بال کیسے کر رہے بکھرے ہوئے ہیں اور دیکھنا رخسانہ" میں سردی سے بے چین ہو کر اسکی کرسی میں بیٹھ گئی۔

دیکھنا رخسانہ پرویز بھیا بھی اتنے خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں کہ میں کیا بتاؤں۔ میں
نے حلق کا پانی نگلا۔ ان دونوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو ایک رنگ کے کپڑے
پہنتے ہیں"۔
رخسانہ تعجب سے بولی "واہ اس میں کیا بات ہے ایک روز پہلے کہہ جاتے ہوں گے"
"ہوں" ——— وہ پھر خاموش نظروں سے جلتے ہوئے لیمپ کو گھورنے لگی ——
"اوہو...... یہ اتنی لمبی ہوں کس سلسلہ میں؟" میں نے منہ چڑاتے ہوئے رخسانہ کو
دیکھا۔ مگر وہاں صرف سنجیدہ مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ تو یہ میرا دل گھبرانے لگا "یہ کیا
مصیبت ہے۔ جو ہے وہ روئے دیتا ہے منحوس شکلیں۔ چلو آپا اور پرویز بھائی کو دیکھیں"
"اونہہ کیا دیکھیں" وہ جھلائی "بہت دیکھ لیا۔ پرویز بھیا۔ آپا کو بھی بہت کچھ دیکھ
لیا پرویز بھیا ——— کی سفید سفید انگلیاں آپا کے سیاہ چمکدار بال کمر پر
بکھرے ہوئے" ——— وہ ایک دم خاموش ہو گئی —— جیسے نیند میں بڑبڑا رہی
تھی۔ حیران نظریں جلتے ہوئے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں۔ پتھرائی سی میں حیران سی کھڑی تھی
شاید اسے معلوم نہ تھا کہ میں اسکے پاس کھڑی ہوں۔ وہ پھر بڑبڑائی۔ "ارے آپا کی طرح
یہ بھی سوکھی کھوکھلی ٹہنی ہے" وہ چڑچڑائی۔ اور رخسار سرخ ہو گئے ہونٹ انگارہ سے ہو گئے
جلتی ہوئی آنکھوں سے پانی رسنے لگا۔ موٹے موٹے آنسو جلتے ہوئے ——— جانے
کیوں۔ میں بھاگی ہوئی پردے کے پیچھے گئی۔ مگر آتشدان کے پاس اب کوئی بھی نہ تھا۔ پرویز
بھیا چلے گئے تھے۔ آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ آتشدان کے پاس پہنچ
گئی۔ آپا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور دروازے بند تھے آپا کے کھانسنے کی آواز آہستہ
آہستہ دروازوں سے ٹکرا رہی تھی ——— مجھے سردی پھر زور سے لگی۔ جلدی

اکیلی آتش دان کے پاس بیٹھ گئی۔ سوکھی ہوئی کیکر کی ٹہنیاں آگ میں سرکا دیں بھڑ بھڑ .... پھر وہ ٹکنے لگیں چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں چڑ چڑائیں۔ اور پھر خوب تیزی سے آگ جل رہی تھی .... چڑ۔ چڑ ....

سرلا دیوی

میرا ہمیشہ سے یقین ہی نہیں بلکہ ایمان رہا ہے کہ ایک فن کار کی ہستی کے کسی نامعلوم گوشہ میں دو تار ضرور ہوتے ہیں۔ ایک نغمہ اور دوسرا درد۔ بغیر ان دونوں کے تخلیق کا امکان میرے نزدیک ناممکن ہے۔

میرے وجود کا شیریں ترین احساس یہ ہے کہ میں عورت ہوں اور میری زندگی کی تلخ ترین ٹریجیڈی یہ ہے کہ میں اس صنف سے ہوں جو صدیوں سے غلام رکھی گئی ہے میری حیاتی زندگی کا مرکزی نقطہ یہی ہے اور اس لئے میرا فنی محور اسکے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اب پیدا ہونے والے تمام ادیب کرشن چندر کے فن کے کسی نہ کسی پہلو سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکیں گے۔ گو اُن کی جدتِ طبع اور جولانیٔ تخیل اُن کے فن میں اُن کی انفرادیت کو یقیناً نمایاں کرے گی۔

مجھے کرشن کی ترنم خیز رنگیں بیانی اور مہندر ناتھ کی سادا۔ بے تکلف۔ مگر تلخ طرزِ ادا نے ہمیشہ اس درجہ متاثر کیا ہے کہ ان دونوں ادیبوں کے طرزِ ادا کے امتزاج میں مجھے ایک ٹھوس ادبی طرزِ ادا کی ایجاد نظر آتی ہے۔ بیدی ہمیشہ اپنے شیریں دھاگوں کو سنجیدگی کی سنگلاخ چٹانوں میں چھپائے رکھتا ہے اس لئے اسکے ادب کی شیرینی سے فیضیاب ہونا جوئے شیر والا معاملہ نظر آتا ہے۔

میرا ناول لکھنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں، کیونکہ مجھے مختصر افسانوں سے زیادہ کوئی

چیز پسند نہیں۔ ان میں اظہار کی سہولت۔ بیان کی شدت اور اثر کی تیزی مجھے ہمیشہ اپنی
طرف کھینچتی رہی ہے۔ میرے تجربات میں تسلسل نہیں۔ زندگی کے منظر مسلسل کا میں نے
نظارہ نہیں کیا۔ میں نے بعض زندگی کا وہ تنگ خطہ دیکھا اور پہچانا ہے جو شاید ہندوستانی
عورت کو اسکے جسمانی وجود کی رعایت سے دیا گیا ہے ورنہ وہ اسکی بھی مستحق نظر نہیں آتی۔

میری زندگی کا محور اور محیط میرا گھر ہے۔ حادثات اس میں اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے
ہندوستانی گھروں میں ہوتے ہیں۔ گو میں ایف۔ اے کی کتابیں کھولے بیٹھی رہتی ہوں
مگر میرا ذہن اس زندہ تعلیم کے حصول میں مشغول رہتا ہے جو اپنی اور اپنے گرد و نواح کی
زندگی کے شعور سے پیدا ہوتی ہے اور یہ شعور، یہ احساس کسی طرح بھی قابلِ رشک نہیں ہے
کیونکہ غلام رہنا کون چاہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ چلنا کسے پسند نہیں!

سرلا دیوی

سرلا دیوی

کلنک

شمشان میں مٹی کے بیکار تودوں کی طرح تمام قصبہ دوپہر کی گرمی میں خاموش پڑا لرز رہا تھا۔ آشا اپنے مکان کی سب سے اونچی چھت پر بیٹھی ہوئی افق تک پھیلے خشک ٹیلے کھیتوں میں ناچتے بگولوں کو دیکھ رہی تھی۔ قصبہ کے ایک کونے پر آسمان میں بہت سے چیل کوّے منڈلا رہے تھے اور وہاں سے ڈھول نقاروں کی گھٹی گھٹی آوازیں کبھی کبھی ابھر کر سنائی دے جاتی تھیں۔

"آج رمیش کی شادی ہے۔ ان منڈلاتی چیلوں کے نیچے وہ نوشہ بنا بیٹھا ہوگا" ——— آشا نے ادھر سے منہ ہٹا لیا۔ سورج کی گرمی سے پیپل کے پتے مرجھا کر مُردوں کی ہتھیلیوں کی طرح اداس لٹک رہے تھے اور پیڑ پر ایک کوّا زور زور سے کائیں کائیں کر رہا تھا "پٹ"۔ ——— یکایک مٹھائی کا ایک ٹکڑا آشا کے سامنے چھت پر آ گرا۔ اور ایک چیل فوراً ہی جھپٹ کر اسے اڑا لے گئی" رمیش کی شادی کی مٹھائی کا ٹکڑا" ——— اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں آشا کو محسوس ہوا کہ اُس کے سینے میں ہلچل

کے ہلکے ہلکے بگولے چکرا رہے ہیں اور پسینے چیونٹیوں کی طرح جسم پر رینگ رہے ہیں
"اسے تیرے تو پیٹ میں بچہ ہے" ——— پیپل پر کائیں کائیں کرتا کوا ڈاکٹرنی کے
الفاظ کو وحشت از بام کر رہا تھا۔ "ہاں میرے پیٹ میں بچہ ہے جس کا تعلق اس مٹھائی
کے تلڑے کی طرح رمیش سے ہے" ——— یکایک آشا کا کلیجہ ایک بھیانک تخیل کی دھمک
سے دہل اٹھا۔ "ابھی تک بچہ کی بات کوئی نہیں جانتا۔ مگر کل جب ...." اور
پسینے کی موٹی بوندیں ننھے آبلوں کی طرح اسکی پیشانی پر چھلک آئیں ....
اور اس رات جب جاڑا کہرے اور دودھیا چاندنی میں گھل کر لان پر اوس کے قطروں میں
ڈھل رہا تھا۔ اور نارنگی کے جھنڈوں میں چٹختی ہوئی کلیوں نے اپنی خوشبو سے فضا میں
خاموش جھنکاریں پیدا کردی تھیں گو رات رانی کے کنج کی اوٹ میں وہ رمیش کے
آغوش میں پڑی تھی .... اب وہ سوچ رہی تھی۔ اس رات کے نیلے کہرے اور ان
چکراتے بگولوں میں۔ اس رات کی خنک چاندنی اور اس چلچلاتی دھوپ میں۔ لان
کی تازہ اوس اور پیشانی کے ان پسینوں میں۔ اس رات کی شرابی دھڑکنوں اور کلیجہ
کی اس دہل میں کتنا بھیانک فرق ہے۔ ان دو حدود کے درمیان اسکی زندگی نے کس
قدر بھیانک کروٹ لی ہے۔ آشا کا سر چکرا اٹھا۔

اس رات رمیش کے پاس سے آنے کے بعد تمام رات وہ ایک انجان لذت
ایک ناقابل برداشت نشہ کی وجہ سے سو نہ سکی تھی۔ ذہن پر نشہ آور خواب کہرے
کی طرح چھائے ہوئے تھے، مگر سویرا ہوتے ہی اس نشہ کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ لان
میں اسی رات رانی کے کنج کے قریب محلے والے جمع تھے۔ "کہیں رات کا ماڑ کسی پہ

افشا تو نہیں ہوگیا؟ ——— مگر ایک بچہ کی چیخ نے اسے سہارا دیا۔ کمرے سے باہر آکر اس نے دیکھا ——— لان کی ہری گھاس پر ایک نوزائیدہ بچہ ننگا پڑا بلک رہا تھا اور خون اسکے گرد لال چیتھڑوں کی طرح پڑا تھا۔ "ارے اس حرامزادی کو اپنا کلنک پھینکنے کے لئے یہی جگہ ملی تھی"۔ اسکی ماں بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ کوئی عورت اپنے نوزائیدہ بچہ کو لان پر پھینک گئی تھی۔

"اجی دیکھئے۔ بچہ کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ جسم سے لپٹا ریشمی رومال یہی ظاہر کرتا ہے"۔ اسکے والد کہہ رہے تھے اور محلے کے پنڈت جی رام نام پڑھ کر اعلان کر رہے تھے۔

"اجی یہ آج کل کے لڑکے لڑکیاں پڑھ کر اور سیکھتے ہی کیا ہیں؟ یہ انگریزی تعلیم ..."

اور کلنک کا نشان پڑا چیخ رہا تھا۔ لیکن یہ بچہ آخر اس طرح پھینکا کیوں گیا؟ کیا اس کی ماں کے سینے کا دودھ خشک ہوگیا تھا؟ کیا اسکے باپ کے پاس پرورش کے لئے پیسے نہ تھے؟ کیا اس بچہ کی معصومیت پھینکتے ہوئے ہاتھوں کو اسے سینے سے لگا لینے کے لیے مجبور نہ کرسکی؟ ——— آشا کے ذہن میں ایک ساتھ یہ سوالات اُمڈ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں لال پگڑی والے سپاہی آگئے اور بچہ کا بڑے غور سے معائنہ کرنے لگے۔ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پولیس والوں کی رہبری کرنے والے ساٹھ سال کے سیٹھ ہری چند کہہ رہے تھے۔ "بچہ کو غور سے دیکھئے .... باقی یہ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں........"

اور غیر شعوری طور پر آشا کے دل میں آیا کہ ان تمام آدمیوں کے منہ نوچ ڈالے اور ناک پر انگلیاں رکھ کر آنکھیں مٹکاتی عورتوں کی پتلیاں نکال لے۔ "تنقید اد شیپو کماشی

کے بجائے یہ لوگ اس بچہ کو کیوں نہیں اُٹھا لیتے۔ اور یہ سیٹھ جی ......" آشا کا تمام غصہ ان سیٹھ جی پر برس پڑا۔ "آخر یہ سیٹھ جی اس بچہ کو اٹھا کر گھر کیوں نہیں لے جاتے؟ خاندان چلانے کے لئے یہ ایک لڑکی اگلے مہینے خرید کر لا رہے ہیں۔ کیا یہ بچہ انکے خاندان کو نہیں چلا سکتا؟ کیا مستقبل قریب میں ان کی موت کے بعد اس لڑکی کی تا عمر ہو گی ہی ان کے خاندان چلانے کے لئے ضروری ہے؟" آشا کے خیالات ایک لمحہ کے لئے اس نوجوان لڑکی کی طرف منتقل ہو گئے جس کو بیاہ کر سیٹھ جی لانے والے تھے، ماں باپ کے دروازے بند پا کر بھوک، عصمت دری اور موت کے دہانے کھلے پا کر وہ لڑکی خود کو سیٹھ جی کی آغوش میں ڈال دے گی۔ تب ایک طوائف کی طرح وہ اپنا بدن ان سیٹھ جی سے کچلوائے گی۔ انکی دھندلی آنکھوں میں اپنے جذبات کی ننھی لو کو ہمیشہ کے لئے بجھا دے گی۔ اسکی آرزوئیں اس ناجائز بچے کی طرح ہمیشہ کے لئے ممنوعہ اور ناجائز قرار دے دی جائیں گی۔ ان حالات میں پیدا ہونے والا بچہ کیا "جائز" کہلانے کا حق دار ہوگا؟ کیا وہ بچہ پھر ناجائز نہیں ہوگا؟ اسکی ماں اس بچہ کی ماں کی طرح کلنکنی اور باپ بدمعاش نہیں ہوگا؟ محض اسلئے کہ پنڈتوں اور کمبنوں کو چند آنے رشوت کے مل جائیں گے وہ بچہ جائز ہو جائے گا —— آشا کا چہرہ انگاروں کی طرح دہک اٹھا۔ بچہ اب روتے روتے تھک گیا تھا۔ صرف سردی سے ٹھٹھر کر کبھی کبھی سسک اُٹھتا تھا۔

پولیس والے لوٹ گئے اور اپنے ساتھ یتیم خانے والوں کو لے کر دوبارہ آپہنچے یتیم خانے والوں نے بچے کو ایک کمبل میں لپیٹا اور اُٹھا کر لے جانے لگے۔ آشا کے جی میں آیا وہ زور سے چیخ پڑے۔ بچہ اب یتیم خانے میں پلے گا ...... وہیں بڑا ہوگا۔ اور جب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ بھنڈے کے ساتھ گا سکے اور راہگیروں سے بھیک مانگ

سکے تب اسکے سر پہ پیلی ٹوپی منڈھ دی جائے گی۔ نازک کندھوں پہ بینڈ کی پیٹی چڑھا دی جائے گی۔ ہاتھ میں مقفل صندوقچی پکڑا دی جائے گی اور تب شہر کی سڑکوں پر قصبوں کے محلوں میں بینڈ بجا کر وہ گاتا پھرے گا۔ "یہ غم کی کہانی ہے سن لیجیے" "اے سیٹھ جی ایک پیسہ" "اے سائی ایک پیسہ" "اجی حرام خوروں سے محنت مزدوری کرکے پیٹ بھرا نہیں جاتا" لوگ کہتے گذر جائیں گے اور شام کو جب وہ منیجر کے سامنے خالی ہاتھ لوٹے گا۔ تو اسکی روٹی بند کر دی جائے گی "پیسہ مانگا بھی نہیں جا سکتا ۔ جاؤ آج کی روٹی بند"۔

—— کھڑے کھڑے آشا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے! انسانیت کے ایک جز کو ایک نفس کو آج ناجائز کہکر فقیر اور گداگر بنایا جا رہا ہے۔ کل فقیر اور حرامخور کہکر ٹھکرایا جائے گا اور پرسوں وہ تمام رات بھوکا تڑپ کر کسی کو پکارنا چاہے گا۔ مگر کسی کو قریب نہ پاکر خود ہی روتے روتے سو جائے گا۔ اور پھر صبح کو —— "ہم انا تھہ یتیم ....."

اس رات جب اسکی ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو وہ خود کہنے لگی "ان دونوں کا کیا بگڑا۔ اگر کچھ بگڑا تو ننھی سی جان کا۔ لڑکے نے کہیں شادی کر لی ہو گی۔ لڑکی رو پیٹ کر بہانے بنا کر شادی کر لے گی اور بس —— مگر ماں کا کلیجہ بھی تو اس بچہ کو پھینکتے وقت پتھر کا ہو گیا تھا —— عورت نہیں کوئی چڑیل ہو گی"۔ اور آشا نے بھی سوچا یہ تمام قصور اسی عورت کا تھا۔

ایک دن اسکول جاتے اس نے دیکھا۔ سڑک کے کنارے تین چار بچوں کے درمیان ایک بھکارن پڑی چلا رہی تھی "میم صاحب ایک پیسہ" "رانی صاحب ایک پیسہ" آشا جل اٹھی "اگر بھوکی مرتی ہے تو بچے کیوں پیدا کرتی ہے بے شرم" مگر وہ صرف ایک بھکارن

تھی ——

"رانی صاحب۔ میرا آدمی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ان بچوں کی محبت مجھے تو تھی۔ اُن کو چھوڑ کر مزدوری کرنے کیسے جاتی۔ ابھی جسم پہ جان بس ہے۔ لوگ جاتے جاتے روٹی دے جاتے ہیں اور ساتھ میں ایک بچہ بھی۔" آشا نے غور سے دیکھا —— چیتھڑوں سے اس کا ابھرا ہوا پیٹ جھانک رہا تھا۔ "ارے کیا تیرے بچہ ہونے والا ہے؟" شیلا چونک اٹھی۔

اور پھر وہ تمام دن سوچتی رہی اس لغو مہمل فقرہ کے معنی —— 'ماں کی محبت'، 'ماں کا کلیجہ' —— آدمی کے دھوکا دے جانے پر اس عورت نے بچے کو لان میں پھینک کر بہت ہی اچھا کیا، وہ بیچاری کہاں تک ان ذلیل آدمیوں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ جب یہ محبت کرتے ہیں تو اس کا ثمر ایک ناجائز بچہ۔ جب یہ رحم کھا کر ایک غریب ماں کو روٹی دیتے ہیں۔ تو اسکی قیمت ایک بھکاری بچہ —— آشا بہت عرصہ تک سوچتی رہی، یہ ذلیل غدّار انسان کس وقت تک اپنی ہی نسل کو طوائفوں فقیروں اور یتیموں میں تبدیل کرتا رہے گا۔

آشا کو وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ بنگال گئی تھی۔ قحط پورے زوروں پر تھا سینکڑوں مائیں طوائفیں بن گئیں۔ آدمی فقیر بن کر لقمۂ اجل بن گئے اور کلکتہ کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو زمین پہ پٹک کر چلے جا رہے تھے۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو فروخت کر رہے تھے اور آشا نے سوچا، یہ بچے تو ناجائز نہیں ہیں اُن کی ماؤں کے کلیجے تو پتھر کے نہیں ہیں۔ اُن کے باپوں نے تو اُن کی ماؤں کو دھوکا نہیں دیا۔ پھر یہ بچے

سڑکوں پر کیوں پڑے ہیں؟ فروخت کیوں کئے جا رہے ہیں؟ ان کو تو سماج کا کوئی خوف نہیں۔ پھر یہ کیوں؟ ——— روٹی اور پیسہ" بنگال کا سوال اور جواب یہی تھا۔ اور اس وقت سے معلوم ہوا۔ دھوکا۔ سماج کا خوف۔ ناجائز۔ اور کلنک محض اس حالت کا نام ہے۔ جب پیٹ بھوک بھوک پکارتا ہے اور ہاتھ خالی ہوتے ہیں انسان کی تہذیب، اس کا اخلاق، اس کی محبت خود اس چیز کے محتاج ہیں جس کو روٹی کہتے ہیں

کئی دنوں سے آشا کا بدن ٹوٹا جا رہا تھا۔ گیلے آٹے کی طرح اس کا تمام جسم کچا کچا معلوم دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور دل یونہی بار بار بُری طرح اٹھتا تھا۔ گویا اس کا جسم ایک بوسیدہ پرانی قبر بن گیا تھا ——— اور ایک دن جیسے قبر دھم سے بیٹھ گئی۔

"ارے آشا تو نے یہ کیا ناش کر ڈالا تیرے پیٹ میں تو بچہ ہے" اس کی دوست ڈاکٹرنی چلّا اٹھی ....

"رمیش اب تم ہی میری عزّت اور زندگی بچا ...."

"آشا میں بڑا شرمندہ ہوں۔ تم جس ڈاکٹر کی امداد لینا چاہو تو میں خرچ ادا کروں گا مگر شادی .... دیکھو میرے والد کی ناک .... اور زبردستی انہوں نے میری شادی طے کر دی ہے .... دیکھو میں واقعی کتنا مجبور ہوں ورنہ ...."

آشا نے اس کی طرف دیکھا ——— رمیش .... محبت .... وہ ... دو انسانوں کے درمیان ایک رشتہ۔ فریب .... ناجائز بچہ ....

سچی محبت ـــــــ دو انسانوں کے درمیان ایک معصوم انسان کی تباہی! اور ایک لمحہ کے لئے اسکی خواہش ہوئی کہ وہ رمیش کے گلے میں اپنا آنچل ڈالکر اس زور سے کھینچے کہ ...... مگر دوسرے لمحے اسے یاد آگئی انسانوں کی وہ تصویر جو اُس نے بنگال میں دیکھی تھی۔ اس آدمی کو اُس نے کتوں کی طرح ایک دوسرے سے روٹی ٹکڑے پر لڑتے مرتے دیکھا تھا۔ اپنی عورتوں کو راستے میں چھوڑتے پایا تھا، اور بے دردی سے بچوں کو سڑک پر ٹپکتے دیکھا تھا ـــــــ دن کی روشنی میں۔ ایک اعلیٰ پیمانہ پر۔ پھر وہ کیا پروا کرے گا اس عورت کی جو خود دنیا کی نظروں سے چھپنا چاہے گی۔ اس بچہ کی جو ابھی پیدا نہیں ہوا ـــــــ

"جاؤ رمیش شادی کر لو۔ باپ کی ناک برقرار رکھو، اور جب میں ایک بھکارن بنکر سڑک پر تم سے پیسہ مانگوں تو اپنے ہونے والے بچہ کی طرف اشارہ کر کے کہنا ـــــــ "اسے بچہ پیدا کیوں کرتی ہے۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے!!"

اور بھورے خشک کھیتوں میں ایک بگولہ ہمہ تن رقص آسمان کو چڑھ رہا تھا۔ ایک زخمی گدھا اپنی پیٹھ کے زخم سے ایک کوّے کو اڑانے کی کوشش میں رینگ رہا تھا۔ آشا ایک گاڑی میں پڑی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ اپنے "کلنک" کو دھونے کے لئے کسی دُور کے گاؤں میں جا رہی تھی۔ "نہ جانے بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی" ـــــ ایک لمحہ کے لئے وہ جذباتی ہو اٹھی۔ مگر .... آسمان میں بہت سے چیل کوّے منڈلا رہے تھے۔ اور اسکی ماں گرمی سے پریشان ہو کر کہہ رہی تھی "بالے تو نے سارے خاندان کی ناک کاٹ ڈالی ـــــ ورنہ ایسی آگ برستی دوپہری میں یوں کیوں اپنی تقدیر

پھوٹتی ہوتی"۔ اور معصوم گاڑی وان باتوں کے سلسلہ کو گرمی کی شدت پر محمول سمجھ کر کہہ رہا تھا۔" مائی گھبراؤ مت چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ جلدی ہی بارش ہو جائے گی"۔ اور آشا کی آنکھ سے ایک سہما سا آنسو کھسکا اور سینے میں گھل کر آہستہ آہستہ بہنے لگا۔

سنجیدہ اشرف

ایک ایسی لڑکی کے حالات جو مہاراشٹر جیسے علاقے میں جسے ادبی حیثیت سے ایک سنگلاخ خطہ کہا جاتا ہے، اور جس کا وطن مالوف (گونڈوانہ) ناگپور رہ گیا ہو کیا ہو سکتے ہیں اس پر مستزاد علمی و ادبی بے مائیگی ——— !

میری زندگی یا حالات میں کوئی ایسی ضیا تابی نہیں جو صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہو کر دوسروں کے لئے وجہِ دلچسپی بننے کا باعث ہو سکے اور نہ مجھے یہ پسند ہے کہ زندگی کو خواہ مخواہ مبالغہ آمیز نگینیوں کے ساتھ سجا کر یا افسانوی رنگ آمیزی سے پیش کروں، تاہم مختصراً عرض ہے ——— !

ابتدائی عمر میں ہر مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہی چونکہ میری شروعات حافظ صاحب مرحوم نے حسن نظامی صاحب مدظلہٗ کے آسان قاعدے سے کرائی۔ اس لئے اردو سے بھی روشناس ہو گئی اور میں اپنے جبلّی و فطری ذوق و شوق کے باعث بہت جلد اردو پڑھنے لگی ۔

ناسمجھی سے جن کا ذکر اذکار سنتی رہی تھی ان چیزوں نے حرف شناسی کے بعد میری تشنگئ ذوق کو بڑھا کر آتشِ شوق بنا ڈالا، اپنی اس دیوانگی کے باعث جو ملا پڑھتی رہی، صرف اخبار رسالے ہی نہیں بلکہ ان ادیبوں کی کتابیں بھی پڑھا کی جو ادب میں ایک زندۂ جاوید حیثیت پا چکے ہیں خواہ سمجھ سکوں یا نہیں، لیکن میں پڑھتی ضرور تھی،

اس اثنا میں گھر پر ہی سلسلۂ تعلیم بھی جاری رہا اور استاد اور استانیوں کے
فیضانِ درس و تدریس نے اور بھی زیادہ ادبی ترقی کی طرف راغب کر دیا۔ میں چونکہ
ایک ایسے خاندان کی فرد ہوں۔ جو قدیم روایات اور کہنہ رسمی پابندیوں کے خلاف
کسی قسم کے اقدام کو مستحسن نہیں گردانتا تھا۔ اس لئے کبھی اسکول کی صورت نہ دیکھ
سکی۔ اور بقول عصمت چغتائی کسی آشرم کی فضا بھی میسر نہ آئی۔ جہاں سکول کے ساتھ علمی
ادبی مدارج طے ہو سکتے۔

گردش زمانہ اور نامساعد حالات نے مذکورہ صدر سلسلۂ تعلیم کو بھی منقطع کر دیا۔
اور میری رہنمائی کے لئے وہی اخبارات و رسالے، کتابیں اور ادیب ہی
رہ گئے۔

طبعی اور فطری ذوق اور شاید اخبار میں نام چھپوانے کے شوق نے ہی مجھے لکھنا
سکھایا ہے۔

میں نہیں جانتی کہ میرا یہ اقدام ضروری اور کامیاب ہے یا نہیں۔ مجھے صرف لکھنے
کا خبط ہے۔ اس لئے لکھتی رہتی ہوں ——— یہ ہے میری زندگی کی مختصر سی داستان۔

سنجیدہ اشرف

مراجعت

گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ یہ اسٹیشن بھی چھوڑ کر رینگتی ہوئی سانپ کی طرح بل کھاتی فولادی لائنوں پر آگے بڑھنے لگی ——— !

اس شہر سے جہاں سے یہ سوار ہوا تھا ریل گاڑی ہر اسٹیشن کو ایسے ہی پیچھے چھوڑتے سامنے کی طرف بھاگی جا رہی تھی جیسے عمر بیتتے ہوئے دنوں کو۔ اور وقت پرانے سالوں کو ——— گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہی اسکی نگاہیں بھی سامنے آنے والی ہر نئی چیز کا تعاقب کرتی ہوئی طویل تر ہو جاتیں ——— کہ اچانک ہی کوئی دوسری شے، دوسرا منظر، یہ سلسلہ توڑ دینے کے لئے سامنے آ جاتا۔

دل و دماغ خیالات کے الجھے ہوئے تانے بانے میں جکڑے ہوئے تھے، جنگی مورچوں کے بھیانک مناظر، قتل و خون، غارتگری، مخالف قوت کا حملہ، بربادی، پسپائی قید و بند اور مصیبتیں!

وہ ان تاثرات کو یکلخت بھلا دینا چاہتا تھا اور اپنے بیتے ہوئے دنوں کے نقش
میں معصوم خیالات کا پہیہ گاڑی کے محور پر گھمانے کا متمنی تھا! لیکن اس لمبے عرصے نے
پہیہ شکستہ سا اور محور زنگ خوردہ کر دیا تھا ـــــــ جونہی وہ خیالات کا شکستہ سا
پہیہ زنگ آلود محور پر گھمانے کی کوشش کرتا قحط کا بھیانک دیو اپنے جبڑے پھاڑے کئی
رنگ بدلتا سامنے آن کھڑا ہوتا! اور میدان جنگ کی یاد بھی ساتھ ہو جاتی۔

وہ اندرونی کشمکش سے تنگ آ کر کھڑکی سے پلٹ کر سیدھا ہو بیٹھا اور ڈبہ
کے اندر کا جائزہ لینے لگا ایک، دو۔ تین، چار گنتے گنتے وہ غلط ہو جاتا، کئی مرتبہ دل
ہی دل میں وہ یہ عمل کرنے کے باوجود مسافروں کی صحیح تعداد معلوم نہ کر سکا ـــــــ!
اس وقت ڈبہ میں زیادہ لوگ نچلے طبقے کے گندے گندے سے غلیظ لباسوں والے
تھے، قریب ہی ایک بری سی بڑھیا جس کی صرف آنکھوں سے زندگی کے آثار نمایاں تھے،
دو ننھے ننھے ڈھانچوں کو قریب لئے بیٹھی تھی کبھی بچوں کے ٹمٹمانے پر اس کا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھ
کر دھول اور گرد سے اٹے ہوئے، تنکیاں سی بنے بالوں والے سروں پر جو جسم کے تناسب
سے ہلکوں سے دکھائی دے رہے تھے پھر جاتا تھا، اور وہ ننھے منے لاشے بھنک بھنک
کر مردہ لاشے میں گڑے جاتے تھے۔

بڑھیا اس کے زیادہ قریب تھی، اس وجہ سے کبھی کبھی ایک عجیب سی سڑاند، کھڑکی
سے اندر آنے والے ہوا کے جھونکے کے ساتھ پھیل کر اس کے دماغ میں بھی ایک آدھ بار
ہلکی سی جھلکی لے لیتی تھی،

آج کافی ٹھنڈ تھی اس لئے بو ناگواری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ اگر یہی سفر گرمی کے موسم
میں ہوتا تو یقیناً اسے وہاں بیٹھنا بھی دوبھر ہو جاتا، اس لمحہ اسکی نگاہوں میں ایک

مورچہ کی وہ جاپانی لاشیں پھر گئیں جن کے نقیلے، ایک دفعہ بھوک سے عاجز ہو کر اس نے اور اسکے ساتھیوں نے توڑ لیے تھے ———

اس کے خیالات کا سلسلہ پھر گاڑی نے اپنی ایک لمبی چیخ اور زوردار دھکے سے توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ گاڑی ایک بالکل ہی چھوٹے اسٹیشن پر رُکی تھی، اس بھرے ہوئے ڈبے میں دو مرد ایک عورت اور چڑھ آئے تھے اور بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کر رہے تھے لیکن کوئی سیٹ ایسی نہ تھی جس میں کچھ گنجائش نکل آتی، سوا اسکے سیٹ کے، تینوں کی نگاہیں بار بار ڈبہ کے آخری کونے تک جا کر سپاہی اور بڑھیا کی درمیانی جگہ پر ٹِک جاتیں ——— اُن میں سے ایک نے نفرت سے ڈبے سے باہر کی جانب تھوکتے ہوئے ناک سکیڑ کر کہا ——— "اے۔ اے عورت تم نیچے بیٹھ جاؤ، یہ دیکھو یہ ادھر کو سُنا تم نے؟"

بڑھیا حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگی۔ نوجوان عورت نے تیوری پر ہلکی سی شکنیں پیدا کر لیں اور کندھے پر چڑھے ہوئے چرمی بیگ سے ایک ننھی منی سی شیشی نکال کر طلائی چوڑیوں میں اٹے ہوئے ٹکڑے پر چند قطرے گرا کر فضا میں ہلانے لگی ———

دوسرے شخص نے مسکرا کر اسکی طرف دیکھا اور شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ——— "اوہ! آئی ایم ساری ڈارلنگ ——— آج کل یہ سفر بڑا ہی گراں ہوتا جا رہا ہے ——— ایک عذاب ہے عذاب! اور پھر عام درجوں کا! خدا ہی بچائے۔ میں تو اس سے ڈرنے لگا ہوں ——— اگر تمہیں بنگال دیکھنے کی ضد نہ ہوتی تو میں ہرگز یہ سفر نہ کرتا، خیر کوئی بات نہیں، تھوڑی سی تکلیف سہی۔ لیکن مجھے قوی امید ہے کہ جو ہر کو تم "ڈیشن" کے سامنے کے لئے بہترین چیز مہیا کر سکو گی۔ جوہر کا خیال تھا

تمہاری نگارش میں بڑی شدت کے ساتھ وطن کی پکار ملتی ہے تم ہند ماتا کے سینے میں دہکتی ہوئی اگنی کو منظرِ عام پر لاتی ہو۔"——
خاتون کے تمتمانے ہوئے چہرے پر گہری گہری سی گلابیاں پیدا ہو رہی تھیں اور لبوں کی خمیدہ گہرائیوں میں متشکرانہ تبسم —— دہکتے ہوئے شفق گوں گال رتیلے آسمان کی سی رنگت کی ساری کے آنچل میں چھلکتے ہوئے شہابی ابر پارے نظر آ رہے تھے وہ کھڑکی سے نظر آنے والے افق کے عمق میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے کچھ سوچکر بولی —— "جانے بیچاری شکنتلا، ریحانہ، اور کامریڈ نیازی کہاں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے —— وہ تو لال جھنڈے والوں کے ساتھ ہو گئے ہیں"۔
"وہ شخص بے نیازی سے بولا —— " اوہ ! ہم بھی تو مصیبت میں ہی ہیں!
خاتون نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھکر کھڑکی سے باہر تھوکتے ہوئے ایک لمبی سی گہری سانس لی، جیسے وہ ایک ہی وقت میں کافی دیر کے لئے بہت ساری سانس بھر لینا چاہتی ہو ——!
انجن نے اٹکتے اٹکتے بھپ بھپ کرتے ہوئے وسل دی تو دوسرے شخص نے چونک کر —— غصہ کے ساتھ اونچی آواز میں بڑھیا سے کہا —— " اے عورت بہری ہے، سنتی ہے یا نہیں —— دیکھو تم، مرینچے آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اپنے بچہ کو لیکر، یہ سونے کی جگہ نہیں"۔
سپاہی کا چہرہ تمتما گیا۔ اسے اُن لوگوں کا رویہ دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔ اس کے لب کچھ کہنے کے لئے ہل کر رہ گئے۔ بڑھیا نے التجا آمیز نظروں سے اُن کی جانب دیکھا اور کہنے لگی —— " بچہ کو بخار ہے، اس کا انگ جلتا ہے۔ ابھی سو رہا ہے ہم بھو کے

ہیں صاحب یہ بیمار ہے!"۔۔۔۔۔۔
بڑھیا اور کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ اس شخص نے انتہائی غضبناک صورت بنا کر اسکی جانب دیکھا اور ڈپٹ کر کہا ۔۔۔۔۔۔ "اگر تم ادھر نہیں بیٹھتی ہو تو ہم اس کو نیچے گرا دے گا ۔۔۔۔۔۔"

سپاہی اب اپنے آپ کو نہ روک سکا اُس کا جی جل اٹھا ۔۔۔۔۔۔ اس کے ایک ہم وطن کی بے عزتی! جن لوگوں کا بھوک سے مرنے کا یہ لوگ تماشہ دیکھنے جائیں اُن کے ساتھ یہ سلوک! ۔۔۔۔۔۔ "آپ کیسے بول رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔! آپ کا یہ حکم ریلوے قانون کے بالکل خلاف ہے آپ اپنی ظاہری حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، یہاں تو ہر شخص آزاد ہے جس کا جی چاہے جہاں بیٹھے، بیٹھنے کو سبھی دیتے ہیں امیر، غریب سب ہی ۔۔۔۔۔۔؟"

اسی اثناء میں وہ بڑھیا نیچے اتر چکی تھی اپنے دونوں بچوں سمیت، سیٹ کے خالی ہوتے ہی وہی شخص آگے بڑھا اور بولا ۔۔۔۔۔۔ "کمان، کم آن مسٹر مسن ہم یہاں بیٹھ جائیں ورنہ پھر اتنی جگہ بھی نہ ملے گی ہیں!" وہ آگے بڑھا اور اُس کے قریب ہو بیٹھا، نوجوان خاتون نے اٹیچی سے تولیہ نکال کر سیٹ پر پھیلا دیا، بیٹھتے ہوئے ایک نفرت خیز نگاہ پھر بڑھیا پر ڈالی چند بسکٹ اور چاکولیٹ کی ٹکیاں بڑھیا کی گود میں پھینک کر ایسی نظروں سے سپاہی کی جانب دیکھا گویا کہہ رہی ہو خالی خولی ہمدردی سے کیا ہوتا ملتا ہے، وہ بھوکے ہیں۔ یہ دیکھو میں نے انہیں ایسی چیزیں دی ہیں جو اللہ میاں بیچارے ساتویں آسمان پہ اپنی جنت میں لیئے بیٹھے ہیں ۔۔۔۔۔۔ دودھ اور شہد، دودھ اور شہد، جن کی آمیزش سے یہ لذیذ ٹکیاں بنائی گئی ہیں اور

یہ گول گول روپے کی شکل کی ٹکیاں، نمکین خوش ذائقہ ٹکیاں جو آدم کے جنت سے لائے ہوئے گندم سے تیار ہوتی ہیں۔" منگارام، اینڈ سنز" کے یہاں اور جہاں تم ایسے ہزاروں لوگ پڑے ان کی تکمیل اور تیاری کے عوض چند سکوں کے محتاج رہتے ہیں انہیں دانوں کی خاطر، اس سے تم یہاں بھی محروم رکھے گئے ہو اور وہاں بھی ــــــ کیونکہ تم ذلیل ہو خوار ہو، غریب ہو، گنہگار ہو!

کھدر کے کرتے پاجامے والا دہی شخص اب بڑی بے تکلفی کے ساتھ سپاہی سے باتیں کرنے میں مشغول تھا، شاید وہ سپاہی کے دل میں اٹھنے والے غبار کو اس کی نگاہوں میں دیکھ چکا ہو اور اسے اپنی بے لوث ہمدردانہ باتوں سے صاف کر دینا چاہتا ہو، لیکن! جیسے اجنبیت اسکے اظہار میں حائل ہو رہی تھی ــــــ! شاید وہ کہنا چاہتا تھا. . . . . . . "سپاہی میں کامریڈ ہوں. میرے دل میں اُن کے دکھ درد سے ٹیس سی اٹھتی ہے. یہ تو بالکل ہی معمولی سی باتیں ہیں ان سے کہیں ہمارے دکھ کا مداوا ہو سکتا ہے بھلا! پھر اتنی سی بات پر یہ رنجیش کیوں ــــــ؟

میرے بھائی ہم سب بھائی بھائی ہیں، ایک ہی ماں کے بیٹے، بیٹیاں، ہیں تم بھارت کے سپوت ہو تم نے اپنی ماں کی، اپنے وطن کی آزادی کی خاطر بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں میدان جنگ میں لڑے، بھوکے رہے ــــــ ہتھکڑیاں پہنیں، بیڑیوں میں جکڑے گئے مصیبتیں اٹھائیں اور موت کے منہ میں چلے گئے ــــــ میرے بھائی ہم سب غلام ہیں، آزاد حکومت کے محکوم ہیں، ڈھیروں اناج اگلنے والی دھرتی کے بھوکے، مفلس، قلاش، اور کنگال بیٹے ہیں پھر اس ذرا سی رنجش کو طول کیوں دیں۔ ــــــ؟ بہادر ہم جلیس، تم نہیں جانتے کہ اگر میں اسوقت یہ ایکٹنگ نہ کرتا تو

ریلیف فنڈ اور ہمارے اتحادی فنڈ میں ملنے والی موٹی موٹی رقمیں رُک جائیں۔ اور کل تم جب اخبار میں فلاں بن فلاں کا عطیہ دیکھو گے تو خوشی سے مسکرا اُٹھو گے
——— تمہیں بتاؤ پھر اس بڑی رقم سے کتنے بھوکے پیٹ سیراب ہونگے ———
بہادر سپاہی آؤ آؤ کہ ہم مل جل کر باتیں کریں ——— کیونکہ زندگی کا یہ سنہری سفر بہت ہی مختصر ہے اور ہر لمحہ کسی نہ کسی قیام گاہ پر ہمارے بچھڑ جانے کا اندیشہ ہے
———"!!

نوجوان خاتون کھڑکی میں کہنی رکھے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی اس کی سفید کنارے والی نیلی ساری کا آنچل ڈبے سے باہر نکل آیا تھا اور ہوا سے کسی بیقرار رُوح کی طرح پھڑ پھڑاتے جا رہا تھا، گاڑی ہر آنیوالی چیز کو پیچھے چھوڑتی فراٹے بھرتی آگے کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی، تمام مسافر ایک دوسرے سے بے نیاز مگر ایک دوسرے سے قریب خیالوں اور باتوں میں مگن تھے!

سپاہی نے کسی شدید جذبے کے تحت چونک کر بڑھیا سے پوچھا ———
"مائی تجھے کہاں جانا ہوگا، تو کون اسٹیشن پر اُترے گی؟"
"جہاں تک یہ ٹکٹ لے جائے گی بیٹا ———"
"کون گاؤں سے چلی ہو؟"
گاؤں گاؤں کہاں، اب تو ہم شہر سے آئے ہیں۔ گاؤں چھوڑے تو ایک سے زیادہ ہی برس ہو گئے ہیں بیٹا ——— ہم بھوک سے تنگ آ کر شہر کی طرف گئے۔ لیکن وہاں ہمیں بھیک بھی نہ ملی، مکانوں کے دروازے ہم پر بند ہو گئے۔ پولیس کے ڈنڈوں اور پکڑ دھکڑ نے ہمیں اور بھی بے حال کر دیا۔ میرا بیٹا جگ پور کی دس بیگھہ زمین کا

مالک تھا دادا ـــــــــ مگر یہ کل جُگ کیسا ہے۔ اس نے ہمیں بھکارن بنا دیا
بیٹا مر گیا۔ بہو پاگل ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور زمین چاول کے عوض زمیندار
نے لے لی اور جب گاؤں میں ایک دانہ بھی چاول کا نہ رہا۔ تو میں انہیں لے کر شہر
چلی آئی۔ میرے گاؤں کی اب کیا دشا ہوگی دادا؟"

جگپورا اور جگپور کے نام سے جیسے سپاہی کے دماغ پر ضرب سی لگی، وہ چونک
کر بولا "جگپور، جگپور میں تم رنشال کو جانتی ہوگی نا ـــــــــ!"

"ہاں بھیا۔ رنشال تو فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔"

"اور اسکے گھر والے کہاں ہیں کیا رنشال آ گیا؟"

"کہاں دادا اس کا تو کچھ پتہ نہیں چلا ـــــــــ اس کی ماں مر گئی، بہن "کلکتے"
چلی گئی اور ـــــ ـــــ اور سگونا اسکی بیوی ـــــــــ"

اچانک انجن کی وسل نے ڈبے میں ہل چل مچا دی گاڑی کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی
ـــــ کوئی بڑا اسٹیشن تھا شاید ـــــــــ! میدان، درخت اور جھاڑیوں کی
بجائے اب شہری آثار ظاہر ہو چکے تھے ـــــــــ سپاہی اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑھیا کے
پاس ہو بیٹھا تھا ـــــــــ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہو چکی تھی۔ لوگ حتی المقدور اپنی
مختصر سی جگہوں پر ہی پھیل پھیل کر بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے، کچھ اتر رہے تھے۔ کچھ
چڑھ رہے تھے ـــــــــ خوانچے والوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ایک
عجیب ہنگامی کیفیت طاری تھی ـــــــــ لیکن سپاہی سب باتوں سے
بے نیاز ہو کر کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ کسی خیال میں غرق ہو چکا تھا۔ چند گھنٹے قبل خیالات
کا جو پہیہ، وہ گاؤں کے محور پر نہ گھما سکا تھا۔ اب بڑی تیزی سے پھر رہا تھا، حائل ہونے
والی جنگی چیخوں معدوم ہو گئی تھی، قحط کا بھیانک دیو اپنی اصلی شکل میں اسکے روبرو

تھا مستقبل قریب کا ہندوستان اپنے حقیقی روپ میں اسکے ذہن میں چمکے چمکے ابھر رہا تھا، غلام ہندوستان قحط کا شکار ہو چکا تھا اور ہونے والا تھا ——— بنگال کا وہ ماحول جو گذرے ہوئے خواب کی مانند اسکی روح پر چھایا ہوا تھا۔ تازہ ہو چکا تھا ———!

ٹوٹے پھوٹے کچے پکے مکان،

دھان کے لہلہاتے کھیت"

ناریل کے اونچے اونچے خوشنما درخت! بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور حسین چہروں والی نازنینیں ———:

جنگ کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں، جان، مال اور اناج، ملک کو جنگ کے ہولناک شعلوں سے بچانے کے لئے ان کی سخت ضرورت تھی۔ ہندوستان نے جان، مال اور اناج کو یورپ کے استبداد کی بھینٹ چڑھا دیا ——— آخر جنگ ختم ہوئی، پھر کیا ہوا، مددگار ہندوستان شکست خوردہ ہندوستان بنے گا، اسکی گرسنہ لاش پر فتح کا پرچم لہرایا گیا ہے ——— اب اس ماتم خانے میں چراغاں ہوگا۔ فتح کی پوری پوری اور مکمل خوشی منائی جائیگی، دس لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ حکومت کی فتح ہے آزادی اور شہنشاہیت کی برقراری کی فتح ہے ———!

چالیس کروڑ انسانوں پر حکومت کرنے والی اجنبی اقلیت کی فتح ہے!

فتح کے خوشنما خوش رنگ بلند پرچم تلے چالیس کروڑ انسان ——— فتح کے بعد نازل ہونے والی بلاؤں کو خوفزدہ ہو ہو کر دیکھ رہے ہیں، افلاس اور بیکاری چڑیلوں کی طرح منہ پھاڑے آگے بڑھ رہی ہے، قحط کا دیوتا اپنے ملبے لانبے دانت

سکو سے وحشیانہ قہقہے لگانے کے لئے بے قرار ہے ——— !

گاڑی مسلسل چیخے جارہی تھی، انجن سانپ کی طرح پھنکاریں لگائے جارہا تھا۔ ریل کا گھمسان مسافروں کے لئے پریشانی کا باعث ہو رہا تھا، ہر مسافر دوسرے مسافر کے لئے خشونت و رعونت سے پُر تھا،

نوجوان خاتون نے ایک سست سی جماہی لیتے ہوئے پلٹ کر اور پلیٹ فارم پر گہری نظریں دوڑا کر کہا ——— "کامریڈ میں اس سے پہلے بھی جب سے قحط پڑا ہے تین مرتبہ بنگال ہو آئی ہوں لیکن کبھی ایسی مصیبت نہ اٹھانی پڑی"۔

"دوسرا شخص ایک واہیات مسکراہٹ کے ساتھ بولا ——— "اب بھی اگر دونوں و۔جے۔بیزر وہ نہ ہوتے تو ہمیں ہرگز یہ تکلیف نہ ہوتی ——— !"

"یہی تو بڑی مشکل آن پڑی تھی"۔ پھر وہ سوچنے لگا یہ شہنشاہیت ہے، خود ارادیت جس پر جمہوریت قربان کی جاتی ہے اسکی آزادی اس کا آرام سب اس پر نثار کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کسی کو اس کا احساس ہونا بھی گناہ کے مترادف ہے ——— ! اس نے سپاہی کی طرف دیکھا وہ دروازے میں کھڑا کیسی گہری سوچ میں غرق تھا، کامریڈ کا خیال اسکی جانب گھوم گیا ——— یہ ہندوستانی سپاہی کس طرح بسر کریگا جو ملک کی آزادی کی خاطر 'جے ہند' اور 'آزاد ہند' کے نعرے لگاتا ہوا مفلس و قلاش ہو کر وطن کی بھوکی لاش پر ماتم گساری کے لئے لوٹ رہا ہے ——— کاش! وہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مر جاتا۔ کہ اسکی بیوی بچے ماں اور بہن بھوکے نہ مرتے اور بے عزت نہ ہوتے یا اُسے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا کہ .... کہ .... آزادی کے خیالی پرچم پر چند سُرخ چھینٹے اور نمایاں ہو جاتے مگر افلاس سے دوچار نہ ہوتا ——— !

افلاس سے ہندوستان کی کہنہ وبا سے!

یکایک بڑھیا سپاہی کی ٹانگوں میں سے دیکھتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں چلا پڑی ـــــ اے، اے بھیا وہ دیکھ ـــــ سگون ـ ـ ـ سگوان میرے گاؤں کے دس ایکڑ زمین کی مالک ـــــ سگونہ!

سپاہی نے "کہاں" کہکر لڑکھڑاتے ہوئے بڑھیا کی طرف پلٹنے کی کوشش کی مگر ڈبے کے ہینڈل سے ہاتھ چھوٹ پڑے ـــــ اور دھڑام سے پلیٹ فارم کے فرش پہ آرہا، سامان لدے ہوئے فولادی ٹھیلے نے سر کے ٹکڑے کر ڈالے! آزادی کا خواہاں ومارغ خون کی خوفناک سرخیوں میں پلیٹ فارم کے سفید فرش پر بکھرا پڑا تھا ـــــ

ایک بھکارن چیتھڑوں میں لپٹی پلیٹ فارم پر جمع ہونے والے اور دروازوں کھڑکیوں سے نکلنے والی گردنوں کے آگے بھیک مانگتے ہوئے اپنی بھوک کا بار بار پیٹ بجا بجا کر اعادہ کر رہی تھی ـــــ

انجن وسل پہ وسل دیئے جا رہا تھا لوگ ہٹ رہے تھے ـــــ کوئی پھرتی سے اپنی پہلی جگہ پہ پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھے ـــــ!

بڑھیا اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے جیسے اپنے جسم سے نمی کا آخری قطرہ باہر ٹپکا دینے میں کوشاں تھی ـــــ!

کامریڈ نیچے کھڑا اس حادثہ پر اظہار افسوس کر رہا تھا۔ نوجوان خاتون افق پر ملتی ہوئی کسی سوچ کے بیکراں سمندر میں غلطاں تھی اشاید وہ ڈیش کے لئے نیا افسانہ ڈھونڈ رہی ہو! دوسرا شخص وسل سے پریشان ہو ہوکر کامریڈ کو اندر آجانے کے لئے کہہ رہا تھا ـــــ "کامریڈ گاڑی چھوٹا چاہتی ہے آخر تو بھی۔ چلے بھی آؤ۔"

کا مرثیہ رنگیتی سسکتی سی گاڑی پر چڑھ آیا۔

بیوہ سندرتا ـــــــ ایک بھکارن کے روپ میں ہر مسافر کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھی۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ اسٹیشن چھوڑ کر فولادی لائنوں پر سانپ کی طرح بل کھاتی پھپ پھپ کرتی آگے بڑھ گئی..................!!

سیّدہ اشرف

سیّدہ اشرف

انسان کی افسانوی روح کو اسکے ذاتی حالات سے کیا تعلق ـــــ کیا اننے بے شمار افسانے جو صفحۂ قرطاس پر منتشر ہیں حیات انسانی کی ترجمانی نہیں کر سکتے ـــــ ؟ کر سکتے ہیں تو بس یہی کافی ہے۔

افسانوں کی رنگینیاں دل آویزیاں شیرینیاں نزاکتیں تلخیاں اور شورشیں میرے خیال میں ذاتی شخصی انفرادی اور افسانہ نگار کی زندگی کی داخلی کیفیات کی متحمل نہیں ہو سکتیں ـــــ بلکہ ان رازہائے سربستہ کے انکشاف سے بڑی حد تک زندگی کے جھلملاتے ہوئے پردوں کے پیچھے قیاس کی سجتی ہوئی حسین محفلیں سونی، بے کیف اور بے جان بن جاتی ہیں۔

در اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ جیسے کرم فرماؤں کی عنایت نے مجھ غریب کو بھی افسانہ نگار بنا ڈالا ورنہ میں اس زندگی سے کوسوں دور ہوں ـــــ تاہم اعتراف جرم کے بعد اگر واقعی اس سلسلہ میں یہ امر ناگزیر ہے تو قلمی زندگی کی تفسیر بہت ہی مختصر یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ میری قلمی زندگی درحقیقت میرے ذاتی فطری شوق کا نتیجہ ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ـــــ سمجھ اور شعور کی حدود میں قدم ڈالنے سے بہت پہلے ہی میں نے لکھنا شروع کر دیا ـــــ محض فضول اور بے معنی! ـــــ دلی شوق سے مجبور ہو کر ـــــ مجھے یہ مرض کب سے لگا اور کیوں کر، مجھے خود اس کا پتہ نہیں۔ میرا یہ شوق سب کے لئے کچھ عجیب سا تھا مجھے بچپن سے اخباروں میں مضامین لکھنے کا شوق ہے جیسے

مضامین ہندوستان کے مختلف معیاری اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہاں اُن کی طویل فہرست بے مزہ سی چیز ہوگی،

میری افسانہ نگاری کا آغاز غالباً ۳۵ء و ۳۶ء سے ہوتا ہے۔ میرا پہلا مختصر سا افسانہ "کچھی پوچا" شائع ہوا۔ یہ میری اولین افسانوی کوشش تھی جس میں نمایاں طور پر ایک واقعہ کے تاثرات کارفرما ہیں ——— اسکے بعد عرصہ تک افسانہ نویسی کے سلسلہ میں میرا قلم خاموش رہا۔ اس سکوت میں ذہنی خلجان زندگی کی داخلی کیفیات ہنگامے ماحول کے تاثرات اور بے ربطی کو بڑا دخل ہے ——— گو مجھے کہانیاں لکھنے کا بچپن سے شوق ہے لیکن خیالی قصہ اور الوالہول کی داستانیں نہیں ——— یہ صرف میرے احساسات اور تاثرات کی کروٹیں ہوتی ہیں تخیل تاثرات کے گرد افسانہ کا جال بُن دیتا ہے اسکے سوا کچھ بھی نہیں۔ نہ میں پیغامبر ہوں نہ مصلح ——— بس یہی ہے میرے شوقِ اتمام کی تفصیل۔ اگر صحت معاون ہوتی تو اسپ شوق کی سُست رفتاری کی شکایت پیدا ہونے کا امکان نہ رہتا۔

میری تعلیم کا کوئی خاص محور نہیں تحصیل اور حصول کا سلسلہ جاری سمجھئے ——— میری زندگی نے اس سنگلاخ علاقہ میں جنم لیا جس صحرائی سرزمین میں چشمۂ اُردو کے سوتے کم ہی پھوٹتے ہیں اور جسے "مہاراشٹر" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے میری اردو بھی اُستاد اور اسکول کی رہین نہیں یہ سب کچھ فطری شوق کے مجنونانہ تقاضہ کا نتیجہ ہے۔

یہ خودستائی نہیں حقیقت ہے کہ یکسوئی اطمینان اور سکون کے ساتھ لکھنے کا بہت کم موقع ملا ——— زندگی خود ایک ہما گم بھاگ شے ہے ایک ہنگامہ شور ازلی اور ابدی ہل چل پیہم تڑپ نہ جانے کیا ———؟ ——— جب لکھنے کو دل چاہتا ہے تو ضرور لکھتی

ہوں ۔۔۔۔۔۔ قلبی تحریک نہ ہو تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

مجھے فخر ہے کہ قدیم روایات کی زنجیریں توڑ کر میں نے قلم سنبھالا خاندان میں میں پہلی لڑکی ہوں جس نے قلمی زندگی اختیار کی ۔۔۔۔۔۔ ورنہ ایک روایاتِ کہنہ کا حامل شریف وضع دار خاندان جہاں لڑکیوں کے خیالات کی اشاعت تو کجا معمولی لکھنا پڑھنا بھی مستحسن نہ سمجھا جاتا ہو ۔۔۔۔۔۔ اس گھرانے کی لڑکی کے لئے قلم پکڑنا اور اپنے اوندھے سیدھے خیالات کی اشاعت بیحد دشوار مرحلہ ہے!

سیدہ اشرف

سیدہ اشرف

سپنوں کے سائے

شبنما نے ایک طویل آہ کے ساتھ بے کیفی سے بستر پر کروٹ بدلی اور اپنی تھکی تھکی سی بے جان سی آنکھیں دریچے کے شیشوں پر گاڑ دیں۔ دسمبر کی سرد تاریک رات کا اندھیرا گاڑھا ہو رہا تھا۔ ساکت سی ویران اور ٹھٹھری ہوئی رات تھی سنسان تاریک اور بھیگی ہوئی فضا ــــــ اُسے اپنی زندگی بھی سرد تاریک اور ساکن سی معلوم ہونے لگی۔ دور کرسمس کے نغمات کی دھیمی دھیمی تانیں اُسکے کمرہ کی خاموش فضا میں سحر انگیز کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے بے چینی سے پھر ایک مضطرب سی کروٹ لی۔ نجانے آج اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ خلافِ معمول آج وہ بہت ہی بے چین تھی۔ اس اضطراری کیفیت کے کرب نے شبنما کے سینہ میں ایک عجیب نامعلوم سی خراش ڈال دی تھی۔ جیسے اُسکے پھیپھڑوں میں آج کوئی نئے جراثیم سرایت کر گئے ہوں اُس نے اپنی اس کشمکش اور قلبی کشاکش کا بڑی دیر تک تجزیہ کیا ــــــ نرس اپنی ڈیوٹی کے بعد پھر ایک بار

اُسے سوجانے کی ہدایت دے کر چلی گئی تھی۔۔۔۔۔۔ کرسمس کی رات تھی اور آج وہ
سب خوشیوں کے نغمات فضا میں بکھیر رہی تھیں اور اسکی ہلکی ہلکی صدائیں شبیا کو حد درجہ
افسردہ کیے رہی تھیں۔
شبیما صحت گاہ کی ویرانیوں میں چھ ماہ سے زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔۔۔۔۔۔
نئی اور جیتی جاگتی زندگی۔۔۔۔۔۔ ایک سال، صرف ایک سال قبل والی خوبصورت اور
چمکتی ہوئی صحت کی خواہش مند۔۔۔۔۔۔ شبیما سوچنے لگی وہ کس قدر صحت مند اور
تندرست تھی اس کی سفید رنگت میں آفتاب کی ہلکی سی تمازت سرخیاں دوڑا دیتی تھی۔
اور آج خزاں رسیدہ پتہ کی طرح بے جان پڑی ہے۔۔۔۔۔۔ صحت ور شجر سے گرا ہوا زرد بیمار
پتہ۔۔۔۔۔۔ اغیر ارادی طور پر اسکی بے جان سی انگلیاں اسکے سُوکھے سُوکھے مرجھائے
ہوئے رخساروں پر پھسلنے لگیں! کتنے تر و تازہ تھے یہ رخسار اور بھرے بھرے۔۔۔۔۔۔
اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ جانی پہچانی اُنگلیاں اسکے سُرخ و سفید رخساروں کو چھُو رہی
ہیں۔ اور کان ان شیریں محبت بھرے الفاظ سے گونج اُٹھے ہیں" سچ مچ شبیما یہ رخسار
"گُلِ شیراز" کو شرماتے ہیں۔ جیسے تمہارے جسم کا سارا خون یہیں سمٹ آیا ہو"۔۔۔۔۔۔
اور وہ شرم سے اور سرخ ہو جاتی۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر آئینہ دیکھے
شاید اسکے چہرہ پر پھر سے وہ اگلی سرخیاں جھلک رہی ہوں۔ جن کی تلاش میں وہ سینی ٹوریم
کی اداس اور بے کیف فضا میں مسلسل چھ مہینے سے سانسیں لے رہی ہے لیکن اسکے
جسم میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ اٹھ کر دو قدم چلتی اور ایک لمحہ دل کو مبتلائے فریب
کرتی۔۔۔۔۔۔ دُور فضا میں نغماتِ مسرت بکھر رہے تھے۔ کرسمس کی خوشیاں انگڑائیاں لیکر
بیدار ہو رہی تھیں۔ لیکن کمرہ کی فضا اداس تھی اس کا دل آج بے طرح ویران ہو رہا تھا،

شبنما نے پھر ایک آہ کے ساتھ حسرت بھرے انداز میں کروٹ بدلی وہ آنکھیں موند کر ماضی کے اندھیرے غاروں سے اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی روشنیوں کی منتشر کرنیں سمیٹ لینا چاہتی تھی اور اپنی تھکی ہوئی رُوح کی بیقراریوں کو ان لمحات شیریں میں گم کر دینے کی آرزومند تا کہ یہ فریب ہی اسکے تڑپتے اور مچلتے ہوئے دل کو ایک پل کے لئے مطمئن کر دے۔ اسے ایک لحظہ کے لئے زندگی کے بچھڑے ہوئے راستہ پر مسرت کے ستارے جگمگاتے نظر آنے لگے۔ فرحت کی مسرت سے ہانپتی ہوئی آواز نے اُسے چونکا دیا۔
"باجی۔ باجی!" اُس نے محویت کے عالم میں کتاب سے سر اٹھائے بغیر کہا ——— "کیوں فرحت میں یہاں ہوں" ——— اور ایک لمحہ میں جیسے وہ دوسری دنیا میں پہنچ گئی ———
یوکلپٹس کے لرزیدہ سایوں میں ہسٹری آف یورپ پر نظریں گاڑے اُس نے سُنا کہ کل صبح نعمان بھیا آ رہے ہیں۔ باجی اور ننھی فرحت خوشی سے تالی بجا کر ناچ گئیں۔
اس کی رُوح بھی جیسے مسرت سے جھوم اٹھی" ——— نعمان چھ سال بعد یورپ سے واپس آ رہا ہے اور اسکی معصوم رُوح جیسے چھ سال پہلے کی پرانی دُنیا میں جھانکنے لگی! ایک الھڑ سی بے فکر اور آزاد دنیا جس میں مسرت کی شیرینیاں قہقہے مسکراہٹیں کھیل کود اور زندگی کے انجان راستہ پر منزل سے بے خبر بڑھے چلنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ نگاہوں کے آگے ایک شوخ مچلتا ہوا چہرہ رقصاں ہو گیا۔ شفاف روشن ماتھے پر جھکے جھکے اُلجھے ہُوئے بے ترتیب سے بال جو کبھی سنوارے ہی نہیں جاتے تھے اور خوابوں سے بھری ہوئی شریر آنکھیں! ان میں کتنی زندگی اور کیسی انوکھی شرارتیں پنہاں تھیں!
نوروز کا جشن اسکی ٹوٹی ہوئی امیدوں کا ایک شکستہ سہارا بن کر نگاہوں کے پردہ پہ اُبھرنے لگا۔ اسکے خوابوں کا شہزادہ جب نواب مسعود نے نوروز کی رات بیچ

مچ شہزادہ ہی بنا دیا تھا۔ ریشمی طرہ اور صافہ چمکتی ہوئی اچکن زرکار جوتا جیسے عہدِ قدیم کی کوئی حسین تاریخی کہانی کا پُراسرار ہیرو ـــــ اس رات سب کی نظر نعمان کو کھلنے جارہی تھی۔ رقص و موسیقی قہقہے اور خوشیاں شبنم "لبنا" الفریڈ۔ لوز۔ اور بلور سے بکھرے ہوئے تھے نواب مسعود ایک چھپی ہوئی خواہش پر مسکرا کر بولے دیکھنا کہیں میری نظر نہ لگ جائے کچھ بدر تار دو اس شہزادہ پر ـــــ بھولا بھالا معصوم سا شہزادہ" ـــــ

اس رات سب کتنے خوش تھے۔ پرانے سال کی کینچلی اتار کر سب خوشبوں اور عشرتوں کے سہانے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتے تھے۔ سپنوں کے تار بنتے ہی چلے گئے وقت کی عنکبوت نے اپنی نامعلوم رفتار سے پورا جال بُن دیا ـــــ آخر ایک دن کالج کا شوخ وشنگ نعمان یورپ کی آزاد فضاؤں میں زندگی کے خوابوں کی حسین وجاذب تعبیریں ڈھونڈنے میں منہمک ہو گیا اور شبیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھ سالوں کے اُلجھے ہوئے گچھے کو ٹٹولنے لگی۔ بے کیف اور بے مزہ زندگی ـــــ ایک بے جان سا تسلسل، بے مزہ سا جمود، زندگی کا سمندر ساکن ہو گیا تھا ـــــ

اور پھر ایک حسین صبح یوکلیٹس کے لرزیدہ سایوں میں اُس نے نغمۂ بہاراں کی طرح سُنا کہ کل صبح نعمان آرہا ہے ـــــ نعمان آرہا ہے۔ جیسے زندگی کے ساکت سمندر میں تلاطم بپا ہو گیا۔ دل میں مسرت کے سوتے پھوٹ گئے روح اَن دیکھی راہوں پر رقصاں ہو گئی۔ نعمان آرہا ہے چھ سال بعد! وہ خیالات کی رَو میں بہی جارہی تھی، چھ سال نہ جانے جذبات کے کسی اشارے اور رُوح کی کس چشکی نے بتا دیئے پشیا دل ہی دل میں جھینپ سی گئی۔ شرم سے اسکے رخسار تمتما اٹھے اسکی رُوح جیسے وقت

کے جوار بھاٹے میں پھنس کر رہ گئی ہو ——— زندگی کے سمندر کا بھاٹا ختم ہو گیا اور جوار کی اٹھتی ہوئی لہروں نے زندگی کا سارا مس اور بے کیفی جذب کر لی نعمان نے اسے زندگی کے ایک بیش قیمت فلسفہ سے آگاہ کیا اسکی خاموش نبض حیات میں شعلۂ محبت سے تپش اور تڑپ پیدا ہو گئی ——— آجتک شیما جیسے صرف زندہ تھی لیکن آج وہ محسوس کرنے لگی کہ وہ زندگی کے حسن سے آگاہ ہو گئی ہے۔ جیسے وہ بلند آسمانوں پر کہکشاں کی چمکتی ہوئی لکیر کو راہِ حیات بنائے خراماں خراماں چلی جا رہی ہو۔ اک دم سے خیالات کے نیلے پیلے زُلفوں غبار ے ہوا کے ایک جھونکے سے بلندیوں پر پہنچ کر دم توڑنے لگے ——— شیما نے جھنجلا کر اپنی تھکی ہوئی بے جان سی باہیں بے کیفی سے بستر پر ڈال دیں۔ اسکی زندگی کا روشن اور مسکراتا ہوا راستہ حادثات کے طوفان سے کتنی جلد غبار آلود ہو جاتا ہے شیما نے اکتا کر اپنی خشک ہتھیلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں جیسے اسکی آنکھوں میں گرد و غبار بھر گیا ہو ——— ماضی کی شمع میں جھلملاتی ہوئی روشنی میں اس نے پھر کتابِ حیات کے اس رنگین باب کا ورق الٹا، نعمان نے اُسے چاہنے اور چاہے جانے کا لافانی سبق پڑھایا ——— آہ وہ حسین دن جبکہ نعمان اپنی زندگی کی تمام تر امنگوں اور روح کی گہرائیوں کے ساتھ اسکی ایک ایک ادا پر مرتا تھا۔ شاید :۔ وہ عجیب و غریب سوچوں میں غلطاں ہو گئی۔

لیکن آج ——— آج وہ نہیں اسکی روح نعمان پر مر رہی ہے۔ نہ جانے صداقت کیا ہے ؟ ——— احساس حقیقت اسے جھنجوڑنے لگا۔ ایک طرف صحت گاہ کی خاموش اور ساکن فضا، دوائیں، غذائیں، احتیاط، آرام، انجکشن، ایکسرے، نرسیں، ڈاکٹر، اور دوسری طرف اس کی چپ چاپ زندگی ——— مسز شاما۔ آنند را۔ یہ تاجر گوہر

صحت کی تلاش میں برسوں سے اپنی زندگی سکوت کی اس ویران وادی میں گم کئے ہوئے ہیں۔ شجانے اُن کا دل کس طرح بہلتا ہے ——— ڈاکٹر زیدی کا تبسم اور مردانہ وارثوں سے مستعار لی ہوئی خوشیوں کا فریب! اندرا۔ پرتما۔ مسز محمود اور صابرہ کی طرح اسے مطمئن نہیں کر سکتا ——— شیما سوچنے لگی ڈاکٹر کہتے ہیں خوش رہو فکر اداسی کو پاس نہ پھٹکنے دو خوب کھاؤ پیو۔ ہنسو۔ کھیلو خوش اور بے فکر رہو۔ سوچا مت کرو ——— خوب سوچا مت کرو! یہ سوچ کا سوچ ہی تو زندگی کے شکنجے کو چلا رہا ہے۔ ورنہ اب زندگی میں اس سوچ کے سوا دھرا ہی کیا ہے ——— کیا! وہ حیران ہو کر سوچنے لگی ———

نعمان اسکی زندگی کے خاموش سمندر میں عشرتوں کا سیلاب بنکر داخل ہو گیا۔ نعمان کی عجیب و غریب فلسفیانہ باتیں لمبی لمبی سیریں رقص موسیقی تفریحیں ہنسی مذاق جیسے زندگی کے شاندار محل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ مستقبل سے بے خبر روح نشاط و طرب کی محفل میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ زندگی خوابوں کے گہوارے میں جھول رہی تھی۔ —— آزاد بے فکر اور لاپروا نعمان یورپ کی آزاد فضاؤں میں زندگی کو تمام تر عریانیوں کے ساتھ دیکھنے والا آزاد پرند دام ہوس میں پھنس کر ہندوستان کے پنجرے میں بند ہو گیا ——— بال روم۔ کلب۔ ناچ گھر سینما سب نشاطِ رفتہ بن کر رہ گئے تھے۔ اس کی دلچسپیوں کا محور صرف شیما تھی اور شیما کی محبت ——— شیما ماضی کے سہارے بیداری کے اس خواب میں ایک گونہ لذت محسوس کر رہی تھی حیات گذشتہ کا ایک ایک لمحہ جیسے اسکی یادوں کے سمندر میں حباب رنگین بن کر ابھر رہا تھا۔ وہ نعمان کی معیت میں زندگی کے حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ اُس کا منتہائے مقصود صرف نعمان تھا اور نعمان کی زندگی کا محور صرف شیما۔ پھر یکلخت جیسے خوابوں کا یہ محل خیالات کے سلسلہ کی طرح ٹوٹ گیا۔ خواب و خیال کی

دنیا اجڑ گئی۔ شیما کا جیسے دم گھٹنے لگا درد و کرب سے مضطرب سی ہوگئی۔ غم و یاس نے اُسے نڈھال کر دیا ——— فضا کرسمس کے نغمات سے مترنم ہو رہی تھی لیکن یہ ترنم خیز بول شیما کے دل پر لحظہ بہ لحظہ ٹیسیں لگا رہی تھیں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی لیکن کرسمس کا بلند ہوتا ہوا فضا میں لہراتا ہوا ہر نغمہ اسکے دل کی راکھ کو کرید رہا تھا۔ یہی کرسمس کی رات تھی خوشبوؤں سے معمور اور اسکی مسرت اس سے چھینی جا چکی تھی، اف میرے اللہ، اس نے آنکھیں بند کر لیں رقص گاہ کا سماں اسکی نگاہوں کے سامنے تھا۔ نعمان کے آغوش میں وہ "ابلیس" کو محوِ رقص دیکھ رہی تھی وہ سوچنے لگی ابلیس ایک گرجتے اور دھاڑتے ہوئے سمندر کی طرح اسکے اور نعمان کے درمیان داخل ہوئی اور وہ دو ساحلوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ جو باہم کبھی نہیں مل سکتے، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ شاید نعمان بھی اسے کبھی نہ مل سکے ———

نعمان اس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا گویا اُسکے جسم سے روح نکلتی چلی گئی۔ نعمان کی طرح اُسکی صحت نے بھی اسکی رفاقت سے منہ موڑ لیا۔ نعمان کی جدائی اور بے وفائی کے غم میں شیما موم کی شمع کی طرح پگھل رہی تھی۔ شیما نے آنکھیں پھاڑ کر کمرہ کی فضا میں دیکھا اسے اپنے سینہ میں شدید درد کا احساس ہونے لگا۔ وہ ایک لمحہ ساکت سی ہوگئی اور پھر خیالات کا طوفان اُمنڈ آیا ——— نعمان کی تباہی اور بربادی کی رُوح فرسا حقیقت اسکے سامنے جلوہ گر تھی۔ ابلیس ایک بوڑھے فوجی کرنل کے آغوش کی زینت بن رہی تھی۔ اور نعمان اپنی ناکامی کے زخم کے لئے مرہم کی تلاش میں "چور بازار" کا طواف کر رہا تھا معصوم منہ بند کلیوں کو چھیڑ کر یہ ظالم بھونرا کھلے ہوئے پھولوں پر فدا ہو رہا تھا۔ جو زینتِ چمن بنے ہوئے ہیں اس کا محبوب نعمان چور بازار سے خوشیاں خرید رہا تھا۔ چور بازار جہاں محبت

سکتی ہے جہاں وہ حرارت ایک نئے کھلونے سے جی بہلا سکتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے سے چور بازار
کیوں لگا ہوا ہے ہر طرف چور بازار اور پھر عورتوں کا چور بازار جہاں سے حسین آسودگی خریدی جا سکتی ہے
خوابوں کا سپنیں پردہ اسکی آنکھوں کو چندھیا کر آہستہ آہستہ سرکتا گیا۔
اور شیما ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ٹوٹتے ہوئے دل کی متاع سنبھالے زندگی کی
شکستہ کشتی کی پتوار تھامنے کی کوشش کرنے لگی شدتِ احساس نے اسے مضطرب و
بیقرار کر دیا۔ سینے کے غار میں سانپ رینگتا ہوا محسوس ہونے لگا اور پھیپھڑے کے
ناسور رسنے لگے ——— لغمانِ زندگی اور اسکے تقاضوں سے مجبور ہو کر آخرکار جنگ کے
ہولناک آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ کہ شاید اس طرح نامرادیوں اور ناکامیوں کا
زخم بھر جائے ——— اور اس نے اپنے سینے کے زخموں میں خراش پیدا ہونے لگی۔ ڈاکٹر
کہتے ہیں یہ غار پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں ——— زخم جلد جائیں تو مرض پر قابو پانا مشکل
نہیں ——— زیدی کے چہرے پر تبسم کا پردہ پھاڑ کر اداسیاں اور مایوسیاں جھلکنے
لگیں ——— "سوچا مت کیجئے آپ خوش اور بے فکر رہنے کی کوشش کیجئے" ——— اور
نرسیں استراحت کے گھنٹوں میں تاکید کرتیں "خالی الذہن ہو کر آرام کیجئے" ——— آرام!
آرام کے خیال ہی سے شیما کی روح بیقرار ہو گئی، سینہ پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔
تڑپ کر کروٹ بدلی اور کھانستے کھانستے بے دم ہو گئی ——— پل میں اگالدان تازہ
تازہ خون سے بھر گیا اور شیما لاش کے مانند بستر پر گر گئی۔
دور آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے نغمے فضا میں ارغنوں کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے
اور تاریک رات کا سینہ صبحِ کاذب کی سپیدی سے چاک ہو رہا تھا۔

شائستہ اختر سہروردی

پیدائش جولائی ۱۹۱۵ء تعلیم پہلے گھر پر ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۳ء تک۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز لندن۔ تھوڑے عرصہ تک کنگس کالج لندن۔ شادی ۱۹۳۳ء۔

بچپن سے لکھنا شروع کیا، لیکن ۱۹۳۲ء میں پہلے پہل رسالوں میں مضامین بھیجنے شروع کئے۔ عصمت سے مضمون نگاری کی ابتدا کی، اور اب تک زیادہ تر اسی میں لکھتی ہوں، لیکن ہمایوں، چمنستان، تہذیب نسواں، منادی، ادبی دنیا اور سب رس وغیرہ میں بھی مضمون لکھے ہیں،

مضمون نگاری کی ابتدا گھریلو معاشرتی مضامین سے کی، صرف تین سال سے افسانے شروع کئے ہیں اور ان سالوں میں بھی بہت کم لکھے ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی اردو میں کم لکھے ہیں،

انگریزی میں اسٹیٹسمین وغیرہ میں مضامین لکھنے کے علاوہ اردو ناول اور مختصر افسانہ نگاری پر مقالہ لکھا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے۔

شائستہ اختر سہروردی

شانتی

ہم لوگ زہرا کے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے چاء پی رہے تھے۔ لیلا نے چائے کی پیالی میں شکر ڈالتے ہوئے پوچھا "کیوں زہرا مالتی کو نہیں بلایا۔؟"

"بلایا تو تھا، لیکن وہ اب تک ہسپتال میں ہے"۔

"ہسپتال میں کیوں؟" ہم سب نے ایک آواز سے پوچھا۔

"آپریشن کرایا ہے"۔ زہرا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"آپریشن کیوں، کاہے کے لئے"۔ ایک دو نے فکریہ لہجہ میں پوچھا۔ لیکن باقیوں کے چہرے کو دیکھ کر فکر استعجاب میں بدل گیا۔

"تم سب ہنس کیوں رہی ہو، بات کیا ہے؟ ہمیں بھی تو بتاؤ"، لیلا نے اور ہم نے زہرا اور ارملا وغیرہ سے کہا۔

"جیسے آپ کچھ جانتی ہی نہیں ہیں، جناب یہ تو آپ لیڈی ڈاکٹروں ہی کی مہربانی ہے

کہ جس عورت کا دل چاہے ماں بننے کی مصیبت سے بچ جائے"۔ زہرا نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے"۔ پھر ایک دم سے سب کی سب نے اس موضوع پر رائے زنی شروع کی۔

میں انکی گفتگو خاموشی سے سنتی رہی۔ میری نظروں کے نیچے شانتی کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور خوفزدہ چہرہ پھر رہا تھا۔

اُف! اسوسائٹی کتنی ظالم، کتنی سنگ دل، کتنی منافق تھی۔ اسکے قوانین کس طرح آہنی زنجیروں کی طرح غریبوں کے ہاتھ پاؤں، انکی روحوں تک کو جکڑے ہوئے تھے! اور روپیہ کی کنجی سے امیر اس کو آسانی سے کھولکر الگ پھینک دیتے تھے۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں"۔ زہرا نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں صرف یہ کہ روپیہ والوں کے لئے دنیا میں کتنی آسانیاں ہیں۔ غریب بھی کرنا چاہیں تو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے"۔

"رہنے بھی دو، تم تو ایسی ہی فضول باتیں کرتی ہو ——— غریب عورتوں کو تو کوئی دقت ہی نہیں ہوتی۔ روز حرام زادیاں بھی کرتی رہتی ہیں، دقت تو ہمیں ہوتی ہے ڈاکٹروں کی خوشامد کرو، پچاس بہانے کرو، ڈبل فیس دو۔ تو کہیں جا کر راضی ہوتے ہیں۔"

"اور کیا" ارمیلا بولیں "آخر ڈاکٹر مارٹن نے امر تا کے دفعہ میری ایک نہ سُنی۔ ہزار میں نے کہا کہ .... میرے دو بچے ہی مجھ سے نہیں سنبھلتے، میں مر جاؤں گی، لیکن نہ راضی ہونا تھا نہ ہوئی۔ اور ان کمینوں کا کیا، دنیا بھر کی بدمعاشیاں کریں،

اور ایسے گر معلوم ہوتے ہیں کہ صاف بچ جاتی ہیں۔"

"میم صاحب، ڈاکٹر میم صاحب میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، پیر پڑتی ہوں بھگوان کے لئے مجھ پر کرپا کرو۔ یہ پاپ میری جان سے دور کرو۔ میم صاحب میں تمہارے پیر پڑتی ہوں، میم صاحب میرا آدمی مجھے مار ڈالے گا۔"

شانتی کا یہ کہکر لرزتے ہوئے میرے پاؤں پر گرنا مجھے یاد آگیا۔ اسکی آنکھوں میں کتنا خوف تھا، کتنا ڈر تھا، کتنا زیادہ ڈر، وہ آنکھیں مجھے نہیں بھولتیں، اب بھی نہیں بھولتیں، اسکی چیخ اس جانور کی چیخ کی طرح تھی جس کے پیچھے شکاری آرہا ہو۔

شانتی صرف دو دن ہسپتال میں زندہ رہی۔ بلکہ صرف ڈیڑھ دن اور دو راتیں، اس میں زیادہ وقت اس پر غشی کا عالم تھا، لیکن بے ہوشی میں بھی خوف سخت خوف اس طاری تھا، جب ہم لوگ اس کو ہاتھ لگاتے، یا اسکے قریب آتے تو وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھتی یا بھاگنے کی کوشش کرتی کبھی چلاتی مجھے مت نکالو، میم صاحب مجھے مت نکالو، میں کہاں جاؤں گی۔ میں تمہارے ہاں پڑی رہوں گی، میم صاحب مجھے معاف کردو" کبھی چلاتی۔ "مت مارو مجھے مت مارو۔"

ایک دفعہ اسکی نبض دیکھ رہی تھی، تو اس کو دھیرے دھیرے کہتے سنا "میری شال بھی لے لی، میری شال بھی لے لی۔"

"کس نے" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"میرے آدمی نے سب چیزیں لے لیں۔ میرے بیس تولے کے پاؤں کے توڑے تھے بیس تولے وہ بھی لے گئے، اور شال بھی، میری لال شال، کلکتہ میں لی تھی بارہ روپے کو، وہ بھی لے لی۔" یہ کہکر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی، جیسے کہ وہ بچہ جس

سے کہ کوئی کھلونا چھین لے۔

یا اللہ! یہ کون ہے۔ اس کا کیا قصہ ہے۔ مجھے اس سے بجد ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ بیس بائیس سال کی عمر کی معلوم ہوتی تھی، اور اسکی زبان دیہاتیوں جیسی تھی، اس کی صورت باوجودیکہ سخت درد و کرب میں مبتلا تھی، بہت ہی بھولی بھالی تھی جسم گول گول بھرا بھرا، رنگ سا نولا مگر نمکین۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ لڑکی دیہاتی خوبصورتی کا نمونہ ہوگی، اگرچہ اس وقت چہرے سے انتہائی انتشار کے اور کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

وہ کوئی ساڑھے تین بجے ہسپتال میں داخل ہوئی۔ اسکے قے ہو رہی تھی اور برابر قے ہوئے جاتی تھی، اور اسکی آنکھیں اور جسم پیلا ہونے لگا تھا، ساتھ ہی ساتھ اس کی کمر میں سخت درد تھا۔ اور وہ مرغی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

میں تو صرف ہاؤس سرجن ہوں، بڑی ڈاکٹرنی نے سخت قسم کا جانڈس تشخیص کیا۔ رات کے ۹ بجے جب میں ڈیوٹی پر آئی، اور شانتی نے بلک کر کہا "میم صاحب بھگوان کے لئے میم صاحب میرے پر دیا کرو، میری جان بچاؤ، میرا پاپ نکال دو"۔ تو اصل قصے کا پتہ چلا۔

"تم نے کیا کھایا تھا بتاؤ"

"کچھ نہیں میم صاحب کچھ نہیں"۔ اس نے ڈری ہوئی آواز سے کہا۔

"دیکھو شانتی ہم ڈاکٹر ہیں، اگر ہم سے بھی سچی بات چھپاؤ گی، تو ہم کیسے تمہارا علاج کر سکیں گے۔ بتاؤ کیا کھایا تھا تم نے"؟

"دوائی میم صاحب"!

"کیسی دوائی"

"معلوم نہیں میم صاحب میرے دن چڑھ گئے تھے، اسکے واسطے میم صاحبہ"
میں بڑی ڈاکٹرنی کے پاس گئی، میں نے کہا میرے خیال میں اس کو کسی نے گندھک
کاست دیا ہے اس سے جانڈس کے آثار پیدا ہو گئے ہیں"۔ میری تشخیص کو صحیح مانتے ہوئے
فوراً بڑی ڈاکٹرنی نے "باؤل واش" وغیرہ کا حکم دیا۔
"اور ڈاکٹر" میں نے دبی زبان سے کہا:" اگر اس کو کیورٹیٹ کرا دیجیئے، تو اس کے
دل سے بڑا بوجھ اتر جائے گا، اور یہ بچ جائے گی، وہ دہشت سے مری جا رہی ہے"۔
"میں اور کچھ نہیں سننا چاہتی"۔ ڈاکٹرنی نے اپنی کرخت آواز میں مجھ سے کہا۔" تم
جانتی ہو میڈیکل پروفیشن کا کیا اصول ہے، اور تم جو کہہ رہی ہو، وہ کتنا بڑا جرم ہے"۔
"جی مجان بچانے کے لئے" میں نے پھر ہمت کر کے کہا، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ شانتی ہول
اور خوف سے مری جا رہی ہے" اگر اس کے خوف کی بنا دور کر دی جائے تو وہ بچ جائے گی"
لیکن جسم کے ڈاکٹر دل کی بیماری کو کیا سمجھتے، ذہنی کیفیت کا کیا خاک اندازہ لگا سکتے
ڈاکٹرنی نے کیورٹنگ کی اجازت نہ دی، اور میں ناامید ہو کر شانتی کے پلنگ کے
پاس بیٹھ گئی۔

اُسے اب تک ہوش تھا" میم صاحبہ مجھ پر دیا کرو، میم صاحب"، اُس نے پھر ٹیک
کر مجھ سے کہا اتنے میں بڑی ڈاکٹرنی خود آ پہنچیں، اور انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ
شانتی سے کہہ دیا کہ اس کو نجات نہیں دلائی جائے گی، بلکہ ہر ممکن کوشش کی جائیگی کہ
وہ اس آفت میں مبتلا رہے۔ ہاں۔ جان۔ بے شک جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی
جائیگی۔

جیسے پیاسے کو پانی ملے ویسی ہی مایوسی شانتی کے چہرے پر چھا گئی۔ ایک جگر شگاف چیخ کے ساتھ وہ میرے پاؤں پر آ گری۔ اسکے بعد پھر اس پر غشی طاری ہو گئی، لیکن غشی اور غنودگی کے عالم میں بھی خوف جگر ہلا دینے والا خوف اسکے دل سے مٹ نہ سکا۔

رات بھر میں اسکے پاس بیٹھی اسکے کرب و بے چینی کو دیکھتی رہی۔

صبح میرا "آف ڈیوٹی" کا وقت تھا۔ لیکن میں شانتی کو بھلا نہیں سکی، وہ دفعہ دیکھنے آئی، دوپہر کے بعد معلوم ہوا کہ بڑی ڈاکٹرنی صاحبہ نے کیورٹینگ ضروری سمجھا اور اجازت دے دی، لیکن افسوس اب شانتی بالکل بے ہوش تھی، اسکی سانس میں گڑگڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ میرے کئی بار آواز دینے پر اُس نے آنکھیں کھولیں، پران میں موت کی دھند چھا چکی تھی۔ میں نے کہا "شانتی تمہارا آپریشن کر دیا۔ اب فکر کی بات نہیں"۔

اُس نے لڑکھڑاتی آواز سے کہا "ہاں لڑکی ہو رہی ہو کر مر گئی۔ لیکن لڑکی (شانتی) میری لڑکی گڑیا جیسی تھی، چھ روز کی ——— اور پھر اسکی آواز بیٹھ گئی۔

اُس روز رات کے نو بجے شانتی کے کرب و بے چینی کا خاتمہ ہو گیا۔ موت نے اسکے چہرے پر اطمینان اور سکون چھا گیا۔ اسکے لبوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسکے پلنگ کے آس پاس چادر کھینچ دی اور باہر نکل آئی۔

اس کا کوئی وارث نہیں تھا، صرف اسکی ایک جان پہچان عورت اور اس کا ایک شوہر جس کے یہاں وہ نوکر تھی۔ اسکے کہنے سے آکر لاش کو لے گئے

شانتی کی زندگی کا قصہ کیا تھا، میں معلوم نہیں کر سکی اسکی اس جان پہچان عورت نے صرف اتنا بتایا کہ شانتی جے پور کی رہنے والی تھی، اسکے شاید دو بھائی اب بھی زندہ ہیں، پہلے اسکی شادی چھٹپن میں کر دی تھی۔ شوہر بڑا ظالم تھا، جب

تک ماں زندہ تھی اسکے پاس بھاگ بھاگ آتی رہی، لیکن ماں کے مرنے کے بعد بھائی بھاوجوں نے مُنہ نہیں لگایا اور وہ ہر طرح کے ظلم سہتی اور برداشت کرتی رہی یہاں تک کہ شوہر نے کلکتہ لے جاکر وہاں پردیس میں اسے گھر سے نکال دیا۔ اس عورت سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی، اس نے رحم کھا کر اپنے گھر میں پناہ دی۔ اور نوکر رکھوا دیا۔ دس مہینے سے نوکر تھی اور بڑی خوش، مالکہ بہت مہربان تھیں، لیکن ساتھ ہی بہت سخت مزاج۔ آوارگی کی بھنک بھی سن لیتیں تو نکال باہر کر دیتیں، لیکن جوانی دیوانی ہوتی ہے، شانتی کا قدم لڑکھڑا گیا۔ اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ انہی دنوں اس کا شوہر جو فوج میں چلا گیا تھا اور لا پتہ ہو چکا تھا، واپس آ گیا، اور اس کو واپس لے جانے کے لئے اصرار شروع کیا۔

شانتی بھولی کم عمر، ناتجربہ کار، شانتی کے ہوش غائب ہو گئے۔ وہ قصائی شوہر جس نے بے قصور بھی تو ہڈیاں توڑی تھیں، وہ اب جبکہ قصوروار تھی کیا نہ کرے گا۔

وہ خوف اور دہشت سے پاگل ہو رہی تھی۔ ایک ایک سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنے درد کا درمان پوچھتی تھی، لیکن گنہگار سے کیسے ہمدردی ہوتی ہے؟ ہر کوئی نفرت سے مُنہ پھیر لیتا تھا، ادھر ظالم شوہر —— روزانہ دھمکیاں دے رہا تھا کہ اگر اسکے پاس واپس نہیں آئی تو نالش کر دے گا۔

شانتی پر کیا گذری ہوگی، کیا کیا ذہنی اضطراب —— کیا کیا ہول اور فکر اس نے برداشت کئے ہونگے، اور اس طرح کہ کسی کو اس آگ کا پتہ نہیں چلا، جو کہ اسکے سینے کے اندر جل رہی تھی۔

پتہ نہیں اُس نے گھبراہٹ میں کیا کیا الا بلا کھائی ہوگی، اس کا بدن مرنے کے بعد
نیلا کانچ ہو گیا تھا اور بیماری کے دوران میں پیلا ہلدی۔ پوسٹ مارٹم ہوتا تو معلوم
ہوتا کہ اس جان ہار نے کس طرح اپنی جان دی ؛

شفیق بانو

مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا

مصیبت سے ہے اور مصیبت زیادہ

کوئی ایسی بات نہیں کہ لاکھ مرتبہ کہنے کے باوجود بھی تشنہ تکرار ہو۔ اتنی مرتبہ بیتی باتیں دہرائی ہیں اور مستقبل کے متعلق پیشینگوئی کی ہے کہ اب جی اکتا گیا آپ افسانے مانگئے تو میں ہر مرتبہ ایک نیا موضوع تلاش کروں مگر آپ بیتی تو وہی ایک ہے۔ کچھ اُلٹ پھیر کر دوں تو آپ جھوٹ بولنے کا الزام لگائینگے۔ عہد ماضی کیا سناؤں جسکی تلخیاں اب تک ہونٹوں پہ .... معاف کیجئے" دل پر انگارے کی طرح پڑی دہک رہی ہیں اور حال؟ .... کوئی ایسا مخلص نہیں جو میری کامیابیوں پہ ہمت افزائی کرے نہ آپ میں سے کوئی ایسا ہمدرد ہے جو میری تکالیف کا ازالہ ڈھونڈے، سو کچھ کہنا سننا لاحاصل ہوگا .... پھر بھی ندیم صاحب کے مطالبے پر انہی کا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

مختصر یہ ہے داستان حیات

پھول ڈھونڈے ہیں خار پائے ہیں

ممکن ہے کہ یہ انکی بھی داستان حیات ہو .... میری تو یقینی ہے.......

شفیق بانو

شفیق بانو

فریب مسلسل

کسی کو تاش کھیلنے میں دلچسپی ہے، کسی کو لڈو سے ـــــ کسی کو اخبار بینی سے ـــــ کسی کو دولت سے، کسی کو قیمتی پتھر جمع کرنے سے ـــــ غرض کبھی نہ کسی چیز سے ضرور ـــــ لیکن مجھے؟ صرف "بھائی" کہنے، لکھنے، پکارنے سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ دیوانگی کی حد تک۔

ایک دن یہ فریب کے پردے ہٹ گئے اور میرے دل کے تار جھنجھنا اٹھے ـــــ

کیسے؟ کب؟ کیونکر؟

گو یہ سب کچھ بتانا بہت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ـــــ میں بہت چھوٹی تھی۔ اتنی چھوٹی سی کہ آکا بھائی ایک ہاتھ سے سر سے اونچا کر دیتے۔ میں چیختی "اچھے آکا بھائی میں گری ...... مجھے پکڑو ـــــ نیچے اتارو ـــــ"

آکا بھائی خوب ستاکر، توبہ کرا کے، کان پکڑی کرا کے زمین پہ کھڑا کر دیتے۔

مجھے چھینے میں مزا آتا اور آکا بھائی کو سر سے اونچا کر کے پٹخ دینے کی دھمکی میں لطف

آتا۔

آکا بھائی کی شادی ہوئی۔ میں اب بھی سایہ کی طرح ساتھ پھرتی تھی۔ اُن تمام جذبات

سے بے خبر جو آکا بھائی اور دلھن بھابی کے دلوں میں دھڑک رہے تھے۔

آکا بھائی بعض اوقات بلا وجہ جھڑک دیتے۔ "یہ میرے کمرے کی چیزیں تم ہر وقت

کیوں گڑبڑ کرتی ہو؟ میری یہ کتاب کیوں خراب کر ڈالی؟"

میں چپ سی ہو جاتی ـــ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اب میرے ساتھ برتاؤ کا

انداز کیوں بدل چکا ـــ

ایک دن گھر میں گھومتی ٹہلتی بھابی کے کمرے میں جا پہنچی۔ دروازے نیم وا تھے

میں نے دھڑ سے کھولے، بھابی چونک اٹھیں: "بہت بد تمیز ہو تم شامی ـــ بھلا یوں

بھی کوئی تک ہے آندھی کی طرح آنا۔ طوفان کی طرح دروازے ہلا دینا، توبہ توبہ ـــ

دل دھک سے ہونے لگا"

بھائی پاس کی آرام کرسی پہ بیٹھے بیٹھے غرائے "ہزار دفعہ بیہودہ کو منع کیا کہ اب

بڑی ہو گئی، تمیز سیکھ، لیکن ابھی تک اپنے کو بچہ ہی سمجھے جاتی ہے، جا، ہٹ یہاں سے

دور ہو کمبخت"

میرا دماغ سہم گیا۔ دل سینہ میں کھٹ کھٹ ہونے لگا ـــ جیسے ابھی بند ہو جائیگا

شرمندہ شرمندہ انگلی دانتوں میں دبائے دالان والے تخت پر جا بیٹھی۔

کچھ کچھ احساس ہوا کہ آکا بھائی اب میرے بھائی نہیں رہے۔ اب انکی ساری توجہ

دلھن بھابی کی غزالی آنکھوں میں پیوست ہو گئی ـــ جھلمل جھلمل دو پٹوں کی چمک میرے

آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

دل پر ایک ضرب پڑی اور تار ٹوٹنے کی جھنکار آئی۔ آہ میرے آکا بھائی! کیا واقعی میرا تمہارا رشتہ مدھم پڑ گیا؟ — اس کمبخت جادوگرنی نے .... مجھے بھابی سے سخت نفرت آنے لگی۔ جی چاہا ان کے ریشمی کپڑے نوچ کو پھینک دوں۔

میں اُس دن بات بات پر روئی۔ گھر میں سب نے پوچھا۔ کیوں کیا بات ہے؟ میں کچھ بتا نہ سکی آخر بتاتی بھی کیا؟

میری معصوم محبت پھر اپنا مرکز تلاش کرنے لگی — بغیر محبت میرے لئے جینا کچھ بے معنی سا تھا۔ —

دو تین دن کے بعد سارے گھر کو معلوم ہو گیا کہ شامی اور منجھلے بھائی کی خوب بن رہی ہے ہر روز خوب چیزیں بچا بچا کر شامی رکھتی ہے اور اسکول سے آنے پر اپنے چہیتے منجھلے بھائی کو کھلاتی ہے۔

منجھلے بھائی بھی خوب خوش تھے اور اپنی "پاکٹ منی" میں سے اسکول سے واپسی پر میرے لئے تنگ پھلیاں — امرود — رس بھریاں۔ کیبیرو لاتے۔ میں آتے ہی دونو جیبوں کی تلاشی لیتی۔ گھر کے سب لوگ شاید اب منتظر تھے کہ حسب دستور لڑائی ہو گی اور سب کو ہنسی کا موقع ملے گا۔ میرے سر میں درد ہوا — ہلکا ہلکا بدن بھی گرم معلوم ہوا منجھلے بھائی کچھ والا شو دیکھکر پلٹے تو مجھے بستر میں خاموش پڑے دیکھا۔ "کیوں کیا ہوا؟ تباجی بدلو؟"

"درد ہے سر میں"

منجھلے بھائی محبت کے مارے بیتاب ہو گئے۔ "اور یہ انیل بام" جلدی جلدی لاکر

ملنے لگے۔ اپنی جیب سے سفید ریشم کا رومال نکالا اور باندھ دیا۔ پھر چاروں طرف سے کمبل ٹھیک کر کے اُڑھایا جیسے ماں اپنے بچہ کو ــــ تو گرانی جا چکی تھی، آ کا بھائی اور دلھن بھابی کے سریلے قہقہے خراٹوں میں بدل چکے تھے۔

باورچی خانہ میں بلی کا راج تھا ــ برتن ٹکرا رہے تھے۔ منجھلے بھائی کی آواز آئی "ہش ہش" پھر کوئلے انگیٹھی میں لوٹے۔ نل کھلا۔ پانی گرنے کا شور ہوا۔ چاء تیار ہوئی۔ پھر میری پٹی کے پاس منجھلے بھائی کا ہاتھ آگے بڑھا "شامی سو گئیں کیا؟ لو چاء پی لو میری گڑیا بہن" میرے کانوں میں گویا کسی نے موسیقی کا دریا بہا دیا ــــــ ہائے میرے منجھلے بھائی ــــــ تم نے دھوئیں میں اپنی آنکھیں تھکائیں؟

میں بے ساختہ اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ چاء کو ایک ہی سانس میں جلتا جلتا پی گئی ــــ جیسے اس سے پہلے کبھی اس نعمت کو ہاتھ نہ لگایا تھا! لاکر ذائقہ حد درجہ برا تھا۔ پانی خدا جانے کھولنے بھی پایا تھا یا نہیں۔ شکر شہد کی طرح گھلی ہوئی تھی میں صرف ایک ہی چھوٹا چمچہ پینے کی عادی ہوں پھر بھی مسکراتے ہوئے پی لی۔

منجھلے بھائی اپنی خانساماں گیری پر گویا اترا رہے تھے "شامی دیکھو چاء تو چاء میں تو پڈنگ بھی بہت اچھی پکا سکتا ہوں ــ اور آئس کریم تو مجھ سے بہتر کوئی نہیں بنا سکتا ــــــ آموں کی۔ سنترے کی۔ فالسہ کی۔ انڈے کی غرض سب کی بنا سکتا ہوں ــ اب کے اتوار کو تمہیں بنا کر کھلاؤں گا ــــ پھر دیکھنا ــــــ تم اپنی سہیلی زبیدہ کو بھی بلا لینا"۔

آخرکار کمبخت اتوار آ گیا۔ صبح سے مشینیں صاف کرتے کرتے میری انگلیاں بھی دکھ گئیں منجھلے بھائی متفکر لہجے میں بولے "شامی اور تو خیر سب چیزیں لے آیا لیکن

برف کے لئے پیسے نہیں بچے، اب کیا کروں؟ میرا دل بے اختیار تڑپ کر باہر آ گیا۔ دس روپے تین پیسے کل میری کائنات محفوظ تھی۔ جھٹ بکس کھول موتیوں کا چمکتا پرس، حوالے کیا۔

منجھلے بھائی نے "مالِ مفت دلِ بے رحم" کی طرح خوب خرچ کیا۔ میں بے خبر بیٹھی تھی کہ اچانک دھکا لگا۔

"شامی شامی یہ جلدی جلدی دوپٹہ پر کرن ٹانکو۔ تمہارے منجھلے کی بات تمہارے ہم کا بھائی ٹھہرا چکے ہیں"۔ دلہن بھابی کا یہ کہنا ایک خطرہ کا الارم تھا۔

خدایا کیا میری بھابی آتے ہی میری بے غرض محبت چھین لے گی؟ منجھلے بھائی بولنا کم کر دینگے کیا؟ عید پر کپڑے نہیں بنائیں گے کیا؟ مجھے روز شام کو دہی بڑے کی چاٹ لاکر نہیں کھلائیں گے؟

کرن میری آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ سوئی سے میں جلدی جلدی ٹانکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

آخر کار بھابی آ گئیں۔ میں ہر وقت گھونگھٹ اٹھائے منہ دیکھا کرتی —— بھائی منٹ منٹ میں احکام لگاتے "شامی چاء بنا لاؤ —— شامی دوپہر کے کھانے پر کباب آلو کے تیار کرو۔ اور ہاں میری پتلون پر استری تو کر دو —— میری جراب میلی پڑی ہے دھو دو۔" میں با دلِ ناخواستہ اٹھتی اور سارا دن بتلائے ہوئے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

رفتہ رفتہ عادی ہو چلی۔ بھائی بالکل بدل گئے اب ایک دھیلے کی بھی چیز نہ لاکر دیتے۔ شام کو دفتر سے آتے ہی، سیدھے بھابی کے کمرے میں۔ تمام دنیا کی چیزیں

لاتے لیکن میرے حصہ میں چوُرا بھی نہ آتا۔
کمرے کی صفائی جب کراتی تو کریم بسکٹ کے لیبل، بیر سوپ کے خالی ڈبے،
چاکلیٹ کے جھوٹے رنگین کاغذ ثبوت دیتے کہ یہاں خریدا گیا ہے۔
مجھے اپنی بے بسی پر رونا آجاتا۔ گھنٹوں سوچتی بڑی بھابی سے تو کٹی کر چکی تھی
ماں بچپن ہی میں مرگئی تھیں۔ پھر کس سے جا کر منجھلے بھائی کی شکایت کرتی کہ بیوی کے
آنے ہی بہن کو کیوں چھوڑ بیٹھے۔
ایک دن سر میں درد تھا۔ میں دن چڑھے تک لحاف میں پڑی رہی۔ منجھلے بھائی
کو نوکرانی نے چاء، گندی پیالیوں میں انڈیل دی وہ چیخ پڑے "شامی کہاں ہے؟
کیسی لاپرواہ ہے۔ بہن ہو کر اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ اپنا بھائی یونہی دفتر چلا جائیگا"
نوکرانی رونی آواز میں بولی" سر میں درد بہت ہے بٹیا کے" منجھلے بھائی
جھنجلا کر بولے" بہانہ ہے بہانہ — بس اب میں اپنی بیوی کو لے کر الگ ہو جاؤنگا
اس گھر میں سب خود غرض اور مکار ہیں۔ تھوڑا روپیہ ہے باقی زیور بیچکر چھوٹی سی کوٹھی
بنوالوں گا —"
منجھلے بھائی کی چیخیں مجھ تک پہنچیں۔ دل ٹوٹ گیا۔ بہت رونا آیا۔
یا اللہ کیا کروں؟
ایک سال میں چھوٹی سی حسین کوٹھی تیار ہو گئی اور منجھلی بھابی معہ اپنے دو عدد
بچوں کے روانہ ہونے لگیں۔ مجھ سے جھوٹے منہ سے بھی نہ کہا کہ "شامی تم بھی ہمارے
ساتھ چلو"۔ بلکہ میں رسالہ لینے کے بہانہ گئی تو اپنی چیزیں پیک کرتے ہوئے انتہائی
خوشی کے ساتھ گنگنا رہی تھیں —

ایک چھوٹا سا بنگلہ بناؤں گی نیارا..........

ایک چھوٹا سا..........

میں جل ہی تو گئی ——— یہ کمبخت بھاوجیں کتنی سنگ دل ہوتی ہیں ———
شوہر کی بہنوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہوتی نہ محبت ——— خواہ ساری عمر ساتھ
رہیں۔ لعنت ہے ایسی بے حسی پر ———

مجھ سے زیادہ دیر کمرہ میں ٹھہرا نہ گیا ——— میری محبت پاش پاش ہو چکی تھی۔ ہارے
ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے واپس آ گئی ———

شام کے سکوت میں کوئی راہگیر گاتا جا رہا تھا ———

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی

بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

رات بھر نیند نہ آئی ——— منجھلے بھائی اور بھابی بات بات پر کھلے پڑے تھے ———
میرے اوپر جو رنج و صدمہ گذر رہا تھا اسکی کسی کو مطلق خبر نہ تھی ———

آہ میں کتنی بدنصیب ہوں ——— ماں مری۔ آکا بھائی نے رخ بدلا منجھلے بھائی
کا آسرا تھا وہ بھی اپنی دُنیا الگ کر کے چل دئے۔ اب کس شغل میں دل بہلاؤں؟
اب لے دے کر ایک چھوٹے بھیا رہ گئے تھے۔ جن سے میری ایک منٹ کو بھی نہ
بنتی تھی۔ جن کی کاپیاں چھپا چھپا کر میں غصّہ میں پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ مجھ سے صرف
دو سال بڑے تھے۔

آج خود بخود مجھے اُن پر ترس آیا۔ ارے یہ ہے میرا بھائی! اگر ماں زندہ ہوتی تو پھر یہ
گندے کپڑے میلے کوٹ کیوں پہنتا؟ کھانے کو بھی دلہن بھابی بچے کا بچا کھچا دیتی ہیں۔

یہ تو میرا فرض تھا میں ہر وقت لڑنے میں گرفتار رہی ——— توبہ توبہ ——— جو کم ظرف تھے آکا بھائی اور منجھلے بھائی۔ اُن کے ساتھ تو میں نے جان لگادی اور اس بیچارے کا نام بھی جلن سے میں نے "بھونڈو" رکھ دیا ——— اُس روز بھونڈو کہنے پر جل ہی تو گیا۔ اتنی زور سے دھکا دیا کہ کرسی سمیت سجدہ میں جا پڑی ——— قصور تو میرا ہی تھا۔ اے ہے میرا بیچارہ بھائی ——— !

دل نے فیصلہ کرلیا کہ دراصل محبت کرنے کے لائق صرف چھوٹے بھیّا ہیں باقی سب نالائق۔ اب میری خدمتیں شروع ہوگئیں۔

بستر بدلا۔ تکیہ پر سفید پھول راتوں رات بیٹھکر بنایا۔ لحاف میں نئی روئی بدلوائی جوتے پر پالش کی مبلے دریغ آکا بھائی کی پالش کا ناس لگایا۔ ایک کرتے میں گرمیوں کے لئے بیل بھری ——— اپنے دوپٹہ کی ململ میں سے گز بھر ٹکڑا پھاڑا اور آدھی درجن دستی رومال جالی کے تیار کر کے دئے چھوٹے بھیّا بس میرے بن گئے۔ اپنی "پاکٹ منی" میرے پاس رکھتے۔ شام کو مجھ سے کہہ کر جاتے کبھی کبھی خبر لاتے۔ "آج بڑا اچھا کھیل آیا ہوا ہے۔ میری شامی کھنو ——— بڑی اچھی ہے مجھے دو روپیہ دیجیے۔"

میں اپنی جان پر مصیبت جھیل جھیل کر چھوٹے بھیّا کو خوش رکھتی ——— بڑی بھابی سے لڑ جھگڑ کر پراٹھا ناشتہ میں پکاتی ——— غرض اب میری ساری اُمیدیں چھوٹے بھیّا کے دم سے وابستہ تھیں ———

سال گذر گیا۔ چھوٹے بھیا میری گذشتہ شرارتیں قطعی بھلا چکے تھے۔ اب سنجیدگی سے مجھے بہن شاہی پکارتے تھے۔ ورنہ پہلے تو چڑیل۔ مردار۔ کتیا۔ بد تمیز۔

شیطان کی خالہ کے مناسب ناموں سے نوازا کرتے تھے۔ اب مجھے اپنی شرارتوں پر خود ہی ہنسی آجاتی تھی۔

قدرت کی زبردستی تو دیکھو جس چیز کو چاہتے ہیں کہ ہمیں مل جائے۔ نہیں ملتی اور جس چیز سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ ملتی ہے۔

برسات کی رات تھی۔ میں نے بڑی محنت سے بھیّا کی فرمائش سے کریلے پکائے اور خوشبو ڈال کر بادام کی فیرنی ـــــــ

آدھی رات گذری تھی کہ اچانک میرا بھیّا گھبرا کر اٹھا "میری شامی بھئی۔ جلدی آؤ۔ دیکھو مجھے پکڑو ـــــ میں چلا ـــــ ہائے اللہ ـــــ میں نے دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ بستر پہ الٹی کر دی تھی۔ اپنا بستر بدل کر صاف بستر پہ لٹایا۔ امرت دھارا جلدی سے پلایا ـــــ ہزاروں دعائیں مانگنے لگی۔ اللہ میرے چھوٹے بھیّا کو بچا دے۔ میں لٹ جاؤں گی۔ بس میرے پاس یہی دولت ہے۔

چھوٹے بھیّا کو جھک جھک کے تکتی رہی کبھی آوازیں دیتی "میرے چھوٹے بھیّا! آنکھیں کھولو" ـــــ

اچانک ایک خوف سا دل میں آیا اور بے اختیار آکا بھائی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ وہ برآمدے میں برقی پنکھے میں دنیا جہاں سے بے نیاز سو رہے تھے ـــــ

"اچھے آکا بھائی جلدی دیکھو چھوٹے بھیّا کو تو نہ جانے کیا ہوگیا ـــــ قے ہوئی اور ہچکیاں آرہی ہیں ـــــ ہائے میرے چھوٹے بھیّا"

آکا بھائی حالت دیکھتے ہی دوڑے ڈاکٹر کو لینے ـــــ میرے بھیا نے وہ سیپی

کا انتظار بھی نہ کیا ——

"شامی پانی .... پانی .... پانی .....!" پانی کا گھونٹ
پیتے ہی آنکھیں بند کر لیں

شامی بھیّو پکارنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا آہ پہلے دو فریب تو نہس ہنس کر کھا لئے تھے۔ لیکن یہ حادثہ فریب سے بے نیاز تھا ——

میری حالت بہت دردناک بن گئی —— سال بھر تک پاگلوں کی سی کیفیت رہی —— بڑی بھابی نے آکا بھائی کو صلاح دی کہ شامی کی کہیں بات لگا کر قصہ ختم کر دو جو غم بہلے ——

یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ شوہر کی ناز برداریاں بھی چھوٹے بھیا کو نہ بھلا سکیں بعض وقت چاروں طرف سے آوازیں آتی ہیں

"شامی بھیّو —— شامی —— شامو —— میرے لئے تم رو رہی ہو ؟"

آہ چھوٹے بھیّا —— کاش تم زندہ رہتے اور بلا سے آکا بھائی اور منجھلے بھائی کی طرح فریب ہی دے دیتے۔ مجھے صبر آجاتا۔ بس تم زندہ رہتے ——
میرے چھوٹے بھیّا —— !!

شکیلہ اختر

"میرے خاندان میں بہت پہلے سے ادب کا ذوق تھا اور بچپن ہی سے میں اپنی اماں جان اور ابّا جان کو بڑے شوق سے پرچے اور کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر اپنی "حکایاتِ شیریں" کی کتاب جلد سے جلد ختم کر دینے کی کوشش کرتی تھی کہ میں بھی انہیں پڑھنے کے قابل ہو جاؤں، مگر افسوس کہ ہمارے مکتب کے مولوی صاحب پڑھانے سے زیادہ توجہ اس پر دیتے تھے کہ لڑکیوں نے اُن کا گھر صاف کیا یا نہیں، پانی بھر دیا گیا یا گھڑے ابھی خالی ہیں اور اس وقت کا مسالہ کون پیسے گا؟ ــــ بعض لڑکیوں کے ساتھ کبھی کبھی زندگی کی ان حقیقتوں سے میں بھی آشنا ہو جاتی تھی ــــ ایک قصبہ کا مکتب جس کے بچھے ہوئے ٹاٹ پر لڑکیاں بیٹھ جاتیں اُن کا بستہ سامنے ہوتا۔ کوئی کتاب کھلی ہوتی اور لڑکیاں اپنے اپنے بستے کے اندر سے مزے مزے کی چیزیں نکال نکال کر مسلسل کھاتی رہتیں۔ کسی کے بستے میں چوڑے اور گڑ رہتے۔ کوئی بھونٹ اور مکئی کا بھونا لاتا ــــ اور کوئی چاول کی روٹی ــــ تو اسی طرح دوسروں کے چوڑے اور گڑ کھا کھا کر میں پرچے پڑھنے لگی ــــ بہت سے پرچے آتے تھے ان دنوں نیرنگِ خیال چھپا یا ہوا تھا اور عصمت کے پرچے بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، در اصل "محفلِ تہذیب" اور "بزمِ عصمت" نے آگے بڑھنے میں میری ہمت افزائی کی ہے اور اسکے بعد میں چھوٹے چھوٹے انشائیے لکھنے لگی تھی جو اکثر چھپ چکے ہیں۔ میرا پہلا افسانہ "عصمت" ۱۹۳۶ء

ہیں ادب لطیف کے کسی نمبر میں چھپا تھا جسے سب لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ اس کے بعد سے میں افسانے ہی لکھنے لگی ہوں۔ کئی نظمیں بھی لکھی ہیں جو ایسے ہی پڑی ہوئی ہیں۔ مجھے غزلوں سے کبھی کوئی لگاؤ نہ رہا۔ میرے افسانوں کا ایک مجموعہ "درپن" کے نام سے مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہو رہا ہے اور دوسرا مجموعہ "آنکھ مچولی" سنگم پبلشنگ ہاؤس سے چھپ رہا ہے۔"

شکیلہ اختر

شکیلہ اختر

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی، دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور جب اسکی زندگی کا دوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی کی سریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی۔ اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی اسکی سجی سجائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائیکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے موٹروں سے وہ اکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اسکے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھنچ جاتے، برج کا دور چلنے لگتا یا ٹینس اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ مرغی ہوتی

لال پیلی جلدوں کی کتابیں دبائے کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بلّے اور گیند لئے ٹینس لان پر اُچکنے لگتے۔ اور ہر روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اسکے شوہر فیضی کے ملنے والے آتے رہتے۔ ڈرائنگ روم برآمدہ اور کنجی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے۔ اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیضی کا ذوقِ ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھا جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں۔ کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہیں دوڑائی جاتیں، گہرے اور دقیق مسئلوں اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے قہقہے گونجتے ہنسی کی لہریں اٹھتیں۔ اسکی کوٹھی میں زندگی لہراتی تھی مگر ان سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو ایک بے تحاشہ وسیع خلاء میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دے رہی تھی، وہ دیر دیر تک پردے کے پیچھے کمرے کے دریچے پر بیٹھی انکی باتیں سنتی، ان کے تماشے دیکھتی اور ہر ایک کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے اور چائے سے اُن کی خاطریں کرتی رہتی تھی، پس پردہ اُس نے ان رنگینیوں میں اپنے کو بہلانا چاہا تھا مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی، یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر ایک پر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی ایک گھر ہوتا، بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گذار کر اب تھک گئی تھی، تاش کے پتے، کیرم کی کھٹا کھٹ اور موتو ملی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی دیکھ رہی تھی، بلّے اور گیند کی ہر ایک ضرب نے اسکے دل کو مجروح کر دیا تھا اور ادب، دنیا اور نظامِ حیات، کے گہرے گہرے تبصرو ں

نے اسکی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے بیچ بھی وہ خود ایک اجاڑ ویرانہ میں اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی۔ اپنی سجی ہوئی کوٹھی سے اب اُس کا جی بیزار ہو چکا تھا، سارے گھر بھر اور ڈرائینگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی، اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہتی تھی، مگر ان ساری چیزوں سے اب اُس کا دل بھر گیا تھا ایک مدت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھیں پتھرا گئی تھیں آتشدان پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر جھین جھین گرد دیکھکر بھی اب وہ بے پروا رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیائیں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سجیں پڑی تھیں رنگ برنگ کی کھپکڑے اور مٹی کی گڑیا جنکے کپڑے نمک کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے۔ اور اُن کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں مگر وہ بےحس و حرکت تھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اس کو محسوس ہونا جیسے وہ خود بھی مٹی یا کھپکڑے کی ایک بے جان سی گڑیا ہے، اس پر بھی ایک جگہ بیٹ گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اسکی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں، اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ کھرچنیں اسکے دل پر پڑ گئی تھیں انہی کی طرح اسکے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی، وہی مردنی سی بےحس مسکراہٹ، اب تک وہ انجانی طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی کھلونے، اور مٹی کی بے جان خاموش گڑیوں سے ـــــ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اُس کا جی بے اختیار یہ چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی پوچھتا رہے۔ اسکی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک

چیز کو نئے سرے دیکھنا چاہتی تھی، اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبے بالوں والے ان جھکتی ہوئی ساری
نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دیتا اور اس کا منہ چڑاتی، ان مسکراتی ہوئی بھیں
گڑیوں کو توڑ تاڑ کر کوئی اسکی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا وہ چاہتی تھی کہ میز اور
کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگار دان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے، اس
صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اُس کا جی اُکتا گیا تھا، وہ کوئی تبدیلی چاہتی
تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل
کو دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک حصے میں وہ رسی کی بھدی
بھدی الگنی ٹانگ کر ان پر ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دے، عجیب عجیب سے بے ہنگم کپڑے
جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے سب سے زیادہ اس کو اپنی بیکاری کھلتی رہتی۔ سارا
کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی
رہتی، لکھی ہوئی سطریں جب اسکی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اٹھ کر اکیلی
کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، کبھی باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ڈاکیہ
کی آواز سنتے ہی وہ خود ہی ڈاک لینے چلی جاتی، ترکاری والی دھوبن اور دودھ والیوں سے
وہ خواہ مخواہ کی مہمل سی باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی، ایسا کرتے ہوئے اسکی خودداری
کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اسکی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی
کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گذر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پہ کھڑی
وہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی ——!

اسکی کوٹھی سے لگی ہوئی کوٹھی میں گھوش بابو تھے۔ خوبصورت نازک سے خوش نظر
اور خوش سلیقہ، اُن کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونہ گلنار جنت بنا رہتا۔ انہیں پھولوں

سی فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا، وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں، وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے، شگفتہ خوبصورت رنگین اور خاموش ـــــ ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا۔ مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آگیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، دبلا پتلا حسین سا بچہ جب غوں غاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہو کر "ماں ماں" کہکر شور مچانے لگا تو ایک دن پڑوسن اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب ماں نہیں امی بولو امی" ـــــ اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے جنگلے کو پکڑے دو ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پڑوسن کی "امی امی" کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اسکے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اوپر سے اچک اچک کر چیخنے لگا ـــــ "امی امی" پہلے تو پڑوسن نے سمجھا کہ گلاب اپنا سبق یاد کر رہا ہے مگر جس دن اُس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی امی کہکر وہ خود اُسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اسکے دل میں پیدا ہوئی۔ ـــ "امی ـــــ امی"۔ یہی پیاری سی آواز سننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی۔ ـــــ! اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اسکی روح میں پرخلش انگڑائیاں آچکی تھیں۔ مگر اس آواز نے اُسے ہولناک طور پر بیدار کر دیا تھا ـــــ یاقوت کی طرح سُرخ لب اور چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" ـــ تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی ـــــ "میرا گلاب، میرا گلاب"۔ وہ اسکے سارے گھر بھر میں ایک تیتری کی طرح دوڑتا رہتا ـــ اور جب الھوش بالو

کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کوئی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کس کا بچہ تھا۔ —— اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اسکی روح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا ——!

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور دیکھا یک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا۔ رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اسکی رگ رگ میں ہل چل مچادی تھی، اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی —— "امّی —— امّی" کہتا ہوا گلاب جب اسکی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی: "گلاب تم گلاب ہو نا؟ اور میں تمہیں ایک ننھا سا چمبیلی کا پھول دوں گی۔ لوگے نا؟" پھر اسکی نگاہیں چمبیلی کے اس حسین سے پھول کے تصور پر جم جاتیں۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ، بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں، سر پر اسی کی طرح گھنگریالے بال، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا اور کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا پیا قوتی ہونٹ!—— یہ سب کیا ہو رہا تھا کیسے ہو رہا تھا۔ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی، اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے۔

فیض نے جب یہ خبر سنی تو مسرت سے وہ جھوم گیا پھر اسکی بڑی خاطریں ہونے لگیں اسکے سونے کے کمرے میں سرخ سرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے —— فیض حسن کا شیدا اور شعر و ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا، اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار

ہوتی ہوئی پروین کی نگاہوں کا پہلا نظارہ حسین اور لطیف ہو اور انہی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے اس آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ——— !

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دُنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوتے تھے۔ پیسے میں دو دو ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں ——— شاید خود عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو جمیلی کا نازک سا پھول اسکے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کالے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے لئے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پر سکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کبھی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا ——

"امی امی !" اور پروین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی ——— پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا ———

"امی! امی! ہم کو ماں - بن بن" —— یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک لطیف انتظار تھا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی۔ اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اسکے پاس چکر لگاتے کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دور۔ اسکے گرد منڈلاتے

ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اسکی رُوح سے سرگوشیاں کرتے" چنانچہ پھو
اسے ٹیگور کی کہانی یاد آ کر دہلا دیتی پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اسکے
بہت سے پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے۔
" امی نا" ——— اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ———
" امی نا" ——— " امی نا" ——— " امی نا" ——— لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانے کی
وہ بچی یاد آ جاتی جسے تالا بولنا نہ آتا تھا اور وہ الماری، شلف اور کیواڑوں کے پیچھے چھپ
چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی " امی جیکو" ——— " امی جیکو" اور
اسکی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا منحوس کھیل کھیلنے سے
ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں سر کو دھنتی " امی جیکو" ——— " امی جیکو"
کہتی ہوئی وہ بچی ماں کی ڈھونڈھتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی! اور
اب یہی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے۔
زندگی کی ایک جلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی ——— وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن
نقاہت کے اس پردے میں اسکی بیتابانہ مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب
کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا
چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اسکے سارے
جسم کو کپکپا دیتا ——— شاید ——— شاید اسکی رُوح کا ایک فریب ہو اور اگر یہ صرف
ایک خواب تھا۔ تو وہ اُسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی۔
——— اسکی مسہری کے چاروں طرف دیوار میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں
فیض نے لا کر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں۔ کسی کے بال گھنگر یالے تھے

کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ۔ کوئی ہمک ہمک کر اسکی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُسے بلا رہا تھا ——— پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے سارے بچے ایک ہی دفعہ اسکی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین انھیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی وہ انکے نزدیک جاتی پھولے پھولے گالوں اور بلاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے بچے میرے لال میں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھا لوں ———" سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقاماً سوچتی ——— تمہاری سفید یاں میرے دل پہ چرکے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے۔ دودھ کی شیشی رہیگی ہورلکس کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اسکی راکھ بکھری پڑی رہے گی۔ وہ اس کو بھی کا منہ چڑا چڑا کر بہت سی الگنی ٹانگے گی اور ان پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کے ترتیب وار سناٹے سے وہ تھک گئی تھی، اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی رُوح کی اس بیزاری کا اعلان کریگی ——— گلاب بہت زیادہ نزدیک رہ کر اب اس سے دور ہونا چاہ رہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں مگر اس کا وہ لہکتا ہوا پھول اسکے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اسکے دماغ میں چکر لگاتے رہتے، کبھی تصویر میں چمبیلی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کوئی "امی! امی" کہتا ہوا اسکے کلیجے سے لپٹ

جاتا۔ مگر کبھی کبھی پاس کے ہیبت ناک جھولے میں اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا۔ "ہاں یہ نہیں" "ہاں" ——— "نہیں" ——— جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر چیچا رہی تھی اور وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں اور نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ چیچاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ گذرتی ہوئی بھی "ہاں" کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے۔

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی کلی گھوش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھوش بابو اپنا غصہ برداشت نہ کرسکے وہ زور سے چلائے "نکلو یہاں سے، نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اسکی گود میں منہ چھپا چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پرنم ہوگئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تفہیم کو اپنے سینے سے لگائے اُسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کرکے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اُس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی، کہ اسکے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور چور ہوگیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اُٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑے کرنے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا۔ کہ پروین دوڑتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اسکے منہ سے نکل گیا۔ "میرا بچہ! میرا لال! پروین کو تو یہ "چھن" کی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اُس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی ——— گلاب کے لئے اسکے قصور پر پروین کا اتنا بیتاباً نہ پیار ایک نئی چیز تھی۔ ——— وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید سفید ہاتھ پروین کے گلے

میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا:- "امی! امی"!

پڑوین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ فتح ہوتا ہوا ایک اجس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر لرز جاتا ہے اسی طرح پڑوین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی ــــــ امیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ مچپاتی ہوئی رسی اسکے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ "ہاں" ــــ "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے ٹکرا رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا وہ اپنا انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسّی ٹوٹ رہی تھی اور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ــــ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سُنا دیا تھا۔ اسکی رُوح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہر طرف چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں پینٹنی ملکتی اور ہنکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اسکے کانوں میں ایک آواز آئی "امی تا" ــ اور اسکی روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اُسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفا[ن] آواز کا فاصلہ دُور ہٹتا جا رہا تھا۔ "امی تا ــــ "امی تا" اور پھر ہولناک ا[ندھیرے] آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی ــــ اضطرت اتنے دنوں تک پڑوین [...] آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی ــــ اور پڑوین کے بے بس ہاتھ "امی تا [...] سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "بیٹ[ا] لال-!"

شیریں

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!

قلمی نام "شیریں" پنجاب کے ایک نہایت معزز و متمول ترین اعلیٰ راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئی دادا نائب تھے اور ایک بہت بڑی دیسی ریاست کے صدر تھے۔ والد اسی ریاست میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے گھر میں والد اور انکی چھوٹی بہن کی پیدائش کے بعد کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لئے میری پیدائش پہ قدرتی طور پر بہت خوشیاں منائی گئیں اور میری پرورش نہایت توجہ۔ محبت۔ اور ناز و نعم سے ہوئی۔ خاندان بھر میں میری حیثیت ہمیشہ ہیروئن کی سی رہی۔ ماں کی محبت قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ دو برس کی عمر میں آغوش مادری سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ اس وقت سے میری پرورش لاہور کے ایک بہت اچھے کشمیری گھرانے کی ایک سنجیدہ شریف اور سمجھدار خاتون کے سپرد ہوئی وہ بیچاری خود بے اولاد تھیں چھوٹے بچوں سے اُنہیں دلی لگاؤ تھا۔ میری تعلیم و تربیت میں میرے دادا صاحب اور ان کشمیری خاتون کا نمایاں حصّہ ہے۔ اور اگر آج بیشمار عیوب کے ساتھ ساتھ مجھ میں کچھ گنتی کے محاسن بھی ہیں تو وہ بلاشبہ ان دونوں بزرگ ہستیوں کی ذات والا صفات کا پرتو ہیں۔

ابتدائی پڑھائی گھر پہ ہوئی۔ دادا صاحب عربی، فارسی اور انگریزی کے جید فاضل تھے، انہوں نے خاص اپنی نگرانی میں میٹرک تک پڑھایا اور یہ ان کے تبحر علمی

ہی کا فیض تھا کہ انہی دنوں مجھ میں اپنی عمر اور تعلیم سے کہیں زیادہ علمی استعداد پیدا
ہوگئی تھی۔ بعد میں اپنے شوق سے مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کی قصے کہانیوں کا بچے
کو شوق ہوتا ہے۔ اور مجھے تو بہت ہی خبط تھا۔ ان کشمیری خاتون کے شوہر سید خوش
اخلاق اور ہنس مکھ بزرگ تھے۔ انہیں "الف لیلیٰ" "حاتم طائی" اور اس قسم کی دوسری کتابوں
کے بیشتر قصے ازبر تھے اور وہ تقریباً ہر رات کو سونے سے پیشتر مجھے کبھی قصے کا تھوڑا
سا حصہ سنایا کرتے اور ایک کہانی کئی روز میں ختم کرتے۔

ذرا بڑی ہوئی تو اپنے نام آیا ہوا "نونہال" اخبار اور چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور نظموں
کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھنے لگی اور اکثر اماں بی (وہی کشمیری خاتون) کو اور اپنی
سہیلیوں کو سنایا کرتی۔

کچھ اور بڑی ہوئی تو رسائل اور اخبار دیکھنے کا شوق ہوا۔ دادا صاحب کے پاس
ان دنوں "معارف" "المظاہر" "الہادی" وغیرہ کے رسائل آتے تھے (اس وقت میرے
لئے یہ لٹریچر بہت مشکل تھا۔ مگر بڑے ہونے پر دادا صاحب اُن پرچوں کے بہترین
مضامین خود سمجھا سمجھا کر پڑھاتے تھے) والد صاحب کے نام "شباب اردو"۔ "ہمایوں"
اور "نیرنگ خیال" وغیرہ بھی جاری تھے۔ اور آپا جان (سوتیلی والدہ جو مجھے بیحد چاہتی
تھیں) کے پاس "عصمت" اور اخبار "تہذیب نسواں" آیا کرتے تھے۔ آپا جان اکثر
فرصت کے وقت کوئی کتاب یا رسالہ اماں بی کو پڑھ کر سنایا کرتیں اور میں اُس وقت
اپنے تمام کھیل چھوڑ چھاڑ بڑی تندہی سے اُن کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتی اور محویت
کے عالم میں سنتی رہتی۔ میرے باقاعدہ مطالعہ کی ابتدا محترمہ سجاد حیدر صاحبہ کے
ناول "اختر النساء بیگم" سے ہوئی۔ مجھے یاد ہے ان دنوں میں نے خسرو سے چھٹکارا

پا یا تھا۔ کمزوری کافی تھی۔ اسلئے پڑھنے سے چھٹی تھی۔ زیادہ کھیل کود بھی نہیں سکتی تھی گڑیوں سے کھیلتے کھیلتے اُکتا جاتی تو "اختر النسا بیگم" کی ورق گردانی شروع کر دیتی۔ تھوڑی سی پڑھ لینے کے بعد یہ کتاب مجھے اس قدر اچھی لگی کہ دو تین روز میں ختم کر ڈالی اور پھر دوبارہ سہ بارہ پڑھا کی۔ حالانکہ اُس وقت اکثر الفاظ کے معانی اور مطالب سمجھنے کی بھی استعداد نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں اگرچہ اباجی، آپا جان اور دوسرے لوگوں کو کتابیں رسالے پڑھنے کا کافی شوق تھا لیکن مضمون نویسی یا افسانہ نگاری کا کہیں دُور دور تک بھی چرچا نہیں تھا افسانے لکھنے کا شوق مجھے "تہذیب نسواں" اخبار میں حجاب امتیاز علی صاحبہ (جو اسوقت حجاب اسمٰعیل تھیں) کے چھوٹے چھوٹے دلکش مضامین پڑھ کر ہوا۔ اگرچہ اس وقت بچپن کا زمانہ تھا مگر افسانہ نگاری کی آرزو جب ہی سے اپنے ابتدائی روپ میں دل میں پنپنے لگی تھی۔ ——— بہت چھوٹی عمر میں خیالی دنیا بنانے کی عادت تھی۔ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی ڈرامہ نما کھیل کھیلا کرتی۔ خود اکثر ہز ہائینس کا پارٹ لیتی (یہ شاید اس لئے تھا کہ وہاں کی بیگم صاحبہ بیحد خلیق۔ بہت نازک دبلی اور جاذب نظر خاتون تھیں مجھے بہت چاہتی تھیں۔ اور میرا چھوٹا سا دل ان کی پُرکشش شخصیت سے بہت متاثر تھا) گڑیاں کھیلنے کا انتہائی شوق تھا۔ ——— اپنے اس شوق کی بدولت اکثر اماں جی کی ڈانٹ سننی پڑتی۔ تنہا بیٹھ کر گڑیاں کھیلتے ہوئے اور رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر آنکھیں سے (؟) دیکھے خواب دیکھا کرتی کتنے ہی عجیب عجیب مقالات کی سیر کرتی۔ کتنے ہی اَن جانے لوگوں سے باتیں کرتی اور اپنے ان غائب ملاقاتیوں کو "جھوٹ موٹ کے آدمی" کہا کرتی اور کبھی کبھی ان کی باتیں اپنی سہیلیوں کو بھی سُناتی۔ جو بڑی حیرت اور دلچسپی سے سنتی تھیں۔ ایک دن کی بات مجھے اب تک یاد ہے۔ گرمیوں کے

خنک سویرے کی خوشگوار ہوا تھپکیاں دے رہی تھی۔ ایک رشتہ دار لڑکی دیر سے مجھے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں جاگ جاگ کر پھر سو جاتی۔ یکایک وہ چلا کر بولی "دیکھو تمہاری چارپائی کے نیچے ایک چھوٹ موٹ کا آدمی سویا پڑا ہے"۔

میں بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ ابھی ابھی اُٹھ کر گیا ہے۔ ایک بالشت کا قد تھا اس کا۔ پاؤں میں چھوٹے چھوٹے سیاہ پمپ پہن رکھے تھے۔ میں تمہیں جگانے لگی تو جانے کہاں غائب ہو گیا"۔ میں آج تک لاشعوری طور پر کبھی کبھی سوچا کرتی ہوں شائد وہ سچ ہی کہہ رہی ہو ——!

بس وہی "چھوٹ موٹ کے آدمی" اپنا رُوپ بدل کر آج میرے پریشان افسانوں کے کردار بن گئے ہیں۔ آج تک ان کے ساتھ میرا ویسا ہی مضبوط اور معصوم رشتہ قائم ہے۔ آج بھی رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر سونے سے پہلے کتنے ہی پیارے پیارے خواب دیکھا کرتی ہوں۔ گھنٹوں اپنے ان اجنبی ملاقاتیوں کی دلگداز داستانیں سنتی ہوں، وہ "چھوٹ موٹ کے آدمی" ہونے کے باوجود ہماری اپنی دنیا کے باسی ہیں اُن کے پہلو میں پیہم دھڑکنے والا دل موجود ہے۔ اُن کی زبانوں پر سینکڑوں ان کہی کہانیاں الفاظ کا جامہ پہننے کو مضطرب ہیں اور اُن کی آنکھوں میں ہزاروں نشیلے سپنے آسودہ رہتے ہیں اور پھر جب کبھی اڈیٹر صاحب کے پیہم تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے تخیل کے تانے بانے کو قلمبند کر دیتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس وسیع دُنیا میں میرے لئے اور کوئی بھی تخیل باقی نہیں رہا۔ جیسے کوئی محبوب گیت بھول گیا ہو جیسے کوئی پیارا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔ کئی کئی روز تک اُداس اُداس سی پھرتی رہتی ہوں یہاں تک کہ

پھر وہ "جھوٹ موٹ کے آدمی" اپنی آپ بیتیاں سنانے آ جاتے ہیں۔

میں نے سب سے پہلا مضمون ایک واقعہ سے متاثر ہو کر "گاؤں" کے عنوان سے لکھو جو "رومان" لاہور کے مارچ ۳۶ء کے پرچہ میں اڈیٹر رومان کے حوصلہ افزا تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ اور پھر میرا افسانہ اپریل کے رومان میں "مشہد عروس" کے عنوان سے "شناختی" کے نام سے چھپا جس کے لئے کنیز فاطمہ حیا صاحبہ لکھنوی کی طرف سے انعام ملا۔ اور اڈیٹر صاحب نے مجھے لکھا کہ یہ افسانہ حلقۂ رومان میں بیحد پسند کیا گیا ہے۔

"مشہد عروس" میری اولیں کاوش تھی۔ مگر نیائے ادب میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر طرف سے مجھے تحسین و ستائش کے پھولوں سے لاد دیا گیا۔ مجھے اس پسندیدگی اور مقبولیت کا گمان تک نہ تھا۔

اسکے بعد دو سال تک کچھ نہ لکھ سکی۔ ۳۸ء میں افسانہ نویسی کا شوق پھر سے تیز ہوا۔ ایک افسانہ "کون گلی گئیو شام" پر رسالہ "زیب النسا" لاہور کی طرف سے انعام ملا۔ اور جب سے ملک کے چوٹی کے رسائل میں میرے افسانے چھپتے رہتے ہیں اور اپنی بے شمار فنی خامیوں کے باوجود حلقۂ ادب میں زیادہ سے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں اپنے بیگانے سب ہی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ مگر میری افسانہ نگاری کی رفتار بہت سست ہے۔ ایک تو میرے پاس لکھنے پڑھنے کے لئے بہت تھوڑا وقت بچتا ہے دوسرے کسی کی فرمائش پر یا دماغ پر زور ڈال کر ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتی خواہ ہفتوں کیا مہینوں کوشش کرتی رہوں۔ ہاں جب کبھی کوئی واقعہ۔ کوئی یاد۔ کوئی منظر دل کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے تو یہ تاثر کچھ زیب داستان کے ساتھ قلمبند کر لیتی ہوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میرے افسانے سر تا سر حقیقت پر مبنی ہوتے

ہیں۔ مگر ساتھ ہی مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ وہ کبھی حقیقت سے خالی نہیں ہوتے۔
پہلے پہلے طرزِ تحریر میں کہیں کہیں غیر ارادی طور پر منشی پریم چند جی آنجہانی کے اسلوبِ نگارش کا تتبع ہوتا تھا۔ مگر اب تو یہ حالت ہے۔ کہ کوئی انداز ہو۔ کچھ الفاظ ہوں کیسے ہی محاورے ہوں بس میرے محسوسات وخیالات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہوں ——!

ہر جاننے والے سے اپنے ادبی مشاغل چھپانے کی عادت سی ہے جب کوئی میرے سامنے میرے انسانوں کا ذکر کرکے تعریف کرنے لگتا ہے تو مجھے بہت ہی شرم آتی ہے بہت ہی تکلیف ہوتی ہے بہت محجوب ہوتی ہوں۔

طبیعت میں خوش خلقی ایثار حساسیت اور بیک وقت انکسار وخود داری اور مزاج کے عیوب ازل سے ودیعت کئے گئے ہیں۔ غصہ بھی بہت ہے گو ضبط کی غیر معمولی قوت ہے اگر مجھ سے انتہائی دلچسپی اور شوق سے ملتے ہیں اور بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ مگر مجھے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ ہر ایک سے مل کر جی خوش نہیں ہوتا۔ یوں ظاہرداری کی اور بات ہے اور اگر حسنِ اتفاق سے کبھی کسی ہم دماغ وہم ذوق ہستی کی صحبت میسر آ جائے تو دل فرطِ مسرت سے پاگل ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ تمول کے گہوارہ میں جھولتے رہنے کے باوجود حاجت مندوں کا دکھ دل کو بیقرار کر دیتا ہے اور سرمایہ کی غلط تقسیم کے متعلق انتقامی جذبات دل میں بھڑک اٹھتے ہیں۔

سیر وتفریح کا بہت شوق ہے۔ مگر کبھی کبھی کامل تنہائی کی آرزو دل کو بیقرار کر دیتی ہے گھریلو کام کاج خصوصاً گھر کی آرائش سے خاص شغف ہے مطالعہ کا خبط سا ہے۔ سنجیدہ مقدس لٹریچر۔ مذہبی کتابوں اور افسانہ وشعر سے یکساں والہانہ محبت ہے۔ جی چاہتا ہے

دنیا کی ہر اچھی کتاب میری چھوٹی سی لائبریری میں آجائے ارفع سے ارفع تر علم کے حصول کی پیاس دل کو ہر دم بے قرار رکھتی ہے۔ فلسفہ، تاریخ، ادب میرے محبوب مضامین ہیں اُردو زبان سے بے پناہ عشق ہے۔ موسیقی سے بےحد لگاؤ ہے۔ مصوری، پینٹنگ وغیرہ کا شوق نہیں۔ شعر سے رُوح گداز لی محبت ہے۔ شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت کا اکثر بلید۔ اعتراف کرتے ہیں۔

اپنے حافظہ سے ہمیشہ شاکی رہی ہوں، کہیں کوئی چیز دیکھ لی، کوئی بات سُن لی، کیا مجال جو کبھی ذہن سے محو ہو سکے، بڑے بڑے امتحانوں میں ضخیم کتابوں کو کبھی ایک سے دوسری مرتبہ چھوا تک نہیں اور اس قسم کے حادثے ہی کی بدولت حساب کی مصیبت جھیلنے میں آئی ہے۔

جس طرح افسانے لکھنے کا شوق حجاب صاحب کے مضامین پڑھ کر ہوا اسی طرح شعر فہمی کی رُوح اختر شیرانی صاحب کی، ایک نظم "مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے" نے بیدار کی۔ یہ نظم بچپن میں کسی رسالہ شاید نیرنگِ خیال، میں دیکھی تھی۔ اس وقت پورے معنی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ مگر اسکے میٹھے میٹھے سادہ اشعار نے اس قدر متاثر کیا کہ بار بار پڑھتی رہی۔ اس وقت سے ہر اچھا شعر دل و دماغ کو خوابوں کی دُنیا میں لے جاتا ہے کبھی کبھی کوئی شدید تاثر بالکل بے اختیاری کے عالم میں شعر کی صورت میں زبان پہ آجاتا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ شاعری میرا اصل موضوع نہیں اس لئے اس سلسلہ میں میری جو چند چیزیں ہیں وہ ایک تجربہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب بھی کوئی نظم وغیرہ چھپی غیر معمولی طور پر پسند کی گئی۔ ایک نظم "جو ٹوٹے خواب" (جو شاعر آگرہ میں شائع ہوئی تھی) بےحد مقبول ہوئی تھی۔ شاعری

ہیں حضرت مولینا سیماب صاحب اکبرآبادی سے اصلاح لیتی رہی ہوں، افسانہ وغیرہ
لکھنے میں کبھی کسی سے مدد یا اصلاح نہیں لی۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ فروری ۴۵ء
میں "پنکھڑیاں" کے نام سے شائع ہوا۔
ہوں کیسے بنی اہم ادب۔ اردو بازار۔ دہلی سے "پنکھڑیاں" کے نام سے شائع ہوا۔
ہوا۔ میاں نے ادب میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ "ساقی" "دہلی"۔ "ادیب" دہلی "آجکل"
دہلی نے اور فلک پیما صاحب۔ قتیبی صاحب رامپوری، نسیل پرتاپ، مشتاق احمد زاہدی
صاحب دہلوی اور دیگر متعدد ادبا نے نہایت اچھے تبصرے لکھے.....
اور اب ذرا میری اہم تذکرہ بہنیں اپنی اس نا اہل بہن کے لئے ایک اہم
قسم کی دعا تو فرمائیں۔ خدائے تعالےٰ اسے یہ توفیق دے کہ وہ ایک ساتھ سارے
افسانے لکھ کر رکھ چھوڑا کرے اور اڈیٹر صاحبان کے مسلسل تقاضوں کی بوچھاڑ
سے شرمندہ ہو کر مجرمانہ خاموشی اختیار کرنے کی بجائے جھٹ سے ایک عدد افسانہ
نکال بھیج دیا کرے۔" آمین ثم آمین۔ سچ کبھی ایسا بھی ہوگا! ——

"شیریں"

شیریں

بنواری

"بنواری! دیکھ فرش پہ کتنی دھول جمی ہے، جانے آنکھیں بند کرکے صفائی کرتا ہے تو؟" آپا جھڑک کر کہتی۔

"بنواری، نمبر پانچ بولتا ہے آج ابھی تک غسل خانہ صاف نہیں ہوا؟" بیرا کچن کی طرف جاتے ہوئے کہتا۔ "بنواری نمبر چھ کا کوڑا کا ڈبہ اب تک گندہ پڑا ہے۔ تم صبح سے اب تک کا کھتم نہیں کرنے سکتا۔ ہم میڈم سے بول دے گا۔" نرس ڈانٹتی۔

"سالے ابھی تک مارا مارا پھر رہا ہے۔ کل سات کمرے ہیں۔ وہ بھی تجھ سے دوپہر تک پورے نہیں ہوتے۔ بیٹھ جاتا ہے ایک کمرے کو لیکر رگڑنے گھنٹہ بھر تک۔ جیسے ایسی سپھائی دیکھ کر کوئی سالے کو جاگیر ہی تو لکھ دے گا۔ ہمیں دیکھ پڑے گیارہ کمرے ہیں کیا مجال جو کبھی آدھے گھنٹے سے اوپر لگایا ہو۔" نیچے والا مہتر

طعنہ دیتا۔

اور تمہاری یہ تمام ڈانٹ ڈپٹ۔ سب طعنے اور طنزیں۔ سورج مکھی کے پھول کی سی شگفتگی سے سن لیتا۔ اسکے معصوم سے دل میں کبھی بھول کر بھی غصّہ یا ناگواری کا احساس پیدا نہ ہوتا۔ اسکی بلند اور شفاف پیشانی پہ کبھی ایک بل تک نہ آتا۔ وہ اسی طرح بھاگ بھاگ کر۔ اُن تھک مستعدی سے سب کام نپٹاتا رہتا اور پھر پورے بارہ بجے اپنے پھٹے پرانے خاکی کپڑوں پر سفید براق اچکن پہن کر۔ منہ پہ باریک ململ کی ٹوپی سی چڑھا۔ سٹریچر پر لٹائے ہوئے کسی اپریشن کے مریض کو نیچے والے مہترا اور بیرا کے ساتھ اپریٹنگ تھیٹر میں لے جاتا اور جب تک کمپونڈر ڈانٹ کر باہر جانے کو نہ کہتا۔ وہیں ایک طرف دیوار سے چپکا کھڑا رہتا اور جب ساتھ کے کمرے کے کسی خاموش کونے میں نیند کی سی کیفیت میں کھڑا ہوا کرنل سگرٹ کے دو چار تیز تیز کش لگا کر بچا ہوا ٹکڑا فرش پہ پھینک دیتا اور ہاتھ دھونے کے لئے نلکے کی طرف جاتے ہوئے کبھی اُسے مخاطب کر کے کہہ دیتا۔ "دیکھو بیٹے کہ وہ۔ شاباش"۔ تو تمہاری کا ننھا سا دل بلندی اور فخر کے احساس سے بلیوں اچھلنے لگتا۔ کتنا اچھا تھا کرنل اپنے سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے ہمیشہ اُسی سے اُٹھانے کو کہتا تھا نا ــــــ!

اور پھر کبھی کبھی اپریشن میں معمول سے زیادہ وقت لگ جاتا تو اپریٹنگ تھیٹر والی نرسوں اور ایک ڈیوٹی نرس کے سوا باقی سب کی سب کھانے پر چلی جاتیں۔ آیا دوپہر کی چھٹی پر کھسک جاتی۔ مریضوں کے ملاقاتی بھی واپس جانے لگتے۔ برآمدہ میں صرف وہ اور اُس کا ایک ہم عمر بیرا رہ جاتے تو تمہاری آزادی اور خوشی کی گہری سانس لے کر جلدی جلدی اپنے پسندیدہ مریضوں کے کمروں میں گھومنے لگتا۔

"کچھ چاہیئے بیگم ساب؟ آپا جی تو چھپٹ ہی چار بجے تک کے لئے۔ اور آج ڈیوٹی پر وہ چڑیل ہے۔ موذی گھوم رہی ہے۔ جبھی ڈیوٹی روم کے ایک کونے میں۔ مریض روتے رہیں اس کی جان کو۔ کیا مجال جو اپنی جگہ سے ہل بھی جائے۔ آج اپریشن میں بہت دیر لگی کیا بتاؤں بیگم ساب، کل والا کیس کتنا خطرناک تھا۔ کئی انتڑیاں کاٹ ڈالیں کرنل نے بیگم میں نے جب کمرے کو صاف کیا۔ تو اپنی آنکھ سے دیکھی تھیں،

"آپ کا بھی تو پرسوں کو اپریشن ہے۔ توبہ۔ توبہ۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے بیگم ساب! تین دن تک تو الٹیاں ہی بند نہیں ہوتیں۔ خدا آپ کو جلدی اچھا کرے۔ مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں بیگم ساب۔ جب آپ راجی ہو کر چلی جائیں گی۔ تو میں آپ کی کوٹھی پر آیا کروں گا۔ ابھی تو آپ بہت دنوں پہاڑ پر ٹھہریں گی نا؟ سنا ہے نیچے آجکل بہت ہی گرمی پڑ رہی ہے میں نے تو بیگم ساب آج تک گرمی دیکھی ہی نہیں تو یہ کیا حال ہوتا ہوگا۔ یہ نمبر چار والے صاحب یہاں سے سیدھے دلی جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں دلی میں تو غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ یہ تو پہلے ہی کمزور ہیں بیچارے بہت ہی اچھے ہیں۔ آپ ہی کی طرح ہر ایک سے بڑے پیار سے بولتے ہیں۔ جب بھی ان کے پاس جاتا ہوں سب مریضوں کا حال پوچھا کرتے ہیں۔ آپ کو تو بار بار پوچھتے ہیں۔ اوہ۔ گھنٹی کر رہے ہیں سائید۔ دیکھوں جا کر کیا کہتے ہیں۔ وہ چڑیل تو نہیں ملے گی۔"

اور پھر بنواری لپک کر باہر نکل جاتا۔ اور کتنی دیر تک نمبر چار والے صاحب کی احوال پرسی کرتا رہتا۔ "آپ نے گھنٹی کی تھی ساب! نہیں! اوہ مجھے تو ایسا ہی لگا تھا۔ وہ تو نہیں آئے گی۔ چاہے آپ دس گھنٹیاں کریں۔ بڑی کمبخت ہے۔ کام کرتے تو جیسے باپ مرتا ہے۔ دوسروں پر حکم چلانے کو بہت ہے۔ اس کا نام میں جین نہیں۔

مس ڈائن رکھنا چاہیئے تھا۔ کیا بتاؤں ساب۔ ہم لوگوں کو یہ کس قدر تنگ کرتی ہے۔
جی چاہتا ہے ایک دن کرنل سے بول دوں۔ بس پھر میم ساب کی آنکھیں کھل جائینگی
جانے گئے سال سے یہاں ایسی بُری نرسیں کیوں آنے لگی ہیں۔ پہلے تو اس ہسپتال
کا شاہو بہت اچھا ہوتا تھا۔ میں تین برس سے یہاں کام کر رہا ہوں۔ کہتے ہیں پہلے تو
یہاں بس انگریج لوگ ہی آسکتے تھے۔ کالے مریضوں کو کبھی بھی داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ اب
تو ہر ایک آجاتا ہے سب ہی کا علاج کرتے ہیں۔ مگر ساب۔ ہمارا کرنل ہے بہت ہوشیار
دیکھ لیجئے آپ کتنی جلدی اچھے ہو گئے۔ آپ تو اب جانے والے ہیں ساب۔ مجھے آپ
بہت یاد آیا کرینگے۔ نمبر سات والی مس ساب بھی اب جانے والی ہے۔" اور اس لمحہ
یکایک ہزاری کے گول سے سانولے چہرہ پر ایک نرالی معصومانہ چمک پیدا ہو جاتی
جیسے اُسے کوئی بھولی بسری پرانی بات دفعتاً یاد آگئی ہو۔ اسکے کانوں کی چھوٹی چھوٹی سونے
کی مُرکیاں زور زور سے ملنے لگتیں۔ اور وہ بجلی کی سی تیزی سے نمبر سات کی طرف چلا جاتا
"کھانا کھالیا مس ساب۔ آج آپ کیسا ہے؟" وہ اپنی ہم عمر مریضہ سے ہسپتال کی
زبان میں بے تکلف گفتگو شروع کر دیتا۔ "تاش کھیلتا آپ مس ساب؟"
"تاس کیا۔ اوہ۔ یہ؟ یہ کارڈ ہے۔ تم کھیلنا جانتا؟"
"ہاں مس ساب۔ کھوب جانتا۔"
"کون کون کھیل جانتا؟"
"مس ساب میں ترپ جانتا چھپتی جانتا اور........"
"اوسلی ترپ اور چھپتی کیا ہوتا۔ تم کوئی کھیل نہیں جانتا۔ اچھا رمی بھی نہیں جانتا؟"
اور وہ چھوٹی سی مس ساب ہزاری کو حقارت آمیز شفقت بھرے انداز سے

کوئی کھیل بتانے لگتی۔ جیسے اُسے بنواری کی جہالت پر ترس آرہا ہو۔ اس کا گھٹنوں سے پھٹا ہوا میلا خاکی پاجامہ دیکھ کر رحم آتا ہو اُسے کیا پتہ کہ بنواری کو یہ کپڑے کس قدر عزیز تھے۔ یہ پھٹا پرانا وضع کی خاکی وردی! اُسے اپنی اس وردی پر کتنا فخر تھا!
اور پھر بنواری تاش کے پتوں کو الٹ پلٹ کر کے مس صاحب کا بتایا ہوا کھیل ذہن نشین کرتے ہوئے یکایک مس صاحب کے گورے گورے لال لال چہرے اور اُسکے سونے کے سے چمکتے ہوئے بالوں کو حیرت سے تکنے لگتا۔ یہ بال اُسے مکی کے بھٹے کی داڑھی کی یاد دلاتے تھے۔ کیسی نرم۔ کیسی ملائم ہوتی تھی وہ داڑھی۔ وہ بچپن میں اُسکے گچھے کے گچھے جمع کر لیا کرتا تھا۔ مگر نہیں ان گچھوں میں ان بالوں کی سی چمک کہاں تھی بھلا۔ یہ باغوں میں آوارہ پھرنے والی تتلیوں کے پروں کی سی انوکھی چمک! کسی زمانہ میں اُسے ان بنفرار تتلیوں سے کس قدر محبت تھی۔ وہ سارا سارا دن اُن کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ اسکی پہنچ سے کتنی دور تھیں وہ تتلیاں۔ اور یہ بال بھی تو اسکی دسترس سے اسی قدر دُور تھے۔ یہ سنہری باریک اور نرم سے بال! مگر ۔۔۔۔۔ اور بنواری کی آنکھوں میں یکایک کوئی بھولا ہوا سپنا جاگ پڑتا۔ کتنے گھنے۔ کتنے سیاہ اور کس قدر چمکیلے بال تھے۔ اسکی ماں کے!

جس روز وہ سر دھو کر اپنے بال سکھانے دھوپ میں بیٹھ جاتی تو بنواری کا دل وفور مسرت سے پاگل سا ہو جایا کرتا۔ اس کا جی چاہتا وہ دن بھر ماں کے ان آوارہ اور گھنے بالوں سے کھیلتا رہے۔ شام تک اُن کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سنوارتا رہے۔ مگر ماں کو تو جیسے ضد تھی جھٹ سے تیل ڈال۔ زور زور سے کنگھی کر کے سارے کے سارے بال ایک چوٹی میں کس کر گوندھ لیتی اور اب تو وہ اندھیاری گھٹاؤں کے

سے بال اس کی نگاہوں کی پہنچ سے کب سے دُور ہو چکے تھے، کیسے اچھے تھے وہ بال اور کتنی پیاری تھی ان بالوں والی۔ اُسے کتنا چاہتی تھی، کیسی خاطر کرتی تھی اس کی۔ کتنے چاؤ سے کئی بار اپنا کرتہ یا لہنگا کاٹ کاٹ کر اس کے لئے نئے نئے کرتے سیا کرتی تھی۔ کتنی محنت سے پیسے جوڑ جوڑ کر اس کے کانوں میں یہ دو ننھی ننھی سونے کی مُرکیاں پہنا دی تھیں۔ اپنی سہیلیوں سے ہمیشہ عجیب سے شرمیلے لہجہ میں کہا کرتی "بنواری کے بہن بھائی جیتے رہیں مگر جتنی چاہت مجھے بنواری سے ہے کسی سے بھی نہیں۔ بڑے لاڈ سے پالا ہے میں نے اُسے جی چاہتا ہے اسکے سورج مکھی کے پھول کے سے چہرہ کو دن بھر دیکھتی ہی رہوں۔ میرے لاڈ نے اُسے بڑا اکھڑ بنا دیا ہے بہن! جانے بڑا ہو کر کچھ کمائے کھلائے گا بھی یا یونہی" کاش وہ آج آ کر دیکھتی اس کا سورج مکھی کا اکھڑ پھول شہر کے سب سے اُونچے یورپین ہسپتال کا مہتر ہے۔ سپاہیوں کی سی خاکی وردی پہنتا ہے کتنی اچھی اچھی بیگموں سے باتیں کرتا ہے۔ کتنے بڑے بڑے صاحب لوگوں کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ کتنی گوری گوری مس صاحبوں سے تاش کھیلنا سیکھتا ہے ...... اور عین اس وقت کہیں دُور سے میٹرن کی گورگابی کی مخصوص کھٹا کھٹ اُبھرتے اُبھرتے بالکل نزدیک آجاتی اور بنواری کا سارا جسم ایک دم سے لرز جاتا۔ اسکے ہاتھوں سے تاش کے پتے چھوٹ کر ادھر ادھر گر پڑتے اور اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے سے سیاہ چمکیلے بالوں کا جال ٹوٹ پھوٹ کر جانے کہاں غائب ہو جاتا۔

"بنواری"۔

"مس ساب"۔ بنواری تیزی سے باہر نکل آتا۔

"بنواری تم کوئی کام ٹھیک سے نہیں کر سکتا۔ سارا کیبنٹ پیشنٹ لوگ کے

کمرے میں گھسا رہتا۔ ہم کبھی تم کو ادھر دیکھنے نہیں مانگتا۔ چلو اپنا ٹینک نفیس صاف کرو"
اور پھر ایک دن بنواری صبح کو ہسپتال آیا تو خوشی سے پاگل سا ہو رہا تھا اسکی گول گول آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں اس کے چہرے کی سانولی جلد کے نیچے جیسے کسی نے سونا دہکا کر رکھ دیا تھا۔" آپا جی۔ بسنت ہو گئی سبح سارے شہر میں جھنڈیاں لگ رہی ہیں۔ دفتروں میں چھٹی ہو گئی ہے۔ یہاں اپنے ہسپتال پر بھی جھنڈیاں لگیں گی رات کو چوک میں آگ اور ناچ کا کھیل ہو گا۔ بڑی رونق ہو گی۔ میں تو باپو سے پیسے مانگ کر ماکی جاؤں گا۔ بڑا اچھا کھیل آپا ہے۔ سہگل کام کرتا ہے۔ تم بھی دیکھنا آپا جی"۔
دن بھر وہ انتہائی خوشی میں نیم مدہوش سا اپنے کام میں لگا رہا اور شام کو جب اچانک شفاف آسمان کو دھوئیں کے سے بادلوں نے ڈھانپ کر زور کا پانی برسانا شروع کر دیا تو اس کا رنگ ایک دم مرجھائے ہوئے سرسوں کے پھول کی مانند زرد ہو گیا۔
"آپا جی۔ آج کا کھیل بھی گیا! ایسے پانی میں باپو کب جانے دے گا"۔ اور وہ اُداس سا ہو کر بالکنی کے کٹہرے پر جھک گیا۔ اور پھر جب شام کے آٹھ بجے وہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے اپنا میلا کمبل اوڑھ کر گھر جانے لگا تو نیچے والے مہتر نے بہت ڈانٹا "یہیں پڑا رہ نا۔ آج میرے کوارٹر میں۔ دیکھ تو کس غضب کی برکھا ہے۔ مرے گا جا کر ایسے میں"۔
"نہیں چاچا۔ مرنا کیا آسان پڑا ہے اگر نہیں جاؤں گا تو باپو غصہ کرے گا۔ وہ جانے گا بنواری کھیل میں چلا گیا ہے"۔
اور پھر اُس رات کو پورے گیارہ بجے بارش کا ایک زبردست طوفانی ریلا آیا جیسے سیکڑوں دیوتا دنیا میں کوئی بھاری انیائے دیکھ کر اُسے کو سرتاسر پانی میں

غرق کر دینا چاہتے ہوں اور فتح کی خوشی میں دلہن کی طرح سجے ہوئے بال رُوم میں آرکسٹرا
سے ایک متوالی دھن بلند ہوئی اور فتح و نصرت کی حرارت سے سرشار فوجی اور شہری
جسم سردی کے خفیف سے احساس سے کسا کر ایک دوسرے کے زیادہ قریب
ہو گئے اور پھر منفی اور مثبت تار مل گئے اور ایک طویل اور پرجوش رقص شروع ہو گیا
عین اس وقت کہیں نزدیک ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی جیسے ہزاروں برس کی یکساں
جامد زندگی سے اکتا کر یکایک بنواری کے گرنے والے کوارٹر پر گر پڑی اور اپنی
پتھریلی اور گرم گرم مٹی سے بنواری، بنواری کے چار اور بہن بھائی۔ بنواری کی پھوپھی
اور بنواری کے باپو کے ٹھنڈے اکڑے ہوئے جسموں کو اچھی طرح ڈھانپ کر آرام
آرام سے سلا دیا ——!

اور اگلی صبح کو بلند آسمان وسیع ٹیلے اور ساکن سمندر کی طرح نکھر گیا۔ بھیگے سورج
کی اولین شرمیلی کرنیں رُک رُک کر بڑھ بڑھ کر فتح کی جھنڈیوں پر نثار ہوتی رہیں گذشتہ
رات کے راگ اور ناچ سے تھکے ہوئے مہذب لوگ گرم چائے پی پی کر جسم کا کسل اور
طبیعت کا چڑچڑاپن دُور کرتے رہے۔ بڑی بڑی پگڑیوں اور گھیرے دار شلواروں
والے کچھ سرحدی مزدور اپنے مضبوط ہاتھوں میں بڑے بڑے پھاوڑے اور کدال تھامے
بنواری کے کوارٹر پر سے رات کی گری ہوئی پہاڑی کے پتھر اور مٹی ہٹانے کے لئے
خوش خوش اپنا راستہ طے کرتے رہے۔ اور ہسپتال کی چھت پر بڑا سا یونین جیک
نہایت استقلال اور بے نیازی سے لہراتا رہا۔ اور بیرا آیا اور نیچے والا مہتر بالکونی
کے کٹہرے پر جھک کر کتنی دیر تک آنسو بھری آنکھوں سے دُور کی پگڈنڈی پر بنواری
کی راہ دیکھتے رہے۔ اور بنواری میٹھی نیند سوتا رہا اور سارا شہر حسبِ معمول جاگتا رہا

اور بھلا سشہر جاگتا نہ تو کیا ہنواری کے لئے خود بھی سوجاتا۔ جیسے ہنواری کوئی بہت
بڑا آدمی ہی تو تھا۔ جیسے وہ اپنے ایک اشارہ ابروسے ہزاروں لاشوں کا انبار
لگوا دینے والا کوئی فوجی افسر ہی تو تھا۔ جیسے وہ ایک بمب سے لاکھوں جسموں کو
خاک کر دینے والا کوئی پائلٹ ہی تو تھا۔ جیسے وہ آٹامک بمب ایجاد کرنے والا
عظیم الشان سائنسدان ہی تو تھا! وہ تو خالی خولی ہنواری تھا۔ یہاں کے سب سے
بڑے امیروں کے ہسپتال کا مہتر ہنواری ——!

صالحہ عابد حسین

وطن - پانی پت

والد کا نام ـــ خواجہ غلام الثقلین مرحوم

والدہ ـــ مولانا حالی مرحوم کی بڑی پوتی تھیں۔

تاریخ پیدائش۔ ستمبر ۱۹۱۳ء

تعلیم زیادہ تر گھر پر پائی ـــ گھر ہی پر تیاری کرکے ادیب فاضل کا امتحان دیا جس میں اعلٰے نمبروں میں کامیابی ہوئی۔

۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر عابد حسین پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد ۳۴ء سے ۳۸ء تک سخت بیماریاں اُٹھائیں اور اسکے بعد سے اب تک صحت کمزور رہتی ہے۔ اور حسبِ دل خواہ جتنا کام کرنے کی آرزو ہے نہیں کرسکتی۔

افسانوں کا پہلا مجموعہ "نقشِ اول" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا ـــ افسانوں کا دوسرا مجموعہ "سازِ ہستی" ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ "بات چیت" اور ناول "عذرا" زیرِ اشاعت ہیں۔

لکھنے کا شوق چھوٹی سی عمر سے تھا۔ جو روز بروز ترقی کرتا گیا۔ خدا کے فضل سے ماحول مناسب اور رہنمائی صحیح ملی۔ زیادہ شوق افسانے اور قصے لکھنے سے ہے اکثر مضمون بھی لکھتی ہوں ۳۶ء سے اب تک ریڈیو پر تقریریں بھی کرتی رہی ہوں لیکن ہندستانی

عورت کی ذمہ داریاں اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اکثر مہینوں لکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ دماغ میں سیکڑوں پلاٹ موجود رہتے ہیں لیکن اس کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ کہ وہ کاغذ پر بھی منتقل ہو جائیں ——— فرمائشی افسانہ لکھنا میرے لئے سب سے کٹھن کام ہے۔

صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین

سنبھالا

سارے گھر میں بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مریضہ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر معائنے میں مشغول تھے۔ موہنی کا شوہر پرتاب اور اس کا بھائی موہن کمرے کے اندر تھے۔ اس کی بھاوج سرسوتی سے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موہنی کی تیرہ سال کی بچی سوہنی اور سترہ سال کا لڑکا پریم کمرے کے باہر دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے اور مایوسی کے اشارے کرتے۔ ان کے چہروں سے رنج و غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے...... موہنی کا محبوب کتا ہیرا بھی ایک طرف خاموش اور اداس سا بیٹھا تھا۔ گویا وہ بھی آنے والے افسوسناک حادثے سے سہما ہوا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرنل شہاب سر جھکائے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے نرس اور دو تین اور ڈاکٹر بھی باہر آئے۔ پریم اور سوہنی ایک ساتھ دوڑے اور ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سوہنی نے بیقراری سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب

بتائیے ممی کو ہوش آیا؟ اب وہ کیسی ہیں؟ اچھی ہو جائیں گی نا؟ بولیئے ڈاکٹر صاحب ایشور کے لئے کچھ تو کہئے۔" پریم نے منھ سے کچھ نہ کہا مگر آنکھوں آنکھوں میں سینکڑوں سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر نے محبت اور افسوس بھری نگاہ سے دونوں بچوں کو دیکھا۔ اور سوہنی کے سر پر ہاتھ پھیر کر صرف اتنا کہا۔ "گھبراؤ نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

موہن نے بیوی کو اشارہ کیا اور وہ سوہنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی

پرتاب نے دوسرے ڈاکٹروں کو فیس دے کر رخصت کیا۔ اور ڈاکٹر شہاب۔ موہن اور پریم چاروں ڈرائینگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر موہن نے اس خاموشی کو توڑا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

موہن۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا رائے قائم کی۔ موہنی بچ جائے گی؟

ڈاکٹر۔ مسٹر موہن آپ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ آٹھ دن سے بالکل بیہوش ہیں۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے۔ طاقت کی دوائیں اور انجکشن سب اب تک بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

پرتاب۔ ڈاکٹر کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر۔ پرتاب اگر تم صاف صاف پوچھتے ہو تو سچ یہ ہے کہ مسز پرتاپ کا بچنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے (یکایک پریم کو دیکھ کر) لیکن اگر انہیں ہوش آ گیا تو دوا ضرور اثر کرے گی۔ ہم اپنی طرف سے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں گے (کچھ دیر بعد) پرتاب مجھے تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنا ہیں۔

موہن اور پریم اٹھ کر باہر چلے گئے۔ پرتاب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

پرتاپ۔ کیوں شہاب کیا واقعی اب میری بیوی نہیں بچ سکتی؟

ڈاکٹر۔ خدا بیں بڑی طاقت ہے۔ لیکن میرا علم اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ اب مسز پرتاپ نہیں بچیں گی۔

پرتاب۔ شہاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کچھ تو کرو۔ آپریشن!! کیا آپریشن کرنے سے زندگی کی امید ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر۔ آپریشن بالکل فضول ہے وہ پہلے ہی شدید تکلیف اٹھا رہی ہیں۔ میں انہیں اور زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ ان کا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ آپریشن تو بڑی چیز ہے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

پرتاب۔ افسوس۔

ڈاکٹر۔ پرتاب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مسز پرتاب کی بیماری کا سبب تم اور صرف تم ہو۔ اگر وہ مرگئیں تو ان کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔

پرتاب۔ (خفگی سے) شہاب یہ کیا بک رہے ہو؟ میں ان کی بیماری کا سبب کیسے ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ مجھ سے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں بیس برس سے تمہیں اور انہیں جانتا ہوں۔ تمہارا دوست ہوں اور تمہارے خانگی حالات سے پوری طرح واقف مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب تم نے پہلی مرتبہ اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ مسز پرتاب اس وقت شاید سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوں گی مجھے اب تک یاد ہے کہ میں انہیں دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ کیسا بےمثل حسن تھا۔ اور پھر کتنی نیک اور بھولی طبیعت لیکن تم نے انہیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ پہلے انہیں سوسائٹی سے روشناس کرایا۔ ہر اچھی بری محفل میں زبردستی لے گئے۔ اپنے کم ظرف اور ذلیل طینت دوستوں

تک سے ان کی ملاقات کرائی۔ اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے تم نے انہیں تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا۔ شراب جیسی مذموم چیز اور مہلک زہر کی انہیں زبردستی لت لگائی۔ ان کے حمل دواؤں سے ضائع کرائے جس کی وجہ سے انکی صحت اور بھی زیادہ خراب ہوگئی اور پھر خود ہی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ خود بری صحبت میں پڑ گئے اور ان پر الزام رکھے۔ ان پر بے جا بندشیں لگائیں اور ہر طرح اُن کے نازک دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ شراب پینے لگیں اور تم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس عادت کو جو خود تمہاری ہی ڈالی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ چھڑاتے اسکی پروا بھی نہ کی۔ بجائے دلجوئی کے دل آزاری سے کام لیا۔ نتیجہ جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ شراب کی کثرت اور دلی رنج وغم نے انکی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ ان کے قویٰ غیر معمولی طور پر اچھے تھے جو وہ اتنے سال بھی یہ سب جھیل گئیں۔ دوسری عورت دو چار سال بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ پرتاب موہنی کی غلطیوں کا کفارہ تو ان کی بیماریوں نے کر دیا۔ مگر تم خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

پرتاب سر جھکائے ڈاکٹر کی لعن طعن سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ آنکھیں غیر معمولی انہماک سے ایک طرف جمی ہوئی تھیں اور گذشتہ بیس سالہ زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح اسکے دماغ کے پردوں پر اُبھر رہے تھے۔

نرم و گداز بستر پر موہنی بے سدھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا سُرخ و سفید رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو کبھی چشم آہو کو شرماتی تھیں، گہرے گہرے گڑھوں اور سیاہ حلقوں سے گھری ہوئی ہیں لمبے لمبے سیاہ بال ماتھے اور تکئے پر

پریشان ہیں۔ اسکے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اور پاؤں جو موزونیت میں بے مثل تھے اب سوج کر ڈبل روٹی کی طرح ہو رہے ہیں اور شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر بھی ورم ہے۔ باقی تمام جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے۔ پہلی نظر میں دیکھنے والے کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اور وہ ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہو جاتا کہ کھال اور ہڈیوں کا یہ پنجر کبھی حسن اور موزونیت کا مکمل نمونہ ہوگا۔ اسکی صورت "آثار پدید است صنادید عجم را" کا عبرت ناک مرقع ہے۔

پریم اور سوہنی ماں کے پلنگ کے پاس تصویر کی طرح خاموش بیٹھے اس کی صورت ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک طرف سرسوتی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہن بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ موہنی کے سرہانے نرس ہاتھ میں انجکشن کی خالی پچکاری لئے کھڑی ہے۔ ڈاکٹر شہاب موہنی کی سوکھی اور زرد کلائی اپنے مضبوط اور طاقت ور ہاتھ میں تھامے نبض پر انگلیاں رکھے اسکی طرف جھکا ہوا کھڑا ہے ـــــ ایک منٹ ـــــ دو ـــــ تین ـــــ چار ـــــ پانچ ـــــ دس ـــــ بیس منٹ گذر گئے کمرے میں ہر شخص کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں۔ آخر ڈاکٹر نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ موہن کی طرف دیکھ کر "مسٹر موہن! مسز پرتاب کی نبض اب بہتر حالت میں ہے کچھ دیر میں انھیں ہوش آجائے گا۔"

سوہنی اور پریم کے چہرے کھل گئے "سچ ڈاکٹر صاحب؟"

"ہاں امید تو یہی ہے۔"

بیس پچیس منٹ اور گذر گئے موہنی کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے

منھ پر انگلی رکھ کر کمرے کے سبھی لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستہ آہستہ موہنی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ بچوں پر جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ لب ہلے۔ بہت خفیف سی جنبش ہوئی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہا ہے۔ ڈاکٹر نے اپنا کان اسکے لبوں کو لگا دیا۔ "سوہنی .... پریم .... بلاؤ"

ڈاکٹر شہاب نے دونوں بچوں کو، جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے ضبطِ گریہ کی انتہائی کوشش کر رہے تھے، اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے ماں کے قریب آئے۔ موہنی کی آنکھوں سے دو قطرے اِدھر اُدھر گرے۔ کمزور آواز نکلی۔ "میرے بچے"

دونوں نے اپنے سر ماں کے سینے پر جھکا دئے۔ آنکھوں سے دریا امنڈ آیا۔ ماں نے اپنا ہاتھ بڑی کوشش سے اُٹھا کر بچوں کے سر پر رکھا۔

کچھ دیر یونہی گزری۔ یکایک موہنی نے نسبتاً بلند آواز سے کہا: "پریم ۔ موہن بھیا کو ۔ تار دے کر ۔ بلا دو۔" موہن بیقرار ہو کر آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "موہنی ۔ موہنی ۔ میری پیاری بہن ۔ میں تمہارے پاس موجود ہوں۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فرطِ گریہ سے آواز رُک گئی۔ موہنی نے بھائی کی طرف نظریں پھیریں۔ چہرے پر کچھ آثارِ زندگی ہویدا ہوئے رک رک کر بولی: "بھیا تم آ گئے ہاں اب میں اطمینان سے مروں گی۔" ڈاکٹر نے اتنے میں دوسرا انجکشن تیار کر لیا تھا وہ موہنی کے بازو میں لگایا اور سب سے کہا "اب آپ لوگ باہر جائیے۔ ان کو آرام کرنے دیجئے۔ اب بیہوشی نہ ہو گی بلکہ نیند آئے گی۔" نرس نے پردے گرا دئے۔ موہنی نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر نکل کر دونوں بہن بھائی کرنل شہاب سے لپٹ گئے "ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب

ممی اب اچھی ہوگئیں؟ اب کوئی خطرہ تو باقی نہیں؟ ایشور نے ہماری دعائیں سن لیں" خوشی کے مارے پورے جملے ان کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ موہن نے بھی سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں خطرہ اس وقت ٹل گیا ہے" سوہنی نے پریتم کا ہاتھ پکڑا! "آؤ بھیا پاپا کو فون کر کے خوشخبری سنائیں" دونوں خوشی سے ناچتے ہوئے چلے۔ پیچھے پیچھے موہنی کا کتا ہیرا دم ہلا ہلا کر اظہار خوشی کرتا ہوا جا رہا تھا۔

آج موہنی کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہیں سر گندھوایا ہے اور تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔ اسکے ملنے والے اور دوست ڈاکٹر کی اجازت سے دو دو منٹ کے لئے اس کے پاس آ کر مزاج پرسی کر جاتے ہیں۔ وہ مسکرا کر ان سے دو ایک باتیں کرتی ہے۔ سارا گھر خوش خرم ہے کہ وہ اب اچھی ہو رہی ہے۔

جب سب ملنے والے جا چکے تو موہنی نے بھائی کو بلا کر کہا "بھیا میرے دونوں بچوں اور بھابی کو بلا لو۔ آج میں تم سب سے دل کھول کر باتیں کروں گی" موہن نے ڈاکٹر شہاب کی طرف دیکھا جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی اپنی مریضہ کو دیکھنے آئے تھے۔ "ایسا نہ ہو کمزوری ہو جائے"۔ موہنی نے آزردگی سے کہا "کچھ ہو مجھے آج ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے" ڈاکٹر شہاب نے کہا "آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اب آپ رو بصحت ہیں مگر آپ کی مکمل صحت کے لئے سب سے لازمی چیز یہ ہے کہ آپ خود ہمت اور پوری قوت ارادی سے کام لے کر دل میں یہ بات جما لیں کہ میں ضرور اچھی ہو کر رہوں گی"۔

موہنی نے ڈاکٹر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا " ڈاکٹر صاحب آپ مجھے ——
مریض کو دھوکا دیتے ہیں —— مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے کہ میں اچھی ہوں گی یا
نہیں —— یہ صحت نہیں سنبھالا ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ کر کہیئے۔ کہ میری حالت اچھا
ہونے کی ہے ؟" ڈاکٹر شہاب نے سر جھکا لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف
دیکھنے لگے۔

موہن، سوہنی، پریم اور سروتی کو بلا لایا۔ چند منٹ بعد پرتاب بھی کمرے میں
داخل ہوا اور موہنی کی مزاج پرسی کی۔ موہنی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کوئی جواب نہیں
دیا۔ کچھ دیر بعد موہن سے بولی " تم سب میرے قریب آجاؤ " تاکہ میری آواز اچھی طرح سن
سکو۔ ڈاکٹر صاحب آپ یہیں رہیئے۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔ ہاں سسٹر (نرس)، تم
کچھ دیر کو باہر چلی جاؤ۔" نرس باہر چلی گئی۔ باقی سب لوگ آ کر موہنی کے پلنگ کے قریب
بیٹھ گئے صرف پرتاب ذرا سے ہٹ کر آرام کرسی پہ پڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔
ڈاکٹر نے انار کا عرق موہنی کو پلایا اور موہنی آہستہ آہستہ رُک رُک کر کہنے لگی۔
"جانتے ہو میں نے تم سب لوگوں کو کیا کہنے کو بلایا ہے ؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ
وصیت کروں گی۔ نہیں مجھے کوئی وصیت نہیں کرنی۔ میں تو تم لوگوں کو اپنی دردبھری
مصیبت کی کہانی کے چند ورق سناؤں گی۔ دنیا ہمیشہ اس دھوکے میں رہی۔ کہ میں
بڑی خوش نصیب ہوں۔ کیوں ؟ اس لئے کہ خوبصورت ہوں۔ بال بچے والی ہوں۔ گھر یا
روپیہ پیسے کی ریل پیل ہے۔ نام، عزت، دولت، اولاد، حسن کیا چیز تھی۔ جو میرے
گھر میں نہ تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی کی خوش قسمتی نے اسکے میاں کو معمولی اوورسیر
سے ایک لکھپتی ٹھیکیدار بنا دیا آخر یہ سب خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے ؟ مگر آہ کسی

کو کیا معلوم، کوئی کیا جانے کہ اس عزت اور دولت کے حصول کیلئے خاطر ایک کمسن شریف لڑکی کی شرافت کا اس کی نیکی، اسکے ارمان اور آرزوؤں، اسکی محبت اور سکون قلب اس کی صحت اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خون کیا گیا ہے۔ کاش ـــــ اے کاش مجھے یہ بناوٹی عزت، یہ منحوس دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی ـــــ کاش میں ہمیشہ ایک غریب اور سسیر کی بیوی رہتی۔ ہائے کیا اچھے دن تھے جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں قدم رکھا تھا۔ بھیا آپ کو تو یاد ہوگا اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟

"چودہ یا پندرہ برس کی"۔

"تو بھیا پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ شادی کے بعد تین چار سال میں نے کس قدر خوشی اور اطمینان سے گذارے۔ یہ (پرتاب کی طرف اشارہ کرکے) جو اب میری صورت سے بیزار ہیں۔ اس وقت پروانہ وار مجھ پر نثار تھے۔ میری ہر خواہش پوری ہوتی۔ دن رات میری دلداری اور دلجوئی کی جاتی مجھے ایک دیوی کی طرح پوجا جاتا تھا ـــــ آہ میں اس وقت انہیں ایک فرشتہ سمجھتی تھی! ـــــ دنیا کا بہترین انسان تصور کرتی تھی! دیوتا جانتی تھی!!! مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اس ملمع کے نیچے کھوٹی چاندی بھی نہیں سیاہ لوہے کا ٹکڑا ہے ـــــ ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوتا کے بھیس میں شیطان ہے"۔

پریم اور سوہنی نے حیرت اور خوف سے ماں باپ کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا ہرسوتی نے پرتاب پر جو خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا نفرت کی نظر ڈالی۔ موہن نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملائمت سے کہا "موہنی میری جان ذرا شانتی سے کام لو۔ موہنی نے آنسو بھری آنکھیں بھائی کی طرف اٹھائیں "بھیا سولہ سترہ برس سے میں یہ سب مصیبتیں سہہ رہی ہوں اور کبھی کسی کے سامنے اُف نہیں کی۔ کوئی سا الزام انھوں نے مجھ پر

نہیں لگایا۔ کیا کچھ جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت میں نے نہیں اٹھائی۔ پر اپنا حال لوگوں پر کھلنے نہ دیا۔۔۔۔ خصوصاً اپنے میکے والوں پر کبھی اپنے مصائب کا اظہار نہ کیا۔ کیا اب آخری وقت میں بھی تم مجھے دِل کی بھڑاس نہ نکالنے دو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ساری دنیا کی طرح میرے بھائی بھاوج اور میری اولاد بھی مجھے مجرم گنہگار اور روسیاہ سمجھیں۔ میں گنہگار ضرور ہوں، بہت ہوں مگر اتنی نہیں جتنی دنیا نے اور اس شخص نے مجھے مشہور کر رکھا ہے۔" تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا:۔

"میں سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی جب پریم بٹیا تم پیدا ہوئے۔ میری اسوقت کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میں سچ مچ اپنے کو دنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی، تھوڑے دن بعد پرتاب نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کا ایک افسر جو اُن پر بہت مہربان تھا۔ انجنیئر ہو کر اس شہر میں آیا۔ پرتاب کو امید تھی کہ اگر یہاں ٹھیکیداری کی جائے۔ تو انجنیئر صاحب کی عنایت سے خوب چلے گی۔ کچھ روپیہ ہم لوگوں نے کئی سال میں جوڑا تھا کچھ میرا زیور بیچ کر فراہم کیا۔ افسروں کی سرپرستی سے انہیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور ہمارے گھر میں دولت کی گنگا بہنے لگی۔ سارا خاندان خوش تھا، دوست احباب خوش تھے، یہ خوش تھے اور خود میں بہت خوش تھی ۔۔۔ آہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اس پر عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ دولت کے ساتھ ساتھ حیثیت بھی بڑھی اور ہم اونچی سوسائٹی میں آنے جانے لگے تعلیم یافتہ فیشن ایبل عورتوں کے سامنے میں بالکل جاہل گنوار اور بے وقوف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اُن عورتوں کی عادتیں اور طریقے ناپسند تھے، دل میں اُن سے نفرت کرتی تھی۔ مگر جب ان کے سامنے

جاتی تو اپنے کو کچھ کمتر اور ذلیل سا محسوس کرتی —— پرتاب نے مجھے انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا اور ایک میم خاص اس لئے رکھی کہ مجھے موجودہ تہذیب اور آداب و معاشرت اور "ہائی سوسائٹی" کے "اٹیکیٹ" کی تعلیم دے۔ بہت جلد یہ سب باتیں میں نے سیکھ لیں۔

ہم لوگ خوب سیر تماشوں میں مصروف رہتے۔ کبھی سینما، کبھی تھئیٹر، کبھی پکنک اور دعوتیں کبھی بال روم میں جاکر تماشا دیکھنا، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنے خاص خاص دوستوں سے میری ملاقات بھی کرادی تھی جنہوں نے مجھ سے بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ رفتہ رفتہ میں سوسائٹی میں روشناس ہو گئی۔ ہر جگہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔ دعوتوں اور تقریبوں میں سب سے پہلے میرا بلاوا آتا۔ ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ مجھے ملتا، پارٹیوں میں مرکز نگاہ میں ہی ہوتی —— ہر روز کہیں نہ کہیں آنے جانے دعوت وغیرہ کا پروگرام بنایا جاتا۔ میری گھریلو زندگی روز بروز ختم ہونے لگی۔ اور میں اپنے گھر سے بیگانہ ہوتی گئی —— گھر کا انتظام اور خرچ باورچی اور بیرے وغیرہ کے ہاتھ میں تھا۔ جن عورتوں سے میں نفرت کرتی تھی اب خود بھی ان کے رنگ میں رنگی جا رہی تھی۔

دو تین سال بعد سوہنی۔ نم پیدا ہوئی۔ کئی مہینے بیماری کے سبب مجھے بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ اس زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ پرتاب میری بیماری سے پریشان نہیں بلکہ بیزار سے ہیں۔ دراصل گذشتہ کئی سال ہر وقت اس قدر مصروفیت اور کھیل تماشوں میں بسر ہوئے تھے۔ کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے یا پرتاب کے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت گھر سے باہر

گزارتے ہیں۔ کبھی روتی تو خفا ہوتے کہ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کر لیا اور کہا آج کل یہی فیشن ہے کہ میاں بیوی کا بیڈ روم بھی الگ الگ ہو۔ یہ پہلا صدمہ تھا جو مجھے پہنچا مگر میں نے ایک لفظ مُنہ سے نہیں نکالا۔ بچوں کے لئے آیا ئیں اور گورنس رکھ دی گئیں اور مجھے حکم ملا کہ ان کے کمرے بھی الگ کر دو۔ خیر چند مہینے بعد میں اچھی ہو گئی۔ کچھ دن بعد ایک پارٹی میں چیف انجینئر صاحب نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ پرتاب کا اصرار تھا کہ ضرور جاؤ بہرحال میں گئی۔ میں اُس شخص کی دوستی سے بچنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ میری حد سے زیادہ تعریف اور بے حد خاطر مدارات کرتا اور ان کی طرف رُخ بھی نہ کرتا۔ یہ چیز مجھے کھٹکتی تھی اور ناگوار گزرتی تھی۔ مگر پرتاب اس کی بہت تعریف کرتے اور اس سے تعلقات بڑھانے پر زور دیتے۔ کیوں؟ تاکہ ان کا فائدہ ہو۔ اور انہیں اور زیادہ بڑے بڑے ٹھیکے ملیں پہلی مرتبہ میرے دل میں پرتاب کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا کہ یہ شخص اس قدر بے غیرت اور خود غرض ہے کہ غیر لوگوں سے بیوی کی دوستی کراتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان سے اسے کوئی عقیدت ہے یا ان کے اخلاق و عادت سے بہت متاثر ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اور زیادہ دولت سمیٹ سکے۔ اسے جائز یا ناجائز ہر طریقے سے لاکھوں کے ٹھیکے ملیں۔ خواہ اس کے لئے بیوی کو بد چلن مردوں سے دوستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے ——" سوہم نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ موہن نے تھوڑا سا انگور کا عرق اُسے پلایا۔ اور تاکئے ہٹا کر آرام سے لٹا دیا۔

"ان کی دولت روز بروز بڑھنی لگی۔ اور اسکے ساتھ ساتھ طبیعت بھی بدلتی

گئی۔ راتوں کو غائب رہتے۔ مجھ سے بے اعتنائی برتتے۔ مزاج میں بھی سختی آگئی تھی۔ صرف سوشل موقعوں پر مجھ سے اظہارِ محبت اور خصوصیت ظاہر کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ان سے بالکل متنفر کر دیا۔ ڈاکٹر آپ تو جانتے ہیں وہ واقعہ کیا تھا؟ نہیں میں خود بتاتی ہوں! اُنہوں نے ایک بے تکلف پارٹی میں مجھے جبراً شراب پلا دی۔ میں اسکی تفصیل نہیں بتاؤں گی ——— مجھ میں اتنی طاقت اور برداشت نہیں ——— انہیں اُس زمانے میں کسی بہت بڑے ٹھیکے کی فکر تھی اور انہوں نے اپنے خیال میں چیف انجنیئر کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ اس دن سے ہمارے تعلقات اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ یہ روز بروز آزاد اور لاپرواہ ہوتے گئے۔ میں نے دو ایک مرتبہ شکایت کی۔ تو مجھے سخت سُست کہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ پر سخت شرمناک الزام لگایا۔ میں غصے میں آپے سے باہر ہو گئی اور برس پڑی۔ انہوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی۔ مارنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ اسکے بعد سے مجھے ان کی صورت سے دلی نفرت ہو گئی۔ اُنہوں نے مجھ پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کر دی۔ صرف اس پارٹی اور جلسے میں مجھے جانے کی اجازت تھی۔ جس میں یہ خود بھی جائیں۔ یہی حال تفریح اور سینما وغیرہ کا تھا۔ اگر کبھی ملنے والی عورتوں سے یا عزیزوں سے بھی ملاقات کو جاتی۔ تو دو تین نوکر خفیہ پولیس کی طرح میری نگرانی کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ دفتر سے دس مرتبہ فون آتا کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں۔ میری ذلت کی انتہا ہو چکی تھی۔ دن رات کی کوفت اور روحانی اذیت نے میری صحت پر برا اثر ڈالا۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا۔ مجھے کہتے بھی لاج آتی ہے ——— ڈاکٹر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں؟ جب کبھی کچھ ہونے والا ہوتا نہ دستی دوائیں پلا کر اور انجکشن لگوا کر اُسے ضائع کر دیا جاتا۔ اس طرح پانچ مرتبہ ہوا۔ صحت

ور بھی بدتر ہو گئی۔ شراب کی لت تو یہ لگا ہی چکے تھے۔ اب میں اپنا غم غلط کرنے کو باقاعدہ
شراب پینے لگی۔ اگرچہ یہ خود بھی پیتے تھے۔ اور خود ہی اس منحوس شئے کو مجھے زبردستی
پلا کر کے پلایا کرتے تھے۔ مگر پھر اس کو بھی ملامت اور طعن کرنے لگے۔ میں ضد میں
آکر اور زیادہ پیتی۔ مجھے اندر ہی اندر یہ گھن کھائے جاتا تھا کہ اس شخص نے جسے
میں اپنا دین، ایمان، اپنی جان، اپنا دیوتا، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اس نے میری عزت
پر، میری وفاداری پر شک کیا اور مجھ پر اتنا بڑا شرمناک الزام لگایا۔"
موہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرتاب جواب تک بالکل خاموش بیٹھا تھا
آگے بڑھا اور موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "موہنی ——— آج مجھے سچ سچ
بتا دو۔ کیا میں غلطی پر تھا اور میری بدگمانی بالکل بے بنیاد تھی ——— یا اس میں کچھ
سچائی بھی تھی؟" موہنی نے بیباکی سے پرتاب کی نظروں کا مقابلہ کیا۔ "میں آخری وقت
میں جب کہ پرمیشور کے سامنے جانے کو تیار ہوں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گی ——— تم نے مجھ
ناسمجھ کم عمر لڑکی کو یہ آزادی کی راہ دکھائی اور اپنی اس ذلیل سوسائٹی سے روشناس
کرایا ——— میں کچی لکڑی تھی جس طرف جھکایا جھک گئی۔ بیشک میں لوگوں سے ہنستی بولتی
تھی۔ مذاق دل لگی کرتی تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب لوگ میرے حسن و جمال کی
تعریفیں کرتے تو مجھے سرور سا حاصل ہوتا ——— لوگوں کے اشارے کنایوں میں اظہار
الفت کو میں قہقہوں میں ٹال دیتی۔ میں نے شراب بھی پی ——— تمہارے مجبور کرنے پر
ڈانس بھی کیا ——— لیکن پھر بھی ——— میں پاک ——— باعصمت ہوں۔ میں جھوٹ نہ
بولوں گی۔ چیف انجینئر مجھ سے اکثر اشاروں کنایوں میں اظہار الفت کرتا تھا۔ مگر میں
مذاق میں اڑا دیتی تھی ——— ایک مرتبہ اس نے مجھ سے صاف صاف اظہار محبت کیا مگر

میں نے اُسے ایسی ڈانٹ پلائی ـــ اتنی غیرت دلائی ـــ اس قدر شرمندہ کیا کہ وہ رونے لگا مجھ سے معافی مانگی اور تب سے آج تک ـــ اُس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور ہمیشہ محبت اور احترام کا برتاؤ کیا ـــ بیشک وہ شریف آدمی ہے اور تم ..... تم ..... نہایت ذلیل ـــ کم ظرف ـــ بد باطن ـــ بد گمان ـــ جاؤ ـــ جاؤ ایشور کے لئے یہاں سے چلے جاؤ ـــ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ ـــ تم نے خود بدکاریاں کیں اور اپنی بے گناہ بیوی پر الزام لگائے ـــ تمام دنیا میں بدنام کیا ـــ میرے بچوں کو مجھ سے جدا کر کے دور دور پڑھنے بھیج دیا کہ وہ ماں کی بری عادتیں سیکھیں گے ...... ان تک کے سامنے مجھے ذلیل کیا ـــ چلے جاؤ ـــ یہاں سے چلے جاؤ ـــ مجھے تم سے نفرت ہے ـــ"

موہنی کا سر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پریم سر جھکائے بیٹھا رہا، سوہنی ہچکیوں سے روتی رہی۔ موہن کا چہرہ رنج اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی سُرخ ہو جاتا کبھی زرد اور کبھی سفید۔ پرتاب تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہاب نے نرس کو بلایا دونوں نے مل کر خدا جانے کیا کیا تدبیریں کیں انجکشن دئے دوائیں منہ میں ڈالیں تب کہیں گھنٹے بھر بعد میں موہنی ہوش میں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریم اور سوہنی کو اشارے سے قریب بلایا اور گلے سے لگایا۔ اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "میرے بچو ..... تمہاری ماں گنہگار ہے تم اس کی مکتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے رہنا ...... اور ...... اس کی ناکام و نامراد زندگی سے سبق لینا۔ دُنیا کی جاہ و منزلت ـــ عزت اور دولت کی خواہش سے کبھی مغلوب نہ ہونا ـــ ہمیشہ اپنی ماں اور باپ کی ناکام زندگی کی مثال پیش نظر رکھنا۔ سچی

یشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ سچی محبت اور اعتبار سے، قناعت اور خدمت
لی سے حاصل ہوتی ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ "بھیا میں بہت گنہگار ہوں۔
لیشور سے میرے لئے دعائیں کرتے رہنا ـــــ اور دیکھنا میرے بچوں کا خیال رکھنا ـــــ
یہ بھی میری طرح تباہ نہ ہو جائیں۔" موہن سے ضبط نہ ہو سکا، بہن کی پٹی پر سر رکھ کر زار و قطار
روئے لگا۔ ڈاکٹر شہاب بہت پریشان، کبھی موہنی کی نبض دیکھتے، کبھی سانس کی رفتار
گنتے، کبھی انجکشن دیتے اور پاؤں کے پاس گرم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ موہنی کا چہرہ
لحظہ بہ لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا اور اس پہ ایک خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی۔
.... اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ بہت نحیف آواز میں کہا "پرتاب
کو بلاؤ ـــــ میں آخری دفعہ انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔" سرسوتی جا کر پرتاب کو بلا لائی
اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بال پریشان تھے۔ کمرے میں موت کا سا سکوت
چھایا ہوا تھا جو کبھی کبھی موہنی کی ہچکیوں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ پرتاب نے جھک کر اپنا
ہاتھ موہنی کے ماتھے پر رکھا ـــــ اس کی آنکھیں بند تھیں پر لب ہل رہے تھے ـــــ
پرتاب نے اپنا کان اسکے لبوں سے ملا دیا ـــــ "میں نے ـــــ معاف کیا ـــــ معاف کر
دیا ـــــ مجھے اب بھی ـــــ ہاں ـــــ اب بھی ان سے ـــــ محبت ـــــ ہے ـــــ ایشور
ـــــ میرے گناہ ـــــ بخش دے ـــــ شاید۔" پرتاب لڑکھڑا کر زمین پہ بیٹھ گیا اور بے تاب
ہو کر چیخ اٹھا۔ "موہنی ـــــ میری مظلوم موہنی ـــــ تم بے قصور ہو۔ تم بے گناہ ہو ـــــ میں نے
تم پہ بے جا شک کیا۔ خواہ مخواہ الزام دیا ـــــ میں گنہگار ہوں ـــــ سیاہ کار ہوں۔
آہ موہنی تو دیوی ہے ـــــ" موہنی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں
پوری کھلی ہوئی اس وقت بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں ـ ان میں سے موت جھانک

رہی تھی۔ اُس نے پرتاب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور ایک نامعلوم سی آواز مُنہ سے نکلی: "اب میں شانتی سے مروں گی ــــ ایشور ــــ مجھے ــــ معاف ــــ"

ڈاکٹر نے ہلکے سے موہنی کی کھُلی ہوئی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر دیں جن سے آنسوؤں کے دو قطرے اِدھر اُدھر ٹپک پڑے ــــ ڈاکٹر نے چادر سے موہنی کا منھ ڈھک دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ــــ سارا گھر شور و شیون کی آواز سے گونج اٹھا۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی

"میں نے اپنی زندگی کے حالات کے اجمالی خاکے کہیں کہیں اپنی کہانیوں میں پیش کر دیئے ہیں، "تصویر" جس پر میں نے بہت کچھ سُنا، ایک ایسی کہانی تھی جس میں میں نے اپنی زندگی کے دو مختلف ادوار کو پیش کیا تھا "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی کشمکش! میں نے اپنی ذہنی الجھنوں کا تجزیہ کر کے سنبل کے کردار میں ان احساسات کو سمو دیا جو مصنف کی زندگی میں بھی داخل ہوتے ہیں،

اس سے قطع نظر میں متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہوں، وطن سیوہارہ ضلع بجنور (یو-پی) ہے۔ اوائل عمری لکھنؤ میں بسر کی، پھر والدین کے ساتھ سیوہارہ آگئی، وہاں سے پھر علی گڑھ ایک سال کے لئے آگئی، جہاں اشتراکی تحریک سے بالواسطہ تعلق ہو گیا۔ اسی عرصہ میں اشتراکیت کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ دور میری زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس نے میری زندگی کو یکسر بدل دیا۔ پچھلے سال سے سی-پی میں اپنے بھائی کے ساتھ مقیم ہوں، مستقبل کا پروگرام مرتب نہیں کر سکتی، یہ ہے میری مختصر سی روداد حیات ——"

صدیقہ بیگم

صدیقہ بیگم

اندھیارے کے سپنے

بھارتی آہستہ آہستہ جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ اسکے قدموں کی چاپ، جیسے دھرتی اس کو اپنے چرنوں میں سمیٹ رہی ہو۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس میں برف کا سا جمود تھا اور تنہائی جیسی خاموشی۔ شام ہو چکی تھی، سورج افق کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اندھیارا اُسکے ڈوبنے سے پہلے ہی بھارتی کی جھونپڑی میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ تاریکی تو اسکے گھر میں سدا ہی سے ہے جب سورج دیوتا اپنی روشن کرنوں سے سیاہی کو دھونا چاہتا ہے تو سیاہی بہہ کر انہیں گھروں میں پناہ لیتی ہے۔ بھارتی کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں، جس کی شکتی پر اتنی نا امیدیوں کے بعد بھی اس کو بھروسہ تھا۔ کاش وہ کچھ دیر کے لئے اس ڈوبتے ہوئے دیوتا کو اپنی نگاہوں سے سہارا دے سکتی تاکہ وہ اس اندھیارے کے مقابلہ کی شکت پیدا کر سکے ——— یہ سورج تو خیر آکاش کے قبضے میں ہے، وہ تیل ہی جو دھرتی کی کوکھ سے نکلتا ہے۔ اس کو نہیں مل سکتا ——— سورج پوچھتا ہے "کون ہے جو

میری جگہ لے گا؟" ــــــ ساری کائنات بھائیں بھائیں کرنے لگتی ہے۔ آکاش خون کا پھاگ کھیل رہا ہے۔ دھرتی پر سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں ــــــ "ہاں ــ کون ہے جو میری جگہ لے گا؟" دیوتا گرج کر پوچھتا ہے ــ مٹی کا دیا خاموش نہیں رہ سکا۔ شاید اس میں کچھ تیل باقی ہے۔ "میں کوشش کروں گا۔" وہ کہتا ہے اور اب سورج کو اطمینان ہے وہ رات کی گود میں شانتی سے اندھیارے کے سپنے دیکھے گا ــــــ اور جیسے وہ دیا جو تھوڑی سی بساط پر اپنی لو اونچی کئے تھا جیت گیا ــــــ یہ دیا سورج کی طرح اندھیارے سے ہارتا نہیں۔ وہ رات بھر روشنی کے سپنے دیکھتا ہے۔ دیا بھی اندھیارے کی آس ہی تو ہے ــــــ بھارتی مٹی کا دیا ٹمٹما رہی تھی۔ جو اس وقت نہ جانے کتنے اندھیارے اپنی گود میں چھپائے تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ــــــ چراغ کی لو اندھیارے کی نذر ہو چکی تھی۔ کئی دن سے وہ پوجا بھی تو نہ کر سکی تھی ــــــ اُس کی آشائیں مدھم پڑ گئیں اور کیسے نہ مدھم پڑتیں جب تیل ہی نہیں تو دیا کیسے جلے۔ وہ پوجا کیسے کرے، نہیں ــ وہ اندھیارے کے آگے سر نہیں جھکا سکتی ــــــ ہر طرف پر حول تاریکی ــ سیاہی ہی سیاہی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ــــــ،

"بابا ــــــ!" اُس نے اپنے بچے کو پکارا، جیسے دور کہیں اندھیارے میں کوئی روشنی دکھائی دے جائے۔ بھارتی کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ بابا کے پاس پہنچی۔

"بابا ــــــ اب بخار کیسا ہے؟" اس نے اندھیرے میں ہات بڑھایا جو بچے کی گرم گرم پیشانی سے ٹکرا کر ساکت ہو گیا۔

"ماتا ــــــ؟" بابا کی ہلکی آواز فضا میں تھرائی۔

"ہاں ــــــ تیری بھارتی ماتا"

"ماتا ——— !" اس نے دوبارہ کوشش کرتے ہوئے کہا اور اندھیرے میں ہاتھ چلایا جو اس کے اور ماتا کے درمیان دھوئیں کی طرح حائل تھا۔ وہ اپنی ماں کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ یہ اندھیرا دیکھنے بھی دے اور نا امید ہو کر اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے آہستہ سے کہا "ماتا ——— یہ اندھیارا نہیں دیکھا جاتا۔"

"میرے لال!" کتنی قوت آ گئی تھی ماتا کے ان دو شبدوں میں۔ گویا وہ اپنے لال کے لئے بجھے ہوئے سورج کی تمام شعاعیں ہی تو اکٹھا کر دے گی۔

"ماتا ——— کتنی رات ہو گئی۔" وہ اندھیرے سے گھبرا رہا تھا۔

"ابھی رات کہاں بیٹا ——— کھولی کے باہر دیکھ اُجالا ہی اُجالا ہے۔"

"پر ——— ماتا ——— کس کام کا وہ اُجالا جو کھولی کے باہر ہی رہے؟" اور وہ نا امید ہو کر چپ ہو گیا۔ جب اُس کی اپنی کٹیا میں اُجالا نہیں تو پھر چاہے ساری دھرتی پر اُجالا ہی اُجالا ہو اس کے لئے تو یہ ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں ——— پر ماتا کی آنکھیں نہ جانے اس کو دیکھ بھی سکیں یا نہیں۔

"بیٹا ——— ابھی تو بہت سمے ہے۔ آکاش کی لالی ہماری مدد کرے گی، اپنی کھولی میں بھی اُجالا ہو ہی جائے گا ——— میں تیل لاتی ہوں ——— دیکھ آج سے یہ جیوتی کیسے جگتی ہے۔" بھارتی کے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ ہڈیاں ایک دوسرے سے پیوست ہو گئیں۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اُسکے جسم میں بھگوان جانے اتنی شکتی کہاں سے آ گئی تھی پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔ دھرتی ماتا کوئی تیل تھوڑا ہی اگلے گی ——— یہ کیسی ماتا ہے جس میں ماتا نہیں ———

"بھارتی چل پڑی ——— نا امیدیاں اُس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ تیل کو ڈھونڈنا

چاہتی تھی، پر آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی آن مٹتی ہوئی آشاؤں کے ساتھ ڈوبی جا رہی ہے۔ کنول کی گود میں جیسے پانی کا ایک قطرہ آ کر جم گیا اور اُس نے دونوں پٹ بھینچکر اُس کو گرا دیا ——— سیٹھ جی سے بوتل بھی تو لینی ہے، کہیں ٹنکی بند نہ ہو جائے ——— اندھیارا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اسکے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے۔ نظریں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے برگد کے گھنے پیڑ کے پیچھے غائب ہو گیا بھارتی اس کی لالی کو تکتی رہ گئی۔ جیسے سانپ نکل گیا۔ اور وہ لکیر پیٹتی رہ گئی اُس نے نظریں جھکا لیں، پھر بھی نہ جانے وہ کونسی آرزو تھی جو اس کو اندھیارے سے لڑنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ بیٹا بیمار ہے، تن ڈھکنے کو کپڑا نہیں ——— لیکن روشنی کی تمنّا اسکی ہر خواہش پر حاوی تھی،

سیٹھ کا مکان آ گیا۔ وہ اندر چلی گئی، ہر طرف اُجالا ہی اُجالا تھا اُسکی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس اُجالے میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ روشنی کی خواہش مدھم چراغ کی لو بن گئی۔ اسکی آنکھیں جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈنے لگیں،

"بیٹا ——— ذرا ——— بوتل تو دیدے۔" اس نے سیٹھ کی لڑکی سے کہا اور اُس کی نظریں" اسٹوو کے ہلکے نیلے اور ہرے شعلوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

"بیٹا ——— یہ کیا ہے؟"

"یہ انگریزی چولھا ہے ——— اس میں مٹی کا تیل جلتا ہے۔"

"مٹی کا تیل ——— " بھارتی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دھرتی سے تیل اب بھی نکلتا ہے؟ وہ بانجھ نہیں ہوئی گیا ——— لیکن اسکی ممتا اپنے بیٹوں میں سگے اور سوتیلے کا امتیاز کرتی ہے شاید۔

"لو ——— یہ تو تل نیل لینے جا رہی ہو؟"

"ہاں ———" وہ اس سے آگے نہ بول سکی۔ اس کی نگاہیں اُس پردیسی چولھے کے شعلوں کی طرح جل رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے بوتل اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کا عزم ارادہ ابھی نہیں بدل چکا تھا ——— چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا ——— وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ابھی کتنی دور جانا ہے۔ بابا کا نہ جانے کیا حال ہو ——— بھگوان تو اسکی رکھشا کرے ——— وہ پھر فضا کے بے رنگ خلا اور دھرتی کے اندھیارے میں آکاش کی لالی ڈھونڈنے لگی۔ اس کا جیون آشاؤں سے بھرپور ہے۔ وہ آشائیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں ——— انھوں نے ہمیشہ ہی تو اس کو نراس کیا ہے لیکن اُس نے کبھی بھی اسکی پروا نہیں کی۔ وہ سدا ساگر کے دھارے میں بہتی رہی جو بھی دھارا آیا اس کو اپنی طرف بہالے گیا۔ بھارتی کا سارا جیون انہیں لہروں میں لپٹا ہوا تھا ——— پھر بھی نراس نہ تھی ——— ایک دن اُس کا بیٹا اچھا ہو کر اجیالے کے درشن کرے گا ——— اسکی کٹیا آکاش کی لالی کی طرح سُرخ ہو جائے گی وہ محنت مزدوری کر کے اپنے لال کے جیون کو اجیالے سے بھر دے گی ——— اسکی آنکھیں چمک اُٹھیں، جیسے جیون کے سپنے سدا سچے ہی تو ہوتے ہیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے انگریزی چولھا جل رہا تھا جس میں لَو تو نکل رہی تھی۔ پر دھواں غائب تھا ——— تیل کی ٹنکی قریب آ گئی کتنی عورتیں، اور بچے اپنی اپنی بوتلیں لٹکائے کھڑے تھے۔ ٹنکی کا پالش کیا ہوا سرا چودھویں کے چاند کی طرح سیاہی میں چمک رہا تھا جس کے ارد گرد چند تارے ٹمٹما رہے تھے، وہ تارے جو تاریکی میں بھی اُجیالے کی آس بندھاتے رہتے ہیں۔ بھارتی کا ذہن بیکار ہو گیا۔ وہ چل نہیں رہی تھی۔ بلکہ قدم آپ ہی آپ منزل کی طرف اٹھ رہے تھے۔

"ہائے بھگوان ——— کتنی بھیڑ ہے اور کتنا اندھیرا۔" ایک عورت نے کہا۔

"اب سے نہیں رہا۔ بابو نے تیل بند کر دیا۔"

"اب کل ملے گا۔"

"کل ملے گا ——" بھارتی چونک پڑی۔ جیسے چلتے چلتے یکایک اس کا سر کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ اس کی نظریں چودھویں کے چاند کو تک رہی تھیں جو اب بھی اُسی طرح چمک رہا تھا۔

"دوپہر سے کھڑے کھڑے گوڈے بھی ٹوٹ گئے۔ اب تو گھر جانے کی تاکت نہیں" ایک بوڑھی عورت بولی جو زندگی کی تقریباً ستر منزلیں انہیں دکھ اور مصیبتوں کے درمیان طے کر چکی تھی۔

"اب کیا ہوگا —— دیا کیسے جل سکے گا" بھارتی کی آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح بوتل لئے کھڑی رہی۔ اس کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ کہ تیل ملے گا بھی کہ نہیں کبھی سب کے سب آس لگا کر ایک لائن میں کھڑے ہو جاتے —— شاید بابو کو اُنکی حالت پر کچھ رحم آ جائے۔ پر جب معلوم ہوا۔ کہ بابو کو سینما کے لئے دیر ہو رہی ہے، وہ آج تیل نہ دیگا تو سب کی آشائیں ٹوٹ گئیں —— وہ اپنی خالی بوتلوں کو مایوس نظروں سے دیکھنے لگے

بھوک سے ننھے بچوں کی چیخ پکار نے فضا میں ایک عجیب ہیبتناک کیفیت پیدا کر دی تھی۔ یہ بچے دیر تک اسی طرح روتے رہے۔ چندا ماموں کو دیکھکر بھی تو چپ نہ ہوتے اس لئے کہ چندا ماموں دُور کے تھے۔ وہ اُن کے خالی پیٹ پھر سے نہ بھر سکتے تھے۔

"اب کس بکھت گھر پہنچیں گے اور کب پکانا ریندھنا ہوگا۔ میرا گاؤں بھی تو کتنی کوس ہے —— بچے نے رو رو کر ناک میں جان کر دیا۔"

"ہاں ہائے —— دوپہر کا کھائے تھے اب بکھت آ گیا ہے۔ آکھر کہاں تک برداست کرتے۔"

"اب کل پھر آنا ہو گا ۔۔۔۔ اس لڑائی نے تو ہم گریبوں کا جیون بالکل ہی اجیرن کر دیا۔"
"اری بہن ۔۔۔۔ تیل تو تیل پہننے کو کپڑا تک نہیں ملتا۔ آ گھر کوئی ننگا بھی کیسے پھرے۔" ایک عورت بولی۔ جس کی پھٹی ہوئی دھوتی سے چاند کی کرنیں اُس کے جسم میں سرایت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مگر بھارتی ۔۔۔۔ اُس کو تو صرف تیل چاہیے تھا۔ وہ اس سے اپنی کٹیا میں چراغ جلائے گی۔

"میرا بیٹا۔" اُس نے دل ہی دل میں کہا ماتا کی آواز سنانے کی نہیں ہوتی۔ اس میں شاعروں کی سی تڑپ اور دیپک جیسی لپک ہوتی ہے ۔۔۔۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، اب بھیڑ چھٹ گئی۔ جیسے چیونٹیاں رینگتے رینگتے بلوں میں گھس گئی ہوں بھارتی نے اپنی خالی بوتل کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر چمکتے ہوئے چاند پر جم گئی۔ کاش وہ اس کی کرنوں کو اپنی بوتل میں انڈیل دے ۔۔۔۔

"چلو بائی! راموتیلی کے پاس والے سیٹھ کی دکان پر دیکھیں شاید وہاں مل جائے"
ایک نے رائے دی۔

"وہ دیدے گا ۔۔"

"دو چار آنے جیادہ ہی لے گا اور کیا ۔۔۔ پر تیل تو مل جائے گا۔"

بھارتی کی جان میں جان آ گئی۔ اُس نے چاند کی طرف دیکھا جو بادلوں میں سرکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جوں جوں بادل چاند کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھارتی کے قدم تیز ہوتے جاتے تھے۔ بابا کا نہ جانے کیا حال ہو گا ۔۔۔۔ اس نے اپنے دھول میں اٹے ہوئے پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ کس قدر تھک گئی تھی۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا ۔۔۔۔

بادل گھر کر آ رہے ہیں، چاند بھی اپنی کرنیں سمیٹنے والا ہے۔ اُس نے پھر آکاش کی طرف دیکھا۔ اسکے قدم لڑکھڑانے لگے۔ پھر اس کی نظریں ان تاروں پر پڑیں جو آسمان پر کہیں کہیں بکھرے ہوئے تھے ـــــ چاند چھپ بھی جائے تو کیا، یہ تارے تو دھرتی ماتا کو کالی ناگن سے بچا ہی لیں گے۔ وہ اپنے خیالوں میں کتنی دور نکل گئی۔ سیٹھ کی دکان نہ جانے کہاں ہے، وہ گھبرا گئی۔ اس کا جیون بھی کیسا ہے کبھی تو آشائیں خود بخود آجاتی ہیں اور کبھی پھر اس کو نراس کر دیتی ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ سیٹھ کی دوکان، رنگ برنگ قمقمے، دیواروں کے ہرے۔ لال، پیلے بیل بوٹے اس کی تخیئلی آنکھوں میں گھوم گئے۔ پھر ذرا دیر میں سیٹھ کی دکان مل گئی، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ چاند بادلوں سے نکل آیا۔ دھرتی پہ چاندنی ہی چاندنی بکھری پڑی تھی۔ آکاش کے تارے مدھم پڑ گئے۔

"سیٹھ جی ـــــ تھوڑا تیل ہوگا؟"

"کیا تیل؟ ـــــ" سیٹھ کے لہجہ میں کرختگی تھی۔

"مٹی کا تیل ـــــ" بھارتی سراپا عاجزی بن گئی۔ "سیٹھ جی میری کٹیا میں اندھیرا پڑا ہے۔"

"پڑا ہوگا ـــــ تو میں کیا کروں۔ چل یہاں سے، تیل ویل نہیں۔ دکان بند کرتے سمے کون تیل دے گا۔" سیٹھ نے اُجالے کی بھکارن کو ٹھکرا دیا۔

"تھوڑا سا سیٹھ جی ـــــ" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، پر کہہ نہ سکی

"دُور ہو یہاں سے ـــــ" سیٹھ گرجا اور غصہ سے اس کی توند زیر و زبر ہونے لگی۔

بھارتی کی بوتل گرتے گرتے بچی۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ بادل کے دوسرے ٹکڑے نے آ کر چاند کو اپنے تاریک دامن میں چھپا لیا تھا ـــــ اب کیا ہوگا، وہ بیٹے کو کیا جواب دے گی۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔ وہ عہد کر کے نکلی تھی ـــــ پر اب خالی بوتل لئے جا رہی تھی۔ بھگوان جانے اس کا کیا حال ہو ـــــ سیٹھ کی بوتل بھی تو واپس کرنی ہے۔ بیچارے کتنا خیال کرتے ہیں، اب دیکھو بوتل ہی دے دی ـــــ پھر کس کام کی وہ بوتل جو ایک دیئے کی پیاس نہ بجھا سکتی ہو ـــــ وہ کوٹھی کی طرف چل دی۔ اس کی آنکھیں دُور ستاروں میں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں، بادلوں سے سیاہی دور ہو چکی تھی۔ وہ پربت کی شکل بنائے سارے آکاش پر چڑھے آ رہے تھے۔

بھارتی کی نظریں آکاش پر ہمالہ کی چوٹیوں پر جمی ہوئی تھیں ـــــ پھر اس کو خیال آیا کہ سیٹھ جی کی لڑکی سے تو ذرا مانگ کر دیکھے۔ "بیچاری بڑی سیدھی ہے ـــــ اکثر ہم گریبوں کی جندگی پر افسوس کیا کرتی ہے۔ وہ جرور دے دیگی۔" پھر تارے اس کی آنکھوں میں ٹمٹمانے لگے جو کبھی بجھ جاتے اور کبھی چمک اٹھتے۔ اُس کے قدم تیز ہو گئے۔ "اسٹوو" کے نیلے اور ہرے شعلوں کی لپک اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اندھیارے میں آشاؤں کے سپنے دیکھتی ہوئی وہ کوٹھی میں داخل ہوئی۔ بجلی کی تیز روشنی، اجالا ہی اجالا ہے ـــــ اور وہ پھر اس اجیالے سے گھبرانے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ جی چاہا واپس چلی جائے۔ کیا فائدہ کہنے سے ـــــ اس سمے کون کسی کی مدد کرتا ہے ـــــ اُس کی امیدیں پھر ٹوٹ رہی تھیں۔

"کیوں؟ ـــــ تیل مل گیا" سیٹھ کی لڑکی نے پوچھا۔

بھارتی کچھ کہنا چاہتی تھی پر نہ کہہ سکی اُس کے الفاظ گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ اس

نے خاموشی سے خالی بوتل آگے بڑھا دی۔
"اچھا —— تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں تھوڑا سا لاتی ہوں۔ لیکن کسی کو پتہ نہ چلے"
لڑکی بوتل لے کر اندر چلی گئی۔

بھارتی کو تیل مل گیا —— وہ کس قدر خوش تھی۔ جیسے جیون کی بازی جیت لی ہو۔ جیسے اندھیارا ہار گیا ہو۔ اس نے غور سے بوتل کو دیکھا اور ایسا محسوس کیا جیسے کتنے ہی چاند، سورج، اور ستاروں کا اجالا اسمیں بند ہے —— اس کے گھر میں دیپ جل اٹھے۔ سیٹھ کی کوٹھی کی طرح اسکی کٹیا بھی روشن ہو گئی اور اندھیارا دور کہیں بن باسی ہو گیا —— اف کتنی رات ہو گئی۔ سورج کب کا سورگباش ہو گیا۔ بابا نہ جانے کیسا ہو گا —— وہ جاتے ہی کہے گی۔
"بٹیا! —— دیکھ میں تیرے لئے کتنے اجیالے لائی ہوں"۔
وہ دوڑنے لگی۔ بٹیا بیمار ہے، اندھیرے میں پڑا ہے، اسکی راہ تکتے تکتے نراس ہو گیا ہو گا —— وہ آگے نہ سوچ سکی۔ چاند اسکے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اجیالا اس کے ہمراہ تھا۔ کہیں میرا بٹیا میری راہ تکتے تکتے نراس نہ ہو گیا ہو۔ اس کا ذہن پھر چونکا —— نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔
وہ میرا بٹیا ہے۔ وہ اندھیارے سے ہار نہیں سکتا۔ اس کا جی گھبرانے لگا۔ کاش اسکے پر ہوتے تو وہ اڑ کر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جاتی اور دیا جلا دیتی۔ وہ چونک پڑی، اسکے قدم رک گئے۔ اس نے آج بھی پوجا نہیں کی —— وہ سیٹھ کے یہاں کر سکتی تھی، پر وہ بھول گئی —— بٹیا بیمار ہے، پیٹ کی آنچ سب کچھ بھلا دیتی ہے

——— اُس کو غصہ آنے لگا، اس نے پاپ کیا ہے۔

بھارتی اپنی کٹیا کے قریب پہنچ گئی، چاند سامنے والی کوٹھی کی آڑ میں چھپ گیا اسکی کٹیا پر کوٹھی کا سایہ کالے کالے دیو کی مانند بڑھتا دکھائی دیا۔ رات کے بڑھتے اندھیرے میں وہ روشنی کی بھی شمع لئے جا رہی تھی۔ جو جاتے ہی مل اُٹھے گی۔

"بیٹا ——— !"

اُس نے دروازہ وہی سے آواز دی پر کوئی جواب نہ ملا، اُس نے پھر آواز دی — اور دور کسی کونے سے ایک جھینگر نے اس کی آواز کا کرخت جواب دیا۔ بھارتی کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہاتھ کانپ گیا۔ اُس نے جلدی سے بوتل کو زمین پر رکھنا چاہا، لیکن جیسے دھرتی غائب ہو گئی ہو۔ بوتل کسی سخت چیز سے ٹکرائی ——— چھن ——— ن ——— ن۔ اندھیارے سے اُجیالا ٹکرا کر چور چور ہو گیا . . . .

طاہرہ دیوی شیرازی

میں سرزمین بنگال کے ایک چھوٹے سے شہر میں اس وقت پیدا ہوئی جب حکومت ہند اپنے صدر مقام کو کلکتے سے دہلی منتقل کر دینے کی تجویز منظور کر چکی تھی۔ بچپن عیش و عشرت میں گذرتا چلا گیا۔ لیکن پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ جنگ عظیم چھڑ گئی اور والدِ بزرگوار اس کے منحوس دیوتا کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ گویا قدرت کے ظالم ہاتھوں نے مصائب و آلام کے بہت سے دروازے بیک وقت میرے سامنے کھول دئے۔ چچا صاحب نے (خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے اب وہ بھی اس دُنیا میں نہیں ہیں) مجھے اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دی کیونکہ انہیں مجھ سے زیادہ اس مختصر سی دولت سے ہمدردی تھی۔ جسے والد صاحب مستقبل کا صحیح علم نہ ہونے کے باعث بالکل غیر محفوظ حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ میری تعلیم کا سلسلہ جس نے محض چند ابتدائی منزلیں ہی طے کی تھیں۔ بہت جلد ختم ہو گیا اور میں گھر کی چار دیواری میں چچا زاد بھائی بہنوں کی جھڑکیاں سننے اور ایک ملازمہ کی طرح ہر قسم کا نیچی کام کاج کرنے کے لئے مجبور ہو گئی۔ زندگی اس طرح بھی گذرتی رہی۔ اگرچہ ایک ایسے دریا کی طرح جو بہتا ہے۔ مگر اسکی روانی محسوس نہیں ہوتی۔

موسیقی بنگال کی ہر لڑکی کے لئے جزو ایمان کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے شروع

ہی ہیں اپنی توجہ اس طرف مبذول کر دی تھی۔ اور اس وقت بھی جب گھر کی مذموم
فضا میری فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے میں ناساز گار ثابت ہونے لگی تھی میں
فالتو وقت میں پنڈتوں کے بنائے ہوئے اشلوکوں کی بجائے گائیکوں کے سرگم یاد کرتی
اوپر اپر جینتی رہی۔ چنانچہ خدا کی یہ دین ہی میری نجات کا باعث ہوئی۔ موسیقی کے ایک
ایسے جلسے میں جس کی صدارت گورو دیو ڈاکٹر ٹیگور آنجہانی فرما رہے تھے۔ میں نے
رقص عطائیوں کی صف میں شامل ہو کر اس طرح مظاہرۂ فن کیا کہ عام لوگوں کے علاوہ
اس سب سے بڑے قدر شناس سے بھی خراج تحسین حاصل کر لیا۔ دراصل اس وقت کی وہ
قدر و منزلت ہی میرے لئے شانتی نکیتن میں داخلے کا باعث بنی، جس کے علم پرور ماحول
نے میری زندگی کو صحیح معنوں میں زندگی بنا دیا۔

پھر جیسا کہ میں "سحر بنگال" کے دیباچے میں لکھ چکی ہوں، مجھے شادی کے سلسلے میں
اپنا مذہب تبدیل کر دینا پڑا۔ لیکن یہ تبدیلی دل و دماغ میں نورِ عرفان کی کوئی چمک
پیدا نہ کر سکی اور اس لحاظ سے میں جہاں تھی، پھر بھی وہیں رہی، کیونکہ میرے نقطۂ نظر سے
دنیا میں پھیلتی ہوئی کائنات کا مطالعہ ہی انسان کا سب سے بڑا مذہب ہے۔

ازدواجی زندگی کے لمحات ہر اچھی چیز کی طرح سریع الزوال ثابت ہوئے اور میں
ایک بار پھر دنیا میں مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان سے کچلے جانے
کے لئے ایک حد تک تنہا چھوڑ دی گئی ہوں۔ مرحوم شوہر کی آخری نشانی صرف ایک
بچے کی صورت میں موجود ہے جس کی دیکھ بھال میں اپنا زیادہ وقت گزار دیتی ہوں۔
صحت خراب ہو چلی ہے پھیپھڑوں کا نظام عمل بگڑ گیا ہے تاہم مرنے کا ابھی کوئی
اندیشہ نہیں ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ مجھے مہاتما گاندھی یا برنارڈ شا کی طرح اپنی

قوتِ ارادی پر بھروسہ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ڈاکٹروں نے بھی ناامید ہو کر ابھی آخری جواب نہیں دیا ہے شاید اس لئے کہ انہیں اپنی فیس اور دواؤں کی قیمت وصول ہو جانے کا پورا پورا الیقین ہے۔

اپنی بابت اور کیا لکھوں کیونکہ میں کیا اور میرے حالات زندگی ہی کیا۔

اُردو میری مادری زبان نہیں، پھر بھی مجھے اس سے خاص دلبستگی ہے۔ مشرقی ہی نہیں، میں نے مغربی زبانوں میں بھی اس جیسی لطافت و شیرینی کہیں محسوس نہیں کی لیکن اس کا کیا علاج کہ اس زبان کے حاملانِ ادب کسی کو ٹھیک طرح پنپنے ہی نہیں دیتے یا تو ضرورت سے زیادہ تعریف کر کے غرور و تکبر کا نشہ طاری کر دیا جاتا ہے یا حد سے زیادہ مذمّت کر کے احساسِ کمتری کے بیج بو دئے جاتے ہیں نتیجہ دونوں صورتوں میں یکساں رہتا ہے۔ ابھرتے ہوئے پودے درمیانی منزل ہی میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں جب میرے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا تو نصیرالدین ہاشمی نے اتنی زبردست تقریظ لکھی کہ اسے پڑھ کر مجھے شرم سی آنے لگی۔ اسکے بعد عظیم بیگ چغتائی نے قلم اُٹھایا اور مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی ناکام کوشش کی ایسے ایسے حملے کئے کہ بس خدا کی پناہ۔

اوّل الذکر کی بابت کیا کہوں۔ وہ دیرینہ کرم فرما ہیں اور میں رہتی دنیا تک انکے خلوص کو بھلا نہیں سکتی، موخرالذکر کی بابت کیا لکھوں وہ اپنا "رختِ ظرافت" باندھ اس دنیا سے بگڑ کر چل دئے۔ پھر میں ہی ان پر کیوں بگڑوں۔ تاہم ان واقعات نے اس قدر دل دُکھایا۔ کہ اب عقل میدانِ ادب سے بہت دور رہنے کو کہتی ہے کبھی کبھی اسکا کہنا نہ مان کر کچھ لکھ لیتی ہوں۔ خدمت ادب کے روائتی نام پر نہیں محض اپنا دل خوش کرنے کے لئے۔

طاہرہ دیوی شیرازی

دونوں سے

(۱)

صبح کا وقت تھا۔ ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے اندر آ آ کر میرے بالوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اور میں پاؤڈر سے فارغ ہو کر لبوں پر سُرخی جمانے میں مصروف تھی کہ اچانک ممی کمرے میں داخل ہوئیں اور خواہ مخواہ بیڈمنٹن کا بلا اٹھا کر اسکی ڈوریوں کا معائنہ اس طرح کرنے لگیں گویا وہ خود بھی چڑیا کے کھیل کے موضوع پر آفاقہ گفتگو کرنا چاہتی تھیں جس کی جرأت اس وقت تک ان میں پیدا نہیں ہوئی تھی میں نے قدِ آدم آئینہ کی طرف مُنہ کئے کئے انہیں مخاطب کیا۔

"ممی! آج شام کو دعوت کن بزرگ کی ہے اور کس تقریب میں ہے؟" جمنا نے چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے جوڑ کر چھیڑا تھا۔ لیکن میں بلٹا نیڈ سینڈ والے ایک قلمی

گیت کا ریکارڈ سننے میں اس قدر محو تھی۔ کہ اسکی پوری بات سن ہی نہ سکی۔ اسکے چلے جانے کے بعد خیال آیا کہ تفصیل معلوم کر لینی چاہیئے تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شام کو میری بھی ضرورت پڑے اور میں گھر پر موجود نہ ملوں۔ قیاس کہتا ہے کہ چونکہ آج ہفتہ ہے اسلئے شانتا حسب معمول شام کو آئے گی اور سینما چلنے کے لئے کہیگی۔ گلوب ٹاکیز میں گون ود دی ونڈ چل رہا ہے مسلسل پانچ گھنٹے کا رنگین فلم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے سیٹ بک کرا لی ہوگی۔ اور ممی! میں تو کہتی ہوں کہ آپ بھی ضرور چلیں۔ ایسے نایاب فلم بار بار نہیں آتے۔ سنتا ہے کہ کمپنی کا پانچ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ ہندستانی فلم ۔ ۔ ۔ ۔ "

میں چاہتی تھی کہ بالکل غیر متعلقہ باتوں کو اس قدر طول دوں کہ اصل موضوع گفتگو خاک میں مل جائے۔ میرے کان میں بھنک پڑ چکی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنی دانست میں بالکل چپکے چپکے کھچڑی پکا رہی ہیں جو گٹھ جوڑا جا رہا ہے، آج شام اس کے شیرے سے میرے شیرازۂ حیات کو منضبط کرنا مقصود ہے۔ اس لئے میں نے جان بوجھ کو چاہا کہ ممی کو اپنا منشا ظاہر کرنے کا موقعہ ذرا دیر میں ملے اور میں اس خلش انتظار سے لطف اٹھاتی رہوں جو ان کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔

در اصل ان کی گفتگو میرے لئے موجب مسرت نہیں بن سکتی تھی۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ شنکر کے ہوتے ہوئے سرو چینی کسی اور کو شریک حیات بنانے کے لئے رضامند ہو جاتے۔ ممی نے اگر میری نظروں کو دیکھ کر یا میری باتوں کو سن کر کوئی اندازہ نہیں لگایا تھا تو ذمہ داری خود انہی پر عائد ہوتی تھی۔ یا شام کی دعوت کا اہتمام کرنے سے پہلے میری رائے معلوم کر لی ہوتی۔ عین ممکن تھا کہ میں کھلے لفظوں میں اپنے من

کی بات انہیں سمجھا دیتی۔ لیکن چونکہ یہ نہیں ہوا اس لئے میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ ان کہنہ بساطِ زندگی کے شہ پٹے ہوئے مہروں کو اس قدر نہ چ کیا جائے کہ کہیں بچنے کی جگہ نہ مل سکے اور اس طرح شام کا معاملہ بالکل سچی کہانی ہونے کے باوجود ایک فرضی قصے کے رنگ میں ڈوب جائے۔

ممی قطع کلام کرتے ہوئے بولیں" فلم رنگین ہو یا سادہ۔ میں کہے دیتی ہوں۔ کہ آج شام تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتیں اگر شانتا آئی تو میں اُسے بھی دعوت میں شریک ہونے کے لئے روک لوں گی۔ بات یہ ہے کہ تمہارے پتا جی نے اپنے دو مختلف دوستوں کے لڑکوں کو کھانے پر مدعو کر لیا ہے۔ دونوں بہت قابل شریف اور خوبصورت ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم ان میں سے کسی ایک کو اپنی مرضی کے مطابق پسند کر لو تاکہ اسی کے ساتھ رشتہ طے کر لیا جائے۔ تمہاری عمر کافی ہو گئی ہے اور اب ضرورت ہے کہ بہت جلد شادی ہو جائے"۔

" تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ جاؤں"۔ میں نے بلاؤز کے نیچے پیر نکلو کے ذریعے پیرس سینٹ چھڑکتے ہوئے کہا۔

" چل دُور ہو!" ممی بگڑ کر بولیں"۔ ایسی باتیں مُنہ سے نکالنی بھی نہیں چاہئیں شریفوں میں یہ کب ہوا ہے۔ جو تجھ پر شبہ بھی کیا جا سکے"۔

ممی کا خیال بالکل غلط تھا۔ فرار ہونے کا مرض شریف گھرانوں میں زیادہ لاحق ہوتا ہے بس اتنا فرق ہے کہ اس طبقہ کی عورتیں واپس آ جانے کی نیت سے عموماً ایک آدھ رات بلکہ اس سے بھی کم مدت کے لئے بھاگتی ہیں اور چونکہ بھاگنے کا مقصد ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے ساتھ ٹُرومنزمیں پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے

زیادہ عرصہ یا ہمیشہ کے لئے کسی دوسرے شہر بھاگ جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی نام نہاد شرافت کا پردہ چاک ہو جانے کے بعد بھی چڑھا رہتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ موسیقی اور رقص کی طرح فرار بھی ایک فن لطیف ہے جس سے نچلے درجے کی لڑکیاں محروم رہتی اور اسی لئے بدنام ہو جاتی ہیں۔

"تمہیں چاہیئے" ممی نے کسی قدر مشفقانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "تم آج تمام کو صحیح معنوں میں زینت محفل بن جاؤ اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لے کر ان مہمانوں کو اچھی طرح خوش کر دو۔"

"میں جانتی ہوں ممی!" میں نے بظاہر سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ "زریں موقعہ زندگی میں صرف ایک بار نصیب ہوتا ہے۔ عقلمند کا فرض ہے کہ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھائے اور مستقبل کو سنوار لے۔"

قدرتی طور پر ممی اس قدر خوش ہوئیں کہ وفور مسرت میں مجھ سے لپٹ گئیں اور بے تحاشہ میرے گالوں کو چوم لیا۔

"لیکن یہ تو بتایئے کہ شرافت و قابلیت سے قطع نظر ان کی مالی حیثیت کیا ہے؟" میں نے اپنی نہیں بلکہ خود ممی کی ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے انہی سے سوال کیا۔

"تم خاطر جمع رکھو۔" وہ بولیں۔ "ہم دونوں نے اس اعتبار سے بھی پوچھ گچھ کر کے اپنا اطمینان کر لیا ہے۔ دونوں کے پاس کافی اثاثہ موجود ہے اور مستقبل بھی شاندار ہے۔"

"اچھا تو کم سے کم غائبانہ تعارف کے طور پر ان کے نام وغیرہ تو بتا دیجئے۔ تاکہ

عین موقع پر میں کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ مل سکوں" - میں نے ممی کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

ممی قدرے ہچکچائیں۔ وہ میری من موجی کی عادت سے بخوبی واقف نہیں وہ جانتی نہیں کہ پہلے سے کچھ بتا دیا گیا۔ تو میں دن بھر تصورات کی دنیا میں تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ہر پہلو پر غور کرتی رہوں گی۔ اسکے برعکس انہیں یہ بھی معلوم تھا۔ کہ میرے سوال کو ٹال دینا آسان کام نہیں ہے۔ میں اپنی ضد ہمیشہ پوری کرا کے چھوڑتی ہوں چنانچہ انہوں نے مجبور ہو کر کہا۔

"تم انہیں پہلے سے جانتی ہو۔ وہ دونوں بارہا ہماری کوٹھی پر آ چکے ہیں ایک تو رمیش ہے، ڈپٹی امرناتھ صاحب کا لڑکا جو پچھلے ایم۔ اے کے امتحان میں اوّل نمبر رہا اور دوسرا ہے کشور، سیٹھ گنگا پرشاد کا اکلوتا بیٹا جو اپنے باپ کے ساتھ تجارت میں برابر کا شریک ہے۔ یہ نسبتاً بہتر رہ سکتا ہے لیکن پھر بھی انتخاب کا پورا حق تمہیں حاصل ہے تمہاری پسند پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکے گا"

"بہت خوب" میں نے بیڈمنٹن کا بلا سنبھالتے ہوئے کہا" اب تو مجھے جانا ہے کلب میں شانتا اور نرملا انتظار کر رہی ہوں گی۔ دھوپ زیادہ ہو گئی تو ایک سیٹ کھیلنا بھی دوبھر ہو جائے گا"

میں نے انتظار کرنے والوں میں شنکر کا نام مصلحتاً نہیں لیا کیونکہ وہ کوئی اور دن ہوتا یا اس روز وہ گفتگو نہ ہو چکی ہوتی تو کسی قسم کا مضائقہ نہیں تھا۔ ممی اسے جانتی اور نا پسند کرتی تھیں۔ وہ نہایت عمدہ کھلاڑی اور بمثیل مصور تھا۔ لیکن اسکی آمدنی برائے نام تھی۔ ہمارے ملک میں فن کاری کی صحیح قدر نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ

شاید ہو سکے گی۔

رتنیش اور کشور کو میں جانتی تھی۔ وہ دونوں اس باسی مٹھائی کی مانند تھے جیسے حلوائی نے نقرئی ورق لگا کر دیدہ زیب بنا دیا ہو۔

(۲)

کلب میں شانتا اور نرملا پارٹنر بن کر اکیلے شنکر کو تھکا دینا چاہتی تھیں۔ مگر خود ہانپ رہی تھیں۔ وہ تنہا ان دونوں پر بھاری تھا۔ ٹینس کا اچھا کھلاڑی بیڈمنٹن خوب کھیلتا ہے۔ میں کورٹ کے قریب جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ان سب کے بلانے پر بھی کھیل میں شریک نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں اس وقت خلاف معمول میرا دل ضرورت سے زیادہ مغموم ہو گیا تھا۔ حالانکہ زیادہ اُداس ہونے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

شنکر میرا رنگِ رُخ دیکھ کر ایک ہی نظر میں تاڑ گیا۔ کہ معاملہ کسی قدر نازک ہے۔ اور دردِ سر کی شکایت محض عذرِ لنگ ہے۔

اس احساس کے ساتھ ہی اس کا کھیل بگڑنے لگا۔ اسکے چلے ہاتھ غلط پڑنے لگے وہ برابر ہر پوائنٹ پر ہارا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مبتدی لڑکیاں ایک اچھے کھلاڑی سے جیت گئیں۔ میں نے اپنی صنف کی اس وقتی کامیابی پر مصنوعی مسرت ظاہر کرتے ہوئے دل میں سوچا۔ پرماتما نہ کرے کہ یہ اپنی زندگی کی بازی میں بھی اسی طرح ہار جائے۔ اگر اس مصور کے علاوہ کوئی دوسری ہستی مجھے جیت کر لے گئی تو میرے خیالوں میں رنگ کون بھرے گا۔ میری شاعری بالکل پھیکی ہو کر رہ جائے گی۔

ان تینوں کے اصرار پر میں نے تمام حالات من وعن بیان کر دیئے۔ شانتا کے

پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

"اری واہ ری پگلی! تو تو ایک دم اس طرح رنجیدہ ہو گئی۔ جیسے سچ مچ تیری شادی زبردستی کر دی گئی ہو۔ کیا تجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے۔ کہ صاف لفظوں میں انکار کر کے اپنے من کی بات کہدے اور اگر واقعی تیرے لئے یہ ناممکن ہے، تو چل میں آنٹی سے کہے دیتی ہوں۔ کہ دعوت کا اہتمام تو ضرور کرو۔ بلکہ ہمیں بھی بلاؤ۔ لیکن اصل مقصد کو پس پشت ڈال کر، اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دوں گی کہ تمہاری سروجنی تو اس کھلاڑی کی دھرم پتنی بننا چاہتی ہے۔ جو آج ہی صبح ہم سے بُری طرح ہارا ہے۔"

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور یہ حقیقت ہے کہ قہقہے کے بعد سے میرے دل کا رنج و غم کیسی قدر دب کر رہ گیا۔

سب نے سر جوڑ کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا شروع کیا جس کا محض تصور میرے لئے سوہانِ رُوح تھا۔ آنِ واحد میں ایک دلچسپ اور کارگر پلاٹ تیار کر دیا گیا طے پایا کہ شانتا اور رتنا ملا صرف وقتی طور پر اپنی عزت و آبرو کی بازی لگا کر میری خاطر اداکاری کریں گی۔

ہم چاروں اکٹھے کلب سے لوٹے اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

—— (۱۳) ——

ممی گھر کی اچھی طرح صفائی ستھرائی اور دعوت کی تیاری کے سلسلے میں اس درجہ مصروف ہوئیں کہ انہیں شام تک مجھ سے دوبارہ گفتگو کرنے کا موقعہ نہ ملا حتیٰ کہ میرے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا۔ اور میں اسی انتظار میں سر پہ رومال لپیٹے مسہری پہ لیٹی رہی تاکہ وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر خود اندازہ لگا لیں کہ میں دلچسپ گفتگو

کرنے کے لئے صحیح موڈ میں نہیں ہوں۔ میں بظاہر سوگوار صورت بنائے پورے لطف کے ساتھ لادیتا لزوا پڑھتی اور دانتے کے رنگین خیالات کے مزے لیتی رہی۔

شاید آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ شانتا اور نرملا آدھمکیں اور میرے کمرے میں آنے کی بجائے سیدھی ممی کے پاس پہنچیں۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم کی نوک پلک سنوار رہی تھیں۔ شانتا نے قریب جا کر بڑے میٹھے انداز میں کہا۔ "آنٹی! آج ایک نہایت عمدہ اور رنگین فلم کا آخری شو ہے۔ ہم سروجنی کو ہمراہ لے جائیں گے اور آپ کو بھی ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"ہاں۔ آنٹی ضرور چلیں گی۔" نرملا نے گویا تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پوری چار سیٹ جو بک کرائی ہیں۔ ایسے فلم بار بار نہیں آتے۔"

"ناممکن ہے۔" ممی نے انقطاعی فیصلے کے لہجے میں کہا۔ "آج دو مہمانوں کی دعوت ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی گھر سے نکال نہیں ہو سکتا۔ سروجنی بھی نہیں جا سکتی اس کی شرکت لازمی ہے بلکہ اب میں تم دونوں کو بھی نہیں جانے دوں گی۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہارا انتظار تھا۔ سروجنی نے فلم کا ذکر کرتے ہوئے صبح کے وقت بتا دیا تھا۔ کہ تم شام کو یہاں آؤ گی۔ ورنہ میں ضرور گھر سے بلا بھیجتی۔ اچھا۔ اب کمرے میں جا کر دیکھو۔ سروجنی نے لباس تبدیل کر لیا یا نہیں۔ وہ کلب سے آنے کے بعد جو اندر گھسی ہے تو باہر نکلی ہی نہیں۔"

معمولی رد و کد کے بعد شانتا اور نرملا دعوت میں شریک ہونے کے لئے راضی ہو گئیں۔ کیونکہ پہلے سے یہی طے کیا گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ممی میری ان عزیز ترین سہیلیوں کو مدعو کرتے ہوئے بالکل نہ ہچکچائیں گی اور اگر بفرض محال انہوں نے رُخ دے

کہ بات نہ کی تو یہ خود ڈھیٹ بن کر ڈھسل پڑینگی ۔ یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

یہ دونوں جب کمرے میں داخل ہوئیں تو میں اس طویل نظم کا وہ بند پڑھ رہی تھی جس میں باپ کی وفات پر بیٹی کی آہ و زاری کو دل ہلا دینے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ وہ میرے سر پر بندھے ہوئے رُومال کو دیکھکر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئیں میں بھی ہنس پڑی اور یہ بتانا ہی چاہتی تھی کہ ممی نے میرے اس بھروپ کو ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ کہ اچانک وہ اندر داخل ہوئیں اور میری ظاہری حالت دیکھکر حیران رہ گئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ڈاکٹر کو بلا کر فوراً طبی امداد لی جائے لیکن میں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "بہت معمولی بات ہے۔ کچھ دیر بے وقت سوتے اور زیادہ عرصہ خاموش پڑے رہنے سے یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ابھی اُٹھ کر ہاتھ منہ دھوتی اور لباس تبدیل کرتی ہوں اور ہاں ممی اچھا ہوا آپ آگئیں میں یہ پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ اس وقت کون سی ساری پہنوں ؟"

اور اس سے قبل کہ وہ کچھ جواب دیں، شانتا بیچ میں بول پڑی "اوئی سرحینی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جدید فیشن کے مطابق ڈنر کے موقع پہ ہلکے بورڈر کی سفید ساری زیادہ زیب دیتی ہے۔"

ممی کا خیال تھا کہ میں بنارسی یا کارچوبی پوشاک پہن کر بالکل مُرغِ زرین بن جاؤں تاکہ میری سج دھج دیکھنے والوں کی نگاہ میں کھُب جائے۔ مگر شانتا اور نرملا کے ساتھ بھلا کس کی چل سکتی تھی اس قدر باتیں بنائیں کہ ممی کو سر جھکا دینا پڑا اور با تفاق رائے وہ بھی سفید ساری کے حق میں فیصلہ کر کے چلی گئیں۔

میں نے یہ سادہ لباس پہن کر کسی قسم کا میک اپ بھی نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے

تمام دلوں ہے آرائشِ جمال کا اس قدر شوق رہتا تھا کہ اسکے بغیر کسی محفل میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔

(۴)

آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ سیٹھ گنگا پرشاد کے صاحبزادے کشور تشریف لے آئے۔ جونہی انہوں نے کمرے میں قدم رکھا۔ شانتا مسکرا کر آگے بڑھی اور اس انداز سے گویا برسوں کی جان پہچان ہو انہیں مخاطب کر کے بولی:۔

"کہئیے سیٹھ صاحب! کیسے مزاج ہیں؟ عرصہ کے بعد حسنِ اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ آپ تو بھول کر بھی ہمارے گھر نہیں آتے۔ بھیا اکثر آپ کو یاد کرتے ہیں"

اور اس کے بعد جو گھل مل کر گفتگو شروع کی ہے۔ تو کسی دوسرے کو کشور سے یا کشور کو کسی اور سے مخاطب ہونے ہی نہ دیا۔ کشور کی حالت اس مجرم کی طرح تھی جسے پہلی ہی پیشی پر عدالت کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کیا گیا ہو اور جسے اپنے جرم کی نوعیت بھی معلوم نہ ہو۔ وہ دماغ پر زور ڈال کر اس سوچ بچار میں تھا کہ آخر یہ لڑکی کون ہے؟ اسکے بھائی سے میری دوستی کیسے ہوئی؟ اور میں اسکے گھر کب آتا جاتا تھا؟ وہ اس قدر بوکھلایا کہ صاف لفظوں میں کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی "ہاں" اور "نہیں" کے سوا تیسرا کوئی لفظ ان کی زبان سے نہ نکل سکا۔

آٹھ بج کر تین منٹ گزرے تھے کہ دوسرے امیدوار ڈپٹی صاحب کے فرزند رمیش بھی آ گئے یہ کسی قدر اپ ٹو ڈیٹ تھے۔ ان کے داخل ہوتے ہی ڈیڈی نے فوراً ان کا تعارف پہلے ممی سے اور پھر مجھ سے کرایا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں کشور کی طرح وہ بھی بالا ہی بالا اُچک نہ لئے جائیں۔ یہ حضرت مصافحہ کی غرض سے

ہاتھ بڑھا کر میری طرف رجوع ہوئے۔ میں رسنا دونوں ہاتھ جوڑ کر ذرا پیچھے ہٹ گئی۔
اب نرملا سے نہ رہا گیا۔ اداکاری کے جوہر دکھانے کے لئے اسکی باری تھی۔ وہ
بے ساختہ بولی۔
"مسٹر رمیش! میری سہیلی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ آپ کے مزاج پوچھتی
ہیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔"
اور جب رمیش نے اسکی طرف دیکھا تو وہ بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر کسی قدر جھک
گئی اور مسکرا کر کہنے لگی "میں ہوں آپ کی دیرینہ احسان مند جس کے اکیس۲۱ روپے
اب تک آپ پر واجب ہیں۔"
"کیسے اکیس۲۱ روپے؟" رمیش کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی
ہیں؟ میں بالکل نہیں سمجھا۔"
"جی ہاں۔ اب تو سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن بہر حال آپ تشریف
رکھیں۔" اُس نے صوفے پر اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "برج میں
ہارنے والا کھلاڑی عموماً پرانی واجب الادا رقمیں بھول جایا کرتے ہیں۔ خیر کیا
ہے میں مطالبہ تو نہیں کر رہی۔ میں نے صرف حوالہ دیا ہے۔ تاکہ آپ آسانی
سے پہچان سکیں۔"
اور ان الفاظ کے ساتھ اُس نے بھی نشا نشا کی طرح باتوں کے طوفانی سمندر
میں تیرنا شروع کر دیا۔ میں ممی اور ڈیڈی بالکل خاموش بیٹھے ان چاروں کا منہ
دیکھتے رہے۔
آخر کچھ دیر بعد ڈیڈی نے ملازموں کو اشارہ کیا کہ ڈرائنگ روم میں کھانا

چن دیا جائے اور پھر ہم سب اُٹھ کر وہاں چل دئے۔ پہلے سے طے یہ ہوا کہ میں کشور اور رمیش کے درمیان بیٹھوں تاکہ ان دونوں کو مجھے اچھی طرح دیکھنے اور مجھ سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہے لیکن میری سہیلیوں نے اس تجویز کو بھی کامیابی کا موقع نہ دیا۔ انہوں نے ایسا داؤں کھیلا۔ کہ رمیش اور کشور کو بیچ میں دھکیل کر خود دونوں سرے دبا بیٹھیں اور میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے دوسری طرف ڈیڈی اور ممی کے درمیان بچھی ہوئی کرسی کو اپنے لئے غنیمت سمجھا۔

کھانے کے دوران میں بھی شانتا اور نرملا کی کبھی ختم نہ ہونے والی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور وہ دونوں امیدوار "صُمّ بُکمٌ" کے مصداق سر جھکائے کھانا کھاتے رہے اب یہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ "ختم اللہ علیٰ قلوبہم" کے زمرے میں بھی شامل تھے۔ یا اُن کے دل و دماغ میرے ان جلووں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ جن کو صرف ایک اُچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد پوری آسودگی کے ساتھ دیکھنا نصیب نہ ہو سکا تھا۔

کھانا ختم ہونے کے کچھ دیر بعد شانتا اور نرملا خود اپنی مرضی سے رمیش اور کشور کے ساتھ یہ کہکر جانے کے لئے تیار ہو گئیں کہ اب تو موٹر میں چلا جانا آسان ہے اس کے بعد شاید سواری کے لئے تانگہ بھی نہ مل سکے۔

غرض یہ کہ ممی کے منصوبوں کو توڑنے کے لئے صبح کے وقت جو خیالی محاذ قائم کیا گیا تھا۔ وہ کافی مضبوط ثابت ہوا اور توقع سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔

(۵)

ڈیڈی کھانا ہضم کرنے کی خاطر چہل قدمی کے خیال سے باغیچہ کی طرف چلے گئے۔
اور ممی مجھ سے مخاطب ہوئیں "سرفرحی! تمہاری ان سہیلیوں کے متعلق جو رائے میں نے
قائم کی تھی وہ آج تبدیل کر دینی پڑی۔ یہ کتنی آزاد، بے حیا اور بیباک ہیں کہ بس خدا
کی پناہ۔ تمہیں تو ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی نہیں چاہیئے۔"
"ممی!" میں نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔ "آپ عورت ذات ہوکر ایسی بات کہہ
رہی ہیں۔ بھلا شاہ تاتا اور مسز ملا کا اسمیں کیا دوش ہے۔ رمیش اور کشور ان کے پرانے
گرویدہ ہیں اور غالباً شادی کی تجاویز تک پیش کر چکے ہیں۔ میں اسوقت کے
علاوہ بھی کلب وغیرہ میں ان دونوں امیدواروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ چکی ہوں
نت نئی عورتوں کو پرچانے میں پورا پورا کمال رکھتے ہیں۔"
"خیر ان باتوں کو چھوڑو۔" ممی نے کسی قدر جزبز ہوکر کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ ان دونوں
میں سے کس کو زیادہ پسند کیا ہے؟"
"بات یہ ہے ممی!" میں نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا۔ "ان دونوں میں الگ الگ
بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن ایک ہی قسم کی جو خوبی ایک میں موجود ہے۔ وہ دوسرے
میں نایاب ہے۔ لہٰذا ان دونوں کی فطرتوں کو اگر ملا کر کسی خاص ترکیب سے الگ کیا جائے
تو اہرمنی اور یزدانی صفات کے دو مثالی شوہر تیار ہوسکتے ہیں۔"
"یہ کیا بکواس ہے۔" ممی برہم ہوگئیں۔ "مجھے صاف صاف لفظوں میں جواب دو۔"
"بات یہ ہے ممی!" اب میں سنجیدہ ہوگئی۔ "ان دونوں میں سے کوئی ایک شخص
صرف اپنی بیوی سے وابستہ ہوکر نہیں رہ سکتا۔ اسلئے میں بھی ان میں سے کسی ایک

کی پابند ہو کر رہنا کیونکر گوارا کرلوں۔ لہٰذا آپ کی پسند کا احترام کرتے ہوئے میں چاہتی ہوں کہ بیک وقت ان دونوں سے شادی کرلوں۔"

"بیک وقت دونوں سے!" ڈیڈی جو ہم دونوں کی لاعلمی میں دہلیز کے قریب کھڑے تمام گفتگو سن رہے تھے، اپنے استعجاب کو الفاظ میں تبدیل ہوئے بغیر نہ روک سکے۔ ممی کا چہرہ پہلے ایک سوالیہ علامت اور پھر حرفِ ندا بن کر رہ گیا۔

میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے دراز کھول کر دیکھا کپڑوں کی تہ میں چھپی ہوئی شنکر کی دلکش تصویر میری اداکاری پہ مسکرا رہی تھی۔

دوسرے روز میں نے شانتا اور نرملا کے ہمدردانہ ایثار کا شکریہ ادا کیا۔

عائشہ درانی

میں ۱۹۲۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئی۔ والد کی طرف سے یوسف زئی اور
والدہ کی طرف سے صدیقی ہوں۔ اپنے والدین کی پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی
بہنوں میں سب سے زیادہ لاڈلی تھی، نہایت ناز و نعم میں پرورش پائی۔ بچپن میں
شاید ہی کبھی کوئی بڑی سے بڑی خواہش رد کی گئی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ایک عمر تک
غم دنیا کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی۔ لکھنے کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہوا بلکہ میں تو
یہ کہوں گی۔ کہ یہ شوق میں نے ورثے میں پایا۔ والد صاحب سرکاری ملازمت کے رکن
ہونے کے باوجود بہترین سیاسی بصیرت رکھنے کے علاوہ۔ اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے
بھی مالک تھے۔ گو ملازمت نے انہیں کبھی اتنا موقع نہ دیا۔ کہ وہ باقاعدہ اس طرف
متوجہ ہوتے۔ اس طرح والدہ صاحبہ بھی اس زمانے کے لحاظ سے ایک اچھی مضمون
نگار اور شاعرہ تھیں۔ وہ تو کبھی کبھی رسالہ "عصمت" اور "سہیلی" وغیرہ میں شائع
بھی کراتی تھیں۔ غرض گھر میں علمی و ادبی اور کچھ سیاسی فضا تھی۔ ایسے ماحول میں پرورش
پاکر میرا متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ میں نے پہلی کہانی گیارہ سال کی عمر میں لکھی۔ گھر میں پڑھائی
تو سب نے میری ہمت افزائی کی پھر تو میں نے کئی کہانیاں لکھیں اور مختلف ناموں سے کبھی
معیاری رسائل میں بھیج دیں جو بہت شوق سے شائع کی گئیں حالانکہ ظاہر ہے۔ کہ

وہ کہانیاں ناپختگی کا معیار پیش کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھیں۔ لیکن خیر میں تو اس نہ ماننے میں انہیں کو دنیا کے افسانوی ادب میں شاہکار سمجھتی تھی۔ اصل نام پوشیدہ رکھنے کی وجہ یہ تھی۔ کہ میری والدہ اور والد یا کوئی اور مجھ پر ناراض نہ ہوں۔ کہ تم نے کس کی اجازت سے اپنا نام چھپوایا۔ حالانکہ والدین کی طرف سے یہ خوف محض میرے ذہن کی پیداوار تھا۔ لیکن بات چھپی نہ رہ سکی یا یوں کہہ لیجئے کہ مارے اترائے کے میں ہی نہ چھپا سکی۔ والدین خوش ہوئے لیکن قدامت پسند اعزا کی طرف سے سخت اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ سب سے بڑا اعتراض تو یہ تھا۔ کہ "آخر اس ٹانگ برابر کی چھوکری کو مرد و عورت کی محبت کے موضوع کے علاوہ لکھنے کا کوئی اور موضوع کیوں نہیں ملا؟ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا دھیان اس طرف گیا ہی کیسے؟"

یہ تھے وہ اعتراضات جنہوں نے مجھے ایک عرصے کے لئے خاموش کر دیا گو اس واقعے کے بعد سے میرے والدین مجھے زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ لیکن داداجان کی گھن گرج کے سامنے میرے والدین کی روشن خیالی بس دھری رہ گئی۔

والد صاحب کی بے وقت وفات نے مجھے ایسا دھکا دیا کہ کئی سال کے لئے بستر پر پڑ گئی۔ قنوطی تو سدا کی تھی اس سانحے نے میری صحت بالکل ہی چھین لی۔ بستر پر پڑ کر، دوائی پیتے پیتے، غم دنیا کا پہاڑ اپنے سینے پر اٹھاتے کئی سال گزار دئے۔ ان دنوں بھی اگر کوئی شے مجھے بہلا سکتی تھی تو وہ تھی کتاب۔ میں ان دنوں بھی سیاسی اور ادبی کتب کا مطالعہ بہت شوق سے کرتی تھی۔

جس شوق سے آج بھی ۱۹۴۴ء میں شادی ہوگئی۔ اس زمانے میں میری چھوٹی بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بغیر اعتراضات کی پروا کئے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ دونوں بہنوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں دوبارہ قلم سنبھالوں اس تھوڑے عرصے میں میں نے جتنی کہانیاں لکھیں سب کی سب اردو کے معیاری رسائل میں بہت شوق سے شائع کی گئیں۔

صحت اب بھی خراب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیز رفتاری سے نہیں لکھ رہی ہوں۔ کاش مجھے ایک بار میری تندرستی واپس مل جائے تاکہ شروع میں اپنی بزدلی کے باعث جو نہ کر سکی وہ اب کر لوں۔

ان دنوں میں اپنی نئی اور پرانی کہانیوں کا مجموعہ ترتیب دے رہی ہوں ٭

عائشہ درانی

چوٹ

"اری کہاں گئی رخسانہ کی سگی؟" میں اس کو تلاش کرتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچ ہی گئی۔

"یا اللہ! اتنی لمبی لمبی سانسیں؟ جانتی ہے کہ جنگ کی وجہ سے نئے اسپرنگ نہیں لگنے ہیں صوفوں میں تیری لمبی لمبی سانسوں سے ڈھیلے پڑ جائیں گے" میں نے اس کو گدگداتے ہوئے کہا۔ لیکن توبہ! اس کا تو جیسے دم نکل گیا تھا۔ ٹس سے مس بھی نہ ہوئی۔ "کبھی بھئی کیا کوئی یاد آ رہا ہے جو اس طرح بیزار پڑی ہو؟" میں نے اسکے کان کے پاس چیخ کر کہا۔

"اوں ہوں" اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا یونہی آنکھیں بند کئے کئے نخریالی دلہنوں کی طرح۔

"بھئی ادھر دیکھو تو" میں نے اسکے پھولے پھولے ہوئے انگلی سے دباتے ہوئے

کہا وہ۔ اس نے پھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ میں جھینپ گئی اسکی بڑی بڑی مدبھری آنکھیں رس ٹپکانے پر تلی ہوئی تھیں۔

"نا بھئی یہ بات بہت بری ہے۔ رس اسی وقت تک رس ہے جب تک آنکھوں میں ہے ٹپک جانے کے بعد تو کھاری پانی"

"ہٹ جاؤ یہاں سے" وہ مجھے آہستہ سے دھکیل کر پہلے تو مسکرائی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اس الف لیلائی منظر سے بوکھلا کر الگ ہو بیٹھی۔ جیسے ساری خطا میری ہی ہو۔ میں تو آئی تھی ذرا ہنسنے ہنسانے، دل بہلانے اور یہاں یہ مصیبت۔

رخسانہ کی زور دار سسکیوں سے صوفہ لرز رہا تھا تو لرزتا۔ آخر مجھے لرزنے کی کیا پڑی تھی۔ مگر اب پڑی تھی، تو اٹھانا اپنا فرض تھا۔ زبردستی منہ لسور لسور کر سوچنا ہی پڑا کہ آخر کون سی مصیبت آن پڑی غریب پر جو اچھی بھلی آنکھوں کو سرخ مخمل بنائے دے رہی ہے۔ شاید باپ کی یاد آ رہی ہوگی۔ ابھی تو صرف ایک مہینہ ہوا انھیں مرے ہوا اتنی جلدی کیونکر صبر آ جائے۔ ۔۔۔ لیکن نہیں بھئی یہ بات تو ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں کہ باپ کو تنہائی میں بیٹھ کر نہیں رویا جا سکتا۔ دوسرے باپ تو مصیبت میں یاد آنے والی چیز ہے اور بی رخسانہ کو کون سا عیش ہے جو نصیب نہیں ابھی دو روز پہلے جو میں اس سے ملی تھی، تو کتنی بشاش نظر آ رہی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ چہرے پر بے پناہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کہیں کسی سے محبت تو نہیں کر بیٹھی ہیں بیگم صاحبہ۔ کیونکہ اس عمر میں یہ تیر کھانے کی سب ہی لڑکیاں شوقین ہوتی ہیں میں نے اٹکل پچو نشانہ تاکا۔

"دیکھو جی! یہ محبت کا روگ تمہیں دو کوڑی کا نہ رکھے گا۔ جو تم سوچ رہی ہو کہ بڑا کلام کیا محبت میں آنسو بہا کر میں نے۔ بس ہوش میں آجاؤ۔ سیدھی طرح ورنہ"——
میں نے بزرگوں کی طرح اس پہ دھونس گانٹھی جیسے واقعی مجھے یقین ہو اسکی محبت کا۔

وہ حیرت سے منہ پھاڑ کر مجھے تکنے لگی۔ آنکھوں کی لالی گہری ہو گئی۔ میں ڈری کہ کہیں میرا ٹاماک ٹوئیاں مارنا اس وقت رخسانہ کے ہاتھوں میری مرمت نہ کرا دے

"محبت کوئی گناہ نہیں"—— وہ سنبھل کر بیٹھی اور پھر بھد سے لیٹ گئی۔ اور میری جان میں جان آئی کہ چلو پٹنے سے بچ گئی۔

"اور ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم کو میری محبت کا حال کیسے معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا! میرا دل چاہا کہ اپنی پیٹھ خود ٹھونک لوں۔ اپنی قیافہ شناسی کے گن گاؤں اور صوفے سے اکڑ کر بیٹھ کر اتنا اچکوں کہ سب اسپرنگ چکنا چور ہو جائیں۔

"مجھے......؟" میں نے رقص پر آمادہ اعضا کو قابو میں کرتے ہوئے ذرا بے نیازی سے کہا۔ "ارے۔ وہ بات یہ ہے کہ میں اس معاملے میں ذرا گھاگ ہوں اور پھر تم جانو کہ محبت کرنے والوں کی صورت ہی عام انسانوں سے کچھ الگ ہو جاتی ہے میرا مطلب ہے—— کچھ عجیب سی جیسے—— "میری سمجھ میں کوئی مثال نہ آسکی۔

اور وہ تڑپ کر بولی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کہہ دو کہ تو جیسی صورت ہو جاتی ہے یا گدھوں جیسی —— پھر تو کیا جانے کسی کا درد۔" اس نے مجھے حقارت سے دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے مجھے پتھر کہہ کر میرے لطیف حسیات پر پتھروں کی بوچھار کر دی۔

لیکن میں تو اس وقت اس کے آنسو خشک کرنے پر تلی تھی۔ اپنی آنکھوں کے منجمد آنسو اُسے کیوں سوجھاتی۔ اچانک میری خوش طبعی بھڑک اُٹھی۔

"اوہو۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ کتنی اچھی تشبیہ آئی تھی ذہن میں محبت کرنے والوں کی صورت کے لئے اور تم لے بیٹھیں۔ الّو۔ گدھا۔ بڑی بدمذاق ہو" مگر اس کی سسکیاں تو دوبارہ شروع ہو گئی تھیں۔

"خدا کے لئے رخسانہ مجھ پر رحم کرو" اب کی میں سچ مچ رونے کے قریب ہو گئی۔

"نسرین!" اس نے دردناک لہجے میں مجھ کو پکارا "محبت کی ناکامی عمر بھر رلائیگی" وہ اب آنسو پونچھ کر انسان بن رہی تھی۔

"ناکامی ؟ میں کہتی ہوں کہ تم نے ایسی ٹپس ٹپسی محبت ہی کیوں کی، جو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

"محبت یہ سوچ کر تو نہیں کی جاتی کہ انجام کیا ہوگا۔ میں کیا جانتی تھی کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد میری محبت کو کورس کی ان موٹی موٹی خشک کتابوں میں بند کر دیں گے جنہیں کھولنے کو کبھی دل ہی نہ چاہے۔ کاش میں نے محبت کی ہی نہ ہوتی۔ لیکن بُرا ہو اندھی محبت کا" اس نے کسمسا کر ایک آہ بھری "جانتی ہو نا عزیز کو؟ وہی عزیز جس نے ایک سال قبل ایک حادثے میں میری ٹوٹی ہوئی سائیکل کو لاد کر اور مجھے سہارا دے کر گھر پہنچایا تھا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ اسکی شادی ہو رہی ہے"

"تو تمہیں اسلئے رونا آ رہا ہے کہ اُس سے تمہاری شادی کیوں نہیں ہوئی۔" بھلا کچھ تُک کا۔ نازک موقعے پر میں نے اپنے بہتے آنسوؤں کو روکنے کے لئے قہقہوں کا تانتا باندھنا شروع کیا

"نسریں!" رخسانہ جوش سے سرخ ہو کر چیخ پڑی جیسے اسکے دردناک عضو پر چوٹ لگ گئی ہو۔ "پاک محبت میں نفسانی خواہشات کا کیا دخل —— اور پھر عورت اسکی محبت بالکل بے لوث ہوتی ہے۔ بالکل پاک۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ عورت صرف ایک ہی بار محبت کرتی ہے۔" وہ مجھے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پھر بیٹھ گئی۔

"افوہ! جذبات کا جوالا مکھی جب پھٹتا ہے تو انسان پر کیسی ہذیانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ پاک محبت صرف ایک بار لیکن پیاری میں تو یہی کہوں گی۔ کہ عورت ایک بار کیا ہزار بار محبت کرتی ہے۔ یہ گھسا پٹا مقولہ تو صرف مردوں نے عورتوں کی محبت کو لگام لگانے کے لئے گھڑ کر مشہور کر دیا ہے۔ کہ عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔۔ اور بیوقوف عورت نے اپنی اس غیر فطری تعریف کو سن کر جھوٹے فخر سے سر اونچا کر دیا۔ اور رہ گئی تمہاری پاک محبت۔ تو میری جان۔ جنس مخالف سے محبت کرنا ہی تمہاری معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔" میں بھپر کر اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی کہ رخسانہ مٹھیاں باندھے کمرے سے نکل گئی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس نے میری کتنی بے عزتی کی۔ میں نے بغیر کچھ اور سوچے ہوئے جھپٹ کر میز پر سے اپنا پرس اٹھایا اور اسکے یہاں سے نکل گئی کیا کرنا تھا۔ مجھے کچھ اور کہہ کر جو کچھ کہہ رہی تھی بس یہی چولھے میں جاتی۔ میں راستے بھر غصے میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔ گھر آ کر خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر پڑ رہی دل چاہ رہا تھا کہ اپنے آپ کو بے شمار گالیاں دوں۔ لیکن معاً میری نظر سامنے دیوار پر لگی ہوئی پرویز کی تصویر پر پڑی اور مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ابھی کچھ ہی دن قبل کی تو بات ہے۔ جب اس تصویر کو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یہاں لگایا تھا۔ دن میں کتنی ہی بار سے

دیکھ دیکھ کر رویا کرتی تھی۔ دُنیا کے کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ بس ایک مستقل درد کی ٹیسیں اٹھتی رہتیں۔ اس تصویر کو گھنٹوں دیکھا کرتی اور یہ خواہش کس قدر زندہ تھی کہ اسے سینے میں رکھ لوں یا پھر میں خود اس فریم میں سما جاؤں۔ میرا اور پرویز کا ساتھ صرف چند ماہ رہا اور پھر جدائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب میں انہیں کبھی نہ بھلا سکوں گی ان کی جدائی میں روؤں گی اور آنکھیں کھو بیٹھوں گی۔ ان کی ایک ایک بات یاد کروں گی اور پھر کبھی پاگل خانے میں جگہ حاصل کر لوں گی۔ رونا، دھونا، بدنامی، دماغ کی خرابی، مرنا، گڑنا، مگر اب —— کیسے ٹھاٹ سے زندگی گذر رہی ہے اور پرویز بھی تو خوش ہیں اپنی جگہ کبھی بھول کر بھی خط نہیں لکھتے جب وہ مجھ سے رخصت ہو رہے تھے۔ تو کیسا مُنہ بسور کر کہا تھا کہ تمہارے بغیر زندگی اندھیر ہے مگر اب نہ جانے کون کون ان کی زندگی میں چوندھیا دینے والا اُجالا کر رہا ہوگا۔ میں خود بھی تو سب کچھ بھول گئی۔ دن میں پچاسوں بار اس کمرے میں آنا ہوتا ہے لیکن پرویز کی تصویر کی طرف نگاہ بھی نہیں اُٹھتی۔ میں اور نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوئے سو گئی۔ اب تو پرویز کا خیال آتے ہی بجائے نیند اُڑنے کے نیند آنے لگتی تھی ——

یوں تو میں اور رخسانہ ہر دوسرے تیسرے دن مل لیا کرتے تھے۔ لیکن اُن کی اکلوتی محبت پر بحث ہونے کے بعد یہ سلسلہ ایک عرصے کے لئے ختم ہو گیا ہاں مجھے اکثر رخسانہ کا حال معلوم کرنے کی خواہش ہوتی کہ آیا آہوں اور آنسوؤں کا وہی عالم ہے یا کسی نے محبت کا کھلونا پکڑا کر بہلا دیا۔ لیکن اس کے علاوہ کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ کہ وہ ان دنوں بالکل گوشہ نشین ہو رہی ہے۔ اگر اس سے

کوئی ملنے چلا گیا تو خیر ورنہ وہ گھر سے نہ نکلنے کی قسم کھا چکی ہے بہت دبلی اور زرد پڑ گئی ہے مجھے بڑا رحم آیا۔ کہ کہیں واقعی یہ ضدی لڑکی اپنی محبت کا ماتم کرتے کرتے اپنا ہی ماتم نہ کروانے لگے۔ دل چاہا کہ جا کر اسے سمجھاؤں لیکن اسکی پہلی بدتمیزی یاد کر کے اپنا دل مار لیا۔

میں فلم دیکھ رہی تھی۔ یہاں بھی وہی محبت کی ہائے ویلا مچی ہوئی تھی۔ ایک بدھو سا ایکٹر ایک سوکھی سی ایکٹرس سے نہایت بھونڈے پن سے منازل عشق طے کر رہا تھا فلمی پاک عشق! ہیرو نے ہیروئن کو حاصل کرنے کے بجائے جانے کیا سوچ کر جنگل کی راہ لی۔ اور جب لڑکی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک مجذوبانہ تقریر اپنے آپ کو سنائی اور پھر اس بن مانس قسم کے ہیرو کی یاد میں زندگی گذار دینے کا فیصلہ پبلک کو سنا دیا ——— اور فلم ختم۔ اب بھلا کسی کو کیا معلوم کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہی یا نہیں آگے تو کچھ دکھایا ہی نہیں۔ میں ہال سے نکلی تو دیکھتی کیا ہوں کہ بی رخسانہ ایک صاحب کے ساتھ دوسرا شو دیکھنے کے لئے اندر داخل ہو رہی تھیں مجھے معاملہ ذرا بیڈھب سا لگا۔ اور مارے شرارت کے میں نے رخسانہ کے شانے سے شانہ لڑا کر کھٹ سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"اوہ!" اس نے چونک کر کہا "کیسی ہو نسرین"۔ اس نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے اس طرح کہا۔ جیسے وہ بڑی شرمندہ ہو۔

"میں تو بالکل اچھی ہوں۔ اپنی کہو۔"

"میں بھی اچھی ہوں"۔ اس نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک تنہا جگہ پر لے گئی۔ اس کا ہاتھ سرد اور

لرزاں تھا۔

"وہ حضور کون ہیں؟"

"نسیم ہیں؟"

"بھئی میں نے نام نہیں پوچھا میرا مقصد ہے کہ وہ تمہارے کون ہیں؟" میں خود بھی اپنے لہجے کے زہریلے طنز کو محسوس کر رہی تھی۔

"میرے ——— میرے، بس ملتی ہوں یونہی ———" وہ گھگیا سی گئی اور مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"اچھا تو یہ کہو کہ عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے والے قول کو پھر سے دہرا رہی ہو۔"

"اوہ! نسرین" اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"فکر نہ کرو" میں نے اس کا شانہ دبا کر کہا

"کل شام تمہارے گھر آؤں گی۔"

"اچھا" میں نے جواب دیا۔ اور وہ اُن صاحب کے ساتھ ہال میں داخل ہو گئی۔

رخسانہ کو شکست خوردہ دیکھ کر میں نہ جانے کیوں مسرت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کل آجائے گی تو اسے اچھی طرح بناؤں گی چلی تھی بیچاری ایک محبت کی یاد میں عمر بسر کرنے ——— میں اپنے کمرے میں پڑی البم دیکھ رہی تھی۔ کہ رخسانہ آ گئی اسکی آنکھیں اُٹھتی ہی نہ تھیں۔

"آنکھیں اُٹھاؤ میری جان!" میں نے فوراً ہی اُسے چھیڑا اور وہ مسکراتی

ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی۔

"عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے نا؟"

" وہ میری بھول تھی نسرین" وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی اور میں ڈری کہ کہیں رونے نہ لگے۔

" بات اصل میں یہ ہے نسرین کہ محبت کی ناکامی کے بعد کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سخت چوٹ لگ گئی ہے کہیں۔ میں کرب سے بلبلا رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اب اس چوٹ کا علاج ناممکن ہے —— لیکن —— لاحول و لا قوۃ۔ کتنے دن پریشان رہی اس بیوقوف بیہودہ سے انسان کے لئے" وہ زور سے ہنس پڑی۔

" خوب! یہ نئی بات معلوم ہوئی کہ عورت محبت کی ناکامی کے بعد اپنے محبوب کو گالیاں بھی دینے لگتی ہے۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ پہلی چوٹ کا کہیں اثر تو نہیں رہ گیا؟"

" نسرین! میری پیاری بفرض کرو کہ تمہارے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ جائے اور ڈاکٹر اسے انتہائی مشاقی سے جوڑ بھی دے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ جب سرد سرد ہوائیں چلیں گی تو تمہاری چوٹ ابھر نہ آئے گی؟ نسرین یہ محبت کی چوٹ اپنی آس ہے وہ کبھی کبھی ابھرتی ہے لیکن عورت اسے چھپانے کے لئے خود ہی علاج بھی کرتی ہے نفرت سے —— یا بقول تمہارے گالیاں دیتی ہے" اسکی آنکھیں پُرآب ہو گئیں اور پھر وہ اچانک آنسو پونچھ کر ہنسنے لگی۔

" اور نسرین میں یہ تو بھول ہی گئی کہ تبسم کے ساتھ آج بھی پکچر جانا ہے" اب اسکے چہرے پر کہیں غم کا دھندلا سا اثر بھی نہ تھا۔

"اچھا رخصت" وہ اپنا خوبصورت پرس جھلاتی چلی گئی۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا
"اللہ! یہ رخسانہ کیا کہہ گئی؟ چوٹ اور سرد مہر ہوائیں"
میں نے پرویز کی تصویر کی طرف دیکھا جس میں وہ مسکرا رہے تھے میں نے
اپنا منہ دوپٹے کے پلو میں چھپا لیا اور اپنے درد کو محسوس کر کے رونے لگی۔

عصمت چغتائی

آپ اُردو کے مشہور ادیب عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی چھوٹی بہن ہیں۔ علیگڑھ سے بی۔اے۔بی۔ٹی پاس کر کے جے پور میں اُستانی رہیں ۱۹۴۲ء میں شاہد لطیف سے شادی ہو گئی۔ ان دنوں اپنے خاوند کے ساتھ پونا میں مقیم ہیں۔ اب تک اِن کے افسانوں کے تین مجموعے "کلیاں" "چوٹیں" اور "ایک بات" نیز دو ناول "ضدی" اور "ٹیڑھی لکیر" چھپ چکے ہیں۔

عصمت چغتائی

ہیرو

سکھا نے چولھے کے آخری کونوں سے راکھ گھسیٹی اور چلپٹی رکابی چوٹی تک بھر لی
حلق میں سی کڑوی کڑوی راکھ پھینکتا وہ نل کی طرف لپکا۔ جہاں برتنوں کا ڈھیر کسی بھوبھر کے
بچے کی طرح پھیلا پڑا تھا۔ دخل در معقولات سے چڑ کر مکھیاں اُلجھے ہوئے دائرے کھینچتی
اوپر اٹھ گئیں۔ رکابی میں سے تھوڑی سی جھوٹن پونچھ کر اُس نے موری پر ڈال دی۔ وہ
یہ غلاظت صرف مکھیوں کے مارے نہ پھیلاتا۔ مگر آج نہ جانے کیوں اُسے ہر چیز پہ
پیار آ رہا تھا۔ آج جمیلہ بی آ رہی تھیں نا۔ ابھی تو چار گھنٹے تھے ریل کے آنے میں آج
وہ اٹھا بھی صبح تڑکے تھا۔ صبح ہی صبح چائے نمٹا کر شام کا مصالحہ بھی رگڑ دیا کہ کہیں
باورچی بہلانے سے روک نہ لے۔

آج لوگوں نے جان بوجھ کر برتن زیادہ جھوٹے کئے تھے چھوٹی بڑی بیس
بائیس رکابیاں، چار ڈونگے، چھ پیالے، دو قابیں، تین ڈشیں اور ان گنت چمچے

چمچیاں، کانٹے، تین پتیلیاں، چار دیگچیاں اور سینیاں ـــــ اچھا بھلا ایک شریف
بیٹی کا جہیز۔ روز کے روز اُسے مانجھا ہوتا ـــ پر آج تو اُسے کھل اٹھلا اتنا کام اور
اوپر کے کام پر بس ایک چھوکرا۔ اُس کا بس چلتا تو پیروں میں پہئیے اور بغلوں میں پر
لگوا لیتا ـــ کہ ایک ہی وقت میں وہ سارے گھر کی پکار کا جواب دے دیتا۔
"ننھے میاں کے جوتے جی ابھی لایا ـــ کٹھا ـــ کٹھے کی پیالی لایا دو منٹ
میں ـــ کیا گلابی بیچک؟ بس منّے میاں کے فٹ بال میں ہوا بھر لوں تو ابھی لایا
ـــ اچھا لہسن ـــ ادرک تو پیس دی اور چنے ـــ اچھا وہ اخبار
سویرے والا ـــ برف ـــ برف کا پانی؟ جی ابھی لایا" ـــ لوگوں کا بس
چلتا تو اسکے چھوٹے چھوٹے پرزے کر کے نگل جاتے۔ مگر سکھا ہی تھا جو سینہ سپر
کئے ہوئے ڈٹا ہوا تھا۔
اب تو وہ اتنا سوکھا مارا بھی نہ تھا۔ نہ جانے لوگ اسے سکھا کیوں کہتے تھے
حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا نام نور الدین تھا، پر لوگوں کے مُنہ دکھتے
تھے اس کا پورا نام لینے سے۔ تھا بھی تو کوئی معنٰی بھر کا نام ہُو نہہ ـــ برتن
مانجھنے میں اسکے خیالات کی ڈور کتنی ڈھیلی ہو جاتی۔ پرالی بان کا جوڑا بنا کر سرمئی
راکھ سے وہ برتنوں کو بڑے اطمینان بھرے انداز سے گھسا کرتا ـــ چپاتیں
ہتھیں ـــ راکھ کی کسکساہٹ بھری جھنجھناہٹ اور بھی اس کے خیالات کے
وابستہ کو چکنا اور رسیلا بنا دیتی۔ اس طرح تو اسے تھکن بھی نہ معلوم ہوتی۔
جانو کوئی مزے دار ساز پر کسی لطیف نغمے کا الاپ کر کے اُٹھا ہو۔ برتنوں کو چولہے کی
منڈیر پر رکھ کر وہ ذرا اپنے تن کی خبر لیتا۔ ایک بار نظر ڈالو تو وہ بالکل چھوڑی ہوئی

مڈی معلوم ہوتا جسم اور کپڑوں پر اتنے رنگوں خوشبوؤں اور مصالحوں کے
داغ لگ جاتے۔ جیسے برسہا برس سے اسے فرش جھاڑنے کو جھاڑو کی طرح
استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ جھٹ پٹ میلی بنیان باندھ کر نل پر نہانا شروع کر
دیتا۔ نہا دھو کر وہ بالکل اجلی قمیض پہن سولہ سنگھار کر کے اردو کی چوتھی کتاب
لے کر بیٹھ جاتا۔ یہ وہ وقت ہوتا جب وہ موریوں اور کیچڑ کی دنیا سے بہت اونچا
ہو کر علماء کی سوسائٹی میں پہنچ جاتا۔ اور عام طور پر اس شاندار وقت کو تباہ کرنے
باورچی کی چھوٹی مگر موٹی لڑکی عدیا اٹھلاتی جھانجن بجاتی آن پہنچتی۔ آتے ہی وہ
کوئی ذک پہنچانے کی تدبیر سوچ نکالتی۔ کچھ نہیں تو نل پر کھڑی ہو کر زور زور سے چھپکے
مارنا شروع کر دیتی۔ "نہیں مانے گی کلوٹی"

"چل گنجے —— کوئی تیرے باپ کا نل ہے" —— عدیا کالی تھی —— پر سکھا
کے سر پر تو ٹکرا بھر بال تھے۔ ایسے گھنے کہ ننھے میاں کو اس کے سر پر چپت مارنے
کے لئے گردن پر سپاٹا بھرنا پڑتا تھا اور گویا سپاٹا زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔ مگر مار
پیٹ کے اصول سے قطعی نیچے گرا ہوا —— او تحقیر کن!

"ہے بھٹی اخوہ تو گنجی ہے —— چٹیا ہے کہ چوہے کی دم —— گنوارن کہیں
کی"

"اور تو بڑا لاٹ صاحب ہے —— ہونہہ" —— عدیا کی اینٹھی ہوئی گدی سے
چوہا سا نکلی اونچی لال سپلی کلاوہ پڑی چوٹی واقعی اس کی دکھتی ہوئی رگ تھی۔ کتنا کتنا
وہ چلاتی پچھاڑیں کھاتی پر ظالم اماں ایسی اینٹھ کر بال گوندھتی کہ بالوں کی جڑیں
تک ہل جائیں۔ اس کا سر دونوں گھٹنوں میں دبوچ کر چوٹی ایسی مضبوطی سے گانٹھتی

گویا کوئی گٹھری کس کر باندھ رہی ہو۔ ہر پل یہ دانت بھینچ کر کہنیاں ہوا میں معلق تان کر پھڈو نک ٹھونک کر جھٹکے مارتی کہ کیا مجال جو ایک رونگٹا بھی باہر باہر چھوٹ جائے۔ آٹھویں دن دو چار مسکین سی لٹیں ذرا سانس لینے کو باہر رینگ آتیں اور ڈائن تیل کی کٹپی اور کنگھی لے کر پل پڑتی۔

عدیا کی اور سکھا کی چار مٹ کو ملنتی اُسے یوں گیا نہوں کی طرح بیٹھا دیکھ کر عدیا کے تن بدن میں چنگاریاں سلگنے لگتیں۔

"آوے نہ جاوے بڑے پڑھ رہے ہیں"——وہ اپنی لال اوڑھنیا فیشن ایبل انداز سے کاندھوں پر پھیلائے بالیاں جھلاتی آن پہنچتی۔

"دیکھو بھئی ہم تجھ سے نہیں بول رہے —— سُنا"——وہ سنجیدگی سے ورق اُلٹ دیتا۔

"اور تم سے کون بول رہا ہے ——واہ جی وا——"

"اچھا——نہیں مانے گی——"

"ہونہہ کوئی تمہاری کبوتر جیسی آنکھوں سے ڈر ہی تو جاؤں گی"

"اچھا ہم اُدھر جاتے ہیں ——ہمت ہو تو آ جائیو ...——وہ لمبے لمبے ڈگ مارتا اصطبل کی طرف چل دیتا اور اصطبل عدیا کی حدود سے باہر تھا۔ باورچی کے احکامات صادر ہو چکے تھے۔ کہ اصطبل کی طرف گئی اور ٹانگوں کے پرخچے اُڑے عدیا سکھا کی بے مہریوں کی وجہ بھی جانتی تھی۔ اماں کمبخت کسی طرح سمجھتی ہی نہیں ویسے دن رات کی بڑبڑ ہے کہ کنواری لونڈیا سینے پہ سل پڑی ہوئی ہے۔ کہو بھلا یہ زمانہ لال اوڑھنیوں کا ہے——یا بہت ہوئی تو محرم پہ ہری ہو گئی جو میلی

کچیلی ہوگئی تو اُودی بادامی کروالی ـــــ بس ـــــ ہاں سکھا ویسے ہوشیار تھا مگر عدیا کونسی بُری تھی۔ ہاں ذرا دماغ کمبخت کمزور پڑا ہوا تھا۔ بڑی بوی جی نے اللہ ماری کی کمر پہ ہزاروں پنکھیاں توڑیں مگر آملہ کے پارے سے آگے نہ پڑھ کے دیا۔

کاش وہ زندگی میں ایک بار صرف ایک بار حمیدہ بی جیسا باریک ململ کا ہوا جیسا گلابی یا آبی رنگ کا دوپٹہ اپنے شانوں پر ڈال سکتی یا وہی کبوتر کے پروں کے رنگ کا بھورا بھورا ہلکا سا دوپٹہ یا کامدانی کا کاسنی شنان کا ہی سہی جس کی چنٹ دن بھر بھی اوڑھو تو بھی نہ کھلے ـــــ پر حمیدہ بی اوڑھتی بھی تو پولے پولے ہیں۔ یہ تھوڑی کہ اماں کا حکم ہر وقت "ارے نصیبوں جلی دوپٹہ آگے کو لے" ـــــ بس ہر وقت خون سُرخ لٹھے کی کوٹھڑی میں گھٹے ہوئے سسکیاں بھرا کرو۔

اور آج حمیدہ بی آرہی تھیں۔ عدیا کو حمیدہ بی رتی برابر پسند نہ تھی۔ آتے ہی وہ اس کی جوڑوں کی خیریت پوچھتیں اور آم کے پارے کا دردناک ذکر چھیڑ دیتیں بڑی بوی جی کو اپنی ہار پر نئے سرے سے تاسف ہونے لگتا اور وہ نیا آم کا پارہ منگا کر اس کی کمر پر پنکھیاں توڑنا شروع کر دیتیں۔ اور اس دفعہ تو انہوں نے بڑے مشہور مقام کے بانس کے چرخی دار پنکھے منگوائے تھے جنہیں وہ پھرکنی کی طرح گھما کر مارتیں تو دوگنی چوٹ لگتی تھی۔ دوسرے حمیدہ بی تھیں تک چڑھی کل اُن کا کمرہ صاف کرنے وہ اور سکھا گئے تو چھپکلیوں سے ڈر کر عدیا تو کونے میں بیٹھ گئی اور سکھا مارا مارا کمرہ جھاڑنے لگا۔ حمیدہ بی کا کام کرتے وقت وہ ایسی تندہی دکھاتا جیسے عقبیٰ کے لئے توشہ سمیٹ رہا ہو۔ وہ جل کر رہ گئی۔ اقتباس کے زرد چھپکل

گلدان میں لگا نے دیکھ کر وہ تجھنیر پہ تُل گئی۔

"املتاس سے تو گلاب لیا جا وے ہے"۔

"تو اور کوئی پھول ہی بھی تو نہیں"۔

"دیکھ لیجو، پھینک دیں گی حمیدہ بی"

"ہونہہ ۔۔۔۔ پھینک دیں گی ۔۔۔ جانتی بھی ہے انہیں زرد رنگ کتنا پسند ہے"۔

"ہوں ۔۔۔ جبھی پیلی بنیان پہنی گئی ہے"۔۔۔۔

سکھا کے کان خون کی شدت سے نیلے پڑ گئے۔ یہ بات تو تھی کہ اس نے بنیائن سینت کر رکھی تھی۔ مگر عدیا کی بچی چڑیل کون ہوتی ہے۔ عدیا بھی سمجھ گئی کہ چوٹ گہری پڑی اور کھسک جانے میں ہی سلامتی ہے۔ ۔۔۔۔ کھلے میدان میں سکھا سے نپٹ لیتی۔ مگر یہاں گھر میں تو سبھی اسکے دشمن تھے۔ وہ تھی بھی بڑی بدنام جب کوئی بلاتا تو سکھا کھانا کھاتا ہو جب بھی قلانچیں مارتا پہنچ جاتا۔ پر عدیا کو ذرا گنگنانے کا شوق تھا۔ اس لئے لوگوں کی پکار ذرا کم سنائی دیتی۔

"میرے آتے ہوں گے چیت چڑ وو دو ۔۔۔ ر ۔۔۔ وہ تیسری آواز پر چیت چڑ کے تخیل سے چونک کر سنتی پھر دل میں شبہ ہوتا کہ جانے بھائی کسی نے پکارا بھی تھا یا یونہی اُس کے کان بجتے تھے۔ جب پکار کی حقیقت واضح ہو جاتی تو وہ پھر مضطرب ہونا شروع کرتی۔ کہ آخر کیا کام آن پڑا جو وہ پکاری گئی۔ سچ تو ہے پتہ تک نہ ہو کہ انسان کو کس کام کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ تو پھر کیا دل لگے جانے میں ۔۔۔ اور بہت ممکن ہے کوئی کام بھی نہ ہو۔ اور صرف کچھ نہیں کہنے کے لئے پکارا جا رہا ہو۔ بارہا ایسا ہوا۔

کہ وہ اچھا بھلا پنج گوٹوں کا بیچ چھوڑ کر آئی اور جواب ملا —— "اچھا کچھ نہیں" —— "رہنے دو" —— وہ چپ ہو کر رہ جاتی۔ ایسے غیر مستقل مزاج آقاؤں کی یہی سزا ہے۔ کہ پکارتے پکارتے کمبختوں کے نرخرے پھٹ جائیں۔ جواب نہ دیا جائے دوسرے پکار کے جواب میں جب وہ پہنچتی تو بدقسمتی سے اتنی دیر ہو چکی ہوتی۔ کہ پکارنے والے کی دماغی حالت کا بھروسہ نہ رہتا۔ مار کا اندیشہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا۔

پر شام کو زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنے جب حمیدہ بی آئیں تو سکھا نے جھپٹ کر انہیں سلام کیا۔

"اوہو بڑے ٹھاٹ ہیں سکھا" —— وہ مسکرائیں اور سکھا کا نیل میں ڈوبا ہوا ملتا بینگن کا چھلکا بن گیا۔ اگر اسکے سامنے آئینہ ہوتا تو دیکھتا کہ پیلے بنیائن میں سے نکلا ہوا اُسکا لمبوترا چہرہ بالکل املتاس کی پھلی معلوم ہو رہا تھا۔ عدیا کوتے میں کھڑی نتھنی کی گونج گھماتی رہی۔

دوڑ دوڑ کر سکھا نے حمیدہ بی کا سارا سامان اُوپر پہنچا دیا۔ چمڑے کا بھاری بکس ہاتھی کے برابر بستر، اٹیچی کیس، تھرماس، وائلن کا بکس، ستو کا کوٹ ایک بھی چیز اُس نے نہ چھونے دی کسی کو۔

"کچھ نہیں ہوتا موتی بھینس سے" اُس نے عدیا کو انیڈا نیڈا کر پھلوں کی ٹوکری سے الجھتے دیکھا تو دانت پیس کر دوڑا۔ عدیا نے اپنی ننھی سی ناک کو ایک طعن آمیز ٹھنکی دی اور ٹوکری کو جان کر دُور دھکیل دیا۔ وہ امرود دوڑتے ہوئے... چبوترے سے نیچے جا پڑے۔ ایک دفعہ ہی سکھا کا جی چاہا۔ عدیا کو ایسا دھکا دے کہ امرودوں سے بھی چار ہاتھ آگے جا پڑے۔ مگر اتنے میں حمیدہ بی آگئیں اور اُس

کا غصہ بجھ گیا۔

جب وہ چائے لے کر اوپر پہنچا تو چائے کے برتن سینی پر پھدکنے لگے۔ اور اُسے جلدی سے میز کا سہارا لینا پڑا ـــــ سامنے آئینہ کے سامنے کھڑی حمیدہ بی اپنے بالوں میں زرد املتاس کے پھول لگا رہی تھیں۔ " یہ تم نے لگائے ہیں سکھا؟"

"جھی!" اُس نے بلڈنگ کی بھیگی ہوئی گدڑیوں کو حلق میں کھینچا۔ لپک کر وہ بستر کھولنے لگا۔ کھولتے کھولتے جیسے اسکے کسی نے سوئی چبھودی اور دونوں ہاتھ سے چھوٹ پڑے قمیص! حمیدہ بی کی نہیں۔ مردانہ قمیص سگرٹ کی بو میں غرق میلی سی۔ اُس نے قمیص اٹھائی اور پھر پھینک دی ـــــ پھر اٹھائی دو انگلیوں سے جیسے کوئی سڑا ہوا چوہا چھو رہا ہو۔

" اوہ یہ قمیص" حمیدہ بی کا سفر سے تھکا ہوا چہرہ سرخ ہو گیا۔ " اصغر بھائی کی ہے بھولے سے آ گئی" ـــــ انہوں نے بڑی بیوی جی کو بتایا۔

سکھا ایک دم مسکرا دیا ـــــ اصغر میاں کی قمیص! ـــــ تو یہ اور کسی کی بھی نہیں۔ اصغر میاں کی۔ وہی جن کی صورت دیکھ کر سارا دن کھانا نہ ملے۔ دس مرتبہ سال میں اپنی حمیدہ بی کے آگے ناک گھسنے آتے اور اپنی حمیدہ بی انہیں کبھی گنتی ہی میں نہ لاتیں۔ سکھا ہی نہیں سارا گھر جانتا تھا کہ حمیدہ بی کو شادی کے نام سے چڑھ ہے بخصوصاً اصغر میاں کے ذکر سے ہی بھاگتی تھیں۔ قمیص کو ٹانگنے سے پہلے اس نے اُسے خوب بیدردی سے جھٹکا۔ گویا اسمیں سے پہننے والے کا جسم بھی جھٹک پھینکنا چاہتا ہے۔ ـــــ وہ بٹن نکل کر دور جا پڑے۔

" انہیں اُسی میں لگا دو" ـــــ لڑھکتے ہوئے بٹن کو حمیدہ بی نے جوتے کی نوک سے ٹھکرا کر کہا۔ سکھا کا دِل ایک بار لپ سے اُچھلا اور پھر متواتر جھکولے لیتا رہا۔ ٹھکرائے ہوئے بٹن پر ترس کھا کر اُس نے اُٹھایا اور واپس کاج میں پرو دِیا۔

شام کو ٹینس کھیلتے وقت وہ برابر اُن کی گیندیں اُٹھا کر دیتا رہا۔ جب حمیدہ بی ٹرن سے گیند کو مارتیں تو کوئی چیز دندناتی ہوئی سکھا کے دل میں آ لگتی۔ وہ گیند کے پیچھے دوڑتا۔ اور چوٹ کھائے ہوئے کبوتر کی طرح تلملاتی گیند کو ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی دونوں مٹھیوں میں دبوچ لیتا۔ گیند دیتے وقت وہ دونوں آنکھوں میں اس مسکراہٹ کو سمیٹ لیتا۔ جو حمیدہ بی کے شیریں لبوں پر تھرتھرا جاتی۔

مدّبا کے چھاجھنوں کی آواز پر اُس نے دھیان نہ دیا۔ وہ چپا ہوا ساگ لئے باورچی کے پاس جا رہی تھی۔ مگر اُس کے چھاجھنوں کی جھنکار موت کا گھنٹہ ثابت ہوئی۔ فوراً باورچی کی پسلی پھڑکی اور اُسے جانا پڑا۔ کاش حمیدہ بی اس کے پھرتیلے ہاتھوں کی خدمت کا کچھ خیال کرتیں مگر نہیں۔

" جاؤ سکھا امی خفا ہوں گی" ـــــ اُنہوں نے آخری گیند تھما سکتے ہی لے لی۔ اور وہ سر جھکائے لوٹ آیا۔ رات کو جھوٹے برتن سمیٹتے وقت اُس نے حمیدہ بی کی رکابی سب سے اوپر رکھ لی۔ زیادہ برتن نہ رہیں۔ اس لئے نوکر چاکر ٹھونا ڈونگوں یا چھوٹی پلیٹوں ہی میں کھا لیتے تھے۔ مگر سکھا کو اس سے نفرت تھی۔ وہ سوکھی روٹی پر کھانا مگر جھوٹی رکابی میں نہیں۔ مگر حمیدہ بی کی رکابی کتنے سلیقے سے جھوٹی کی گئی ہوتی تھی۔ ذرا سا کونا سالن کا ـــــ ایک آلو کا ٹکڑا، دو چار نازک سی

ہڈیاں بھلا کیا چھوٹی ہے رکابی۔ ننھے میاں کی طرح تھوڑی ہے کہ بھربھر چمچہ پہ ڈونگے میں سے لیکر اپنا رتھوپ لیا۔ اور شروع کر دی تبرا کی۔ جیسے نوالے نہیں بن رہے ہیں پہلوانی ہو رہی ہے، توبہ! دیکھنے کی نہ رہتی ان کی رکابی، شوربہ ٹپک رہا ہے چاول گر رہے ہیں۔ ہڈیاں اُم گحال کی طرح چبا چبا کر تھوکی جا رہی ہیں۔ اوپر کی رکابی اُس نے چوکی پہ رکھ دی اور برتن کونڈی میں ڈالنے چلا گیا۔ واپس لوٹا تو رکابی غائب تھی۔

چوکی کے پاس عدیا بیٹھی اُس میں سالن اور روٹی چور چور کر اپنی بلی کو کھلا رہی تھی۔

مارے طیش کے سکھا کی صورت بھیانک ہو گئی۔ ایک بار ہی تو جی چاہا تو بس کاٹنے کی چھری اُٹھا کر سُرخ ٹول کی گھٹری میں آر پار بھونک دے۔

"میں ا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ ہکلایا۔

"ہونھ ۔ ۔ ۔ ۔ جھوٹی رکابی ہے میں نے چوکی پرسے لی ہے۔" عدیا اپنے باپ کو سُنانے کے لئے چیخی۔

"اتنے برتن دھونا پڑیں تو پتہ پڑے ——— ہونھ" ——— باورچی کی گردن تنتے دیکھ کر سکھا خون کے سے گھونٹ پی گیا۔

"لے بھائی اس ڈونگے میں کھالے۔ کباب بھی تو کھایا نہیں۔ آج کچھ جی اچھا نہیں" ——— کُرتہ سرکا کر باورچی پیٹ پہ ڈونی بجانے لگا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" اس نے کڑوے کڑوے آنسو حلق میں چوس لئے اور سر جھکائے برتن سمیٹتا رہا۔ عدیا نے ایک بار تیکھی سی نظر ڈالی اور ڈونگوں کا سالن پیالوں میں انڈیل اپنی کوٹھری کی طرف چل دی۔

" میری بی کہتی تھی آج کا سالن بڑا میٹھا تھا ـــــ حمیدہ بی کی چھوٹی نھی نانی ـ
جاتے جاتے عذرا نے طعنہ مارا ـ سکھا اتنا چھچھورا نہ تھا جو کوئی لوٹ کے بات کہتا
پر جی چاہا موٹاری کا ای کی تھوتھنی اُسی بان کے جوتے سے رگڑ پھینکے ـ جس سے
وہ قورمہ کا پتیلا مانجھ رہا تھا ـ
" دیکھا امّی ؟ منع کیا تھا ـ پھر بھی چلے آ رہے ہیں اصغر بھائی ـ نفرت ہے ایسی باتوں
سے " سکھا نے جھاڑو دیتے وقت بڑی بیوی جی سے کہتے سُنا ـ
" اوئی تو کیوں نہ آئے ...... اللہ رکھے اُس کا گھر ہے ـــــ " بڑی بیوی بولیں
" پر امّی میری پڑھائی کا حرج ہوگا ـــــ یہ بھی کوئی بات ہے اتنی جلدی کیا
ماری تھی آنے کی ـ ابھی اُن کے یہاں سے ہو کر آ رہی ہوں " حمیدہ بی جھلائی ہوئی تھیں چلی گئیں
اپنے کمرے میں ـ بیوی جی مسکرا کر رہ گئیں اور سکھا نے دیکھا کہ حمیدہ بی کی جان کو روگ
سا لگ گیا ـ فکر مند اور گھبرائی ہوئی سی رہ گئیں ـ گاڑی کے وقت مارے پریشانی کے بُرا
حال ہو گیا ـ پڑھتی ہیں تو پڑھا نہیں جاتا ـ رنگ ہے کہ فق ! کتاب کھولتی ہیں بند کر
دیتی ہیں ـ ایک نظر دیوار پر ٹنگی دوسری کلائی پر ـ اگر سکھا کی دعاؤں میں کچھ گرمی ہوتی
تو ریلیں لڑ گئی ہوتیں اور ـــــ مگر ریلیں نہ لڑیں ـ ہاں اصغر میاں کی تقدیر ضرور
لڑ گئی ـ ریت کی بوریوں جیسے چوڑے پیر مارتے وہ اوپر چڑھ آئے ـ یہ اُن
کی عجیب عادت تھی کہ راستہ میں ہر ایک کی مزاج پرسی کرتے چلتے ـ
" کیوں بے بدّو ...... کلف ٹھیک نہ دیا ـ اب کے کالروں میں تو مارتے مارتے
.... اُلّو کر دوں گا " ....
" او ہو سلام علیکم باورچی کیسے ہو .... میں تو کہتا ہوں یہ قورمہ کے مسالے

نہیں۔ قورمے کے ہیں —— کھانا کم کردو۔

"سلام بڑی بی —— اے کیا ہو تم بھی شادی وادی تو کراتی نہیں۔"

" اے میاں جب کہو جب کرا دوں۔"

"چار سال سے خاک چھنوا رہی ہو۔" ——

"اے بس میاں امتحان ہو لیں۔" ——

"لعنت امتحانوں پر —— کہاں ہیں —— کیوں بے سکھا بڑا لمڈھینگ ہوتا جا رہا ہے۔" —— وہ ہمیشہ اس کے چپت مارنے کی کوششیں کرتے مگر سکھا غوطہ مار کر صفا وار خالی دے جاتا۔ اور جب وہ آگے نکل جاتے تو اس کا جی بے اختیار مجرمانہ افعال کی طرف راغب ہوتا۔ چاہے کالا پانی ہو جائے پھانسی لگ جائے بس ایک دفعہ کس کر ان کے موٹے کولھوں پر ایک لٹھ لگا ہی دے۔ واپس جاتے وقت اصغر میاں سب کو انعام دیتے۔ اس لئے سارے نوکر انہیں سلام کرنے برساتی میں جمع ہو جاتے مگر سکھا کو عموماً اس وقت کوئی ضروری کام لاحق ہو جاتا۔ رخصتی سلام صاف بچا جاتا۔ اور اگر وہ اس کے نام کی اٹھنی کسی کو دے جاتے تو وہ اسے زمین پہ ڈال کر اس پر تھوک دیتا۔

"سکھا، اصغر میاں پوچھیں تو کہہ دینا میں سو رہی ہوں۔" حمیدہ بی نے سکھا سے رازدارانہ انداز سے کہا۔ اور جونہی حمیدہ بی کا نام آیا۔ وہ چلا چلا کر کہنے لگا۔

"صاب اسو رہی ہیں حمیدہ بی" —— مگر اصغر میاں مست ہاتھی کی طرح جھومتے کمرے میں گھس گئے اور حکم چلانا شروع کیا۔

"چلو سیدھی طرح ٹینس کھیلو۔"

"اللہ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"تو لاؤ ہم ابھی اچھا کر دیں۔" ــــ مگر حمیدہ بی اُن سے بچ کر دور کونے میں جا کھڑی ہوئیں لاکھ خوشامد کی مگر کمبخت نہ پسیجا۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لایا۔

یہی نہیں۔ وہاں تو حمیدہ بی کے حصے کا چین ہی اُڑ گیا۔ حمیدہ بی چپکی بیٹھی کھانا کھاتیں۔ مگر اصغر میز کے نیچے سے پیر ڈال کر اُن کی پنڈلیوں میں چٹکیاں بھرا کرتے سکھا خاموش خون بھری آنکھوں سے اُن کے اژدھے جیسے پیر کو میز کے نیچے رینگتا دیکھا کرتا۔ کاش اُس کا بس چلتا تو وہ اس منحوس اژدھے کا پھن کچل کر اُسے چولھے میں دبا دیتا اور جب دھیمے دھیمے سلگ کر راکھ ہو جاتی تو اس سے اپنے سارے جھوٹے برتن چمکا ڈالتا۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں وہ صوفہ جھاڑنے گیا۔ تو اُس کا دل لرز اٹھا۔ حمیدہ بی اپنے گھٹنوں میں منہ دئے سسکیاں بھر رہی تھیں اور وہ انسانی گینڈا پاس کھڑا ـــ "تمہیں ہماری قسم" ــــ کہہ رہا تھا۔ سکھا کو بھونچکا دیکھ کر وہ کھسیا سے گئے اور ڈانٹا۔

"ابے چل یہاں سے" ــــ مگر سکھا نہ ہلا۔

"میں کہتا ہوں ـــ ابے سکھا کے بچے ــــ جاتا ہے کہ......"

"خبردار جو سکھ تو گیا......" حمیدہ بی نے پیار سے ڈانٹا ــــ سکھا پتھر کے بُت کی طرح جم کر کھڑا ہو گیا ــــ اصغر ایسے سو سچا پس بھی آ جائیں تو اگر حمیدہ بی حکم نہ دیں تو وہ چٹان بن کر ڈٹ جائے۔ چاہے وہ اسکی لاش کو کچلتے جائیں

مگر۔

"اچھا یہ بات ہے تو ——— خیر" ——— اصغر میاں سکھا کے آہنی ارادہ
سے ہار کر جمیدہ بی پر حملہ آور ہوئے مگر وہ ہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی اپنے کمرے میں
غائب ——— دروازہ بند ———!!

رات کو جب تھکا ہارا سکھا پلنگ پر لیٹا تو بان کا ہر تار بچھو کے ڈنک کی طرح
اُسے ڈسنے لگا جسم نیند کے لئے مچل رہا تھا ——— پر نیند کہاں؟ وہ پریشان تھا۔
اور یہ پریشانی بے بنیاد نہ تھی جمیدہ بی روز بروز وہ ہنسی اور چہچہاتی ہوتی جاتی
تھیں اور آج تو وہ رو رہی تھیں۔ وہ کمبخت کھڑا رلا رہا تھا۔ اس سے بچنے کے لئے
وہ ہر وقت ڈری ہوئی فاختہ کی طرح چھپتی پھرتی تھیں۔ جمیدہ بی! وہی تو جنہوں نے
اُس دن التماس کے پھولوں کا گچھا بالوں میں لگا لیا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوا
تھا۔ جیسے کالی رات میں تاروں کے گچھے جگمگا اُٹھے ہوں۔

اُس نے زور زور سے اپنی کھردری ہتھیلیاں جھلنگے کی پٹی پر گھسیں کاش وہ ان
میں مچی ہوئی کھجلی مٹا سکتا اور پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس نے اصغر میاں
کے جسم پر سے وہ سبز دھاریوں دار قمیض کھینچ کر اتار لی ہے اور اب اُن کی کھال
کو کھرچ رہا ہے کانٹا لے کر اُس نے انہیں مسلّم کی طرح گودنا شروع کیا۔ چوڑے سے
کندھے، موٹے موٹے بازو، رانیں، پنڈلیاں اور پنجی مرغی کے رنگ کے تازہ شیو
کئے ہوئے گال، وہ برابر نمک مرچ اور بھوبھل لگا لگا کر ننھے ننھے خون بھرے گڑھے بنا
رہا تھا پھر نہ جانے کیا کیا ایک بار ہی اُن گستاخ آنکھوں کو کانٹوں میں پرو کر مسلے میں
ڈبو دیا۔ اس ذہنی قتل کی وحشت سے وہ بالکل تھک گیا جسم کو سیدھا ڈال کر

وہ جھولے میں دبک گیا۔ رات بھر وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہا۔ اُس کا ہمزاد اسکیمیں بناتا اور اُن پر عمل کرتا رہا۔ کبھی حمیدہ بی کو اژدھوں سے بچا رہا ہے کبھی دریا کی بڑی بڑی لہریں منہ پھاڑے لپکی چلی آرہی ہیں۔ مگر وہ موٹر جیسی تیزی سے انہیں بچا لے جاتا ہے۔ بڑے بڑے کالے پستول لئے ڈاکو آرہے منہ پر ڈھاٹا باندھے حمیدہ بی کے کمرے میں جھانک رہے ہیں۔ اور سکھا ان سے بھڑا جا رہا ہے۔ اور پھر بچائی ہوئی حمیدہ بی کو وہ صابن کے جھاگوں کی طرح دونوں ہاتھوں کے چلو میں ہلکے ہلکے دھوآں بنتے دیکھتا ——— وہ غائب ہو جاتیں۔

صبح ہی صبح اصغر میاں کے کوچ کا ذکر سُن کر سکھا بے اختیار کرسی کے پیچھے آنکھ پونچھنے کے بہانے منہ چھپا کر مسکرا دیا۔ یقیناً وہ اُسکے ارادوں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ دُم دبا کر۔

"ہٹ تیرے کی!" ——— اُس نے چاہا زور سے چلّا کر کہے۔ مگر وہ چپ ہو گیا۔
حمیدہ بی کچھ بگڑی بدھی سی اپنے کمرے سے نکلیں اور عدیا کو پکارنے لگیں۔

"جی ——— صاب" سکھا حسب عادت بولا۔

"تم نہیں، عدیا" ——— سکھا کا منہ اُتر گیا۔ باوجود کوششوں کے وہ عدیا کی ضرورت کو دنیا سے نہ مٹا سکا۔ اُس کا خون تیل کی طرح کڑ کڑانے لگتا جب وہ اُسے حمیدہ بی کے نجی کپڑے دھوتے وقت انہیں کیچڑ میں سانتا دیکھتا۔ اُس وقت بھی جب جمائیاں لیتی، گنگناتی عدیا چینا بطخ کی طرح ٹانگیں مارتے آئی تو سکھا جل بھن کر رہ گیا۔

جان بوجھ کر اُس نے کپڑے تین دفعہ گرائے اور انہیں بچانے ہاتھ میں اُٹھائے

کے پیروں سے گھسیٹتی غسل خانہ تک لے گئی سکھا کا دل گھٹتا چلا گیا۔

"ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں" ——— وہ غرایا۔

"ارے تم کون جمعدار جی ——— ایسی لے جائیں گے" ———

"مٹی دھو ——— مجھے دو ———"

"نہیں ——— تمہارے دھونے کی نہیں ہیں"

"کیسے منت رہی" - -

"لو۔۔۔لو۔۔۔لو" ——— عذرا کی ناگن کی طرح پھنکار کر سارے کپڑے سکھا کے منہ پر مار دیئے اور چلاتی ہوئی بھاگی حمیدہ بھی کے کمرے کی طرف۔ وہ سہما ہوا کپڑے سمیٹ ہی رہا ہوتا کہ حمیدہ بی لرزتی کانپتی نکلیں ——— اور وہ جلدی سے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا ——— عذرا نے ہنسی کو معنی خیز جھٹکے سے ذرا اچکایا۔ اور کپڑے سمیٹ چل دی۔

اس دن سکھا سارا دن خوفزدہ اور سہما ہوا سا رہا، وہ کبھی حمیدہ بی کو دیکھتا کبھی اصغر میاں کو ——— اور کبھی عذرا کو بیکن مینوں کے پاس سے اس کی نظریں لاجواب لوٹ آتیں جھاڑو دینے کے بہانے سے اس نے اصغر میاں کی جیبیں ٹٹولیں مگر وہاں تو سوائے ناخون کاٹنے کے چاقو کے اور کچھ نہ ملا۔ اصغر کی نیت خراب تھی۔ کیا عجب جو جانے سے پہلے کچھ کر بیٹھے سارا دن وہ کسی نہ کسی بہانے انکے پیچھے لگا رہا۔ دو ایک بار اصغر میاں نے شبہ سے دیکھا۔ مگر اس نے ایسی صورت بنالی جیسے کچھ ہو ہی نہ مصیبت یہ تھی کہ وہ لوگ باتیں بھی تو انگریزی میں کرتے تھے۔ سوائے "یس" اور "نو" کے کوئی بات پلے نہ پڑتی۔ لیکن اگر دونوں کو جمع کیا جاتا تو یقیناً "نو" کی تعداد پچاس گنی زیادہ ہوتی اور حمیدہ بی کی

ہڑ نو" پر اصغر کا رنگ پھیکا اور سکھا کا تیز ہوتا جاتا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سکھا باورچن سے مصالحہ کی قاب لئے باورچی کو دینے جا رہا تھا۔ کہ پتوں میں آہٹ ہوئی اور پھر کسی نے اُس کے پیر زمین میں گاڑ دئے۔

"نو" حمیدہ بی کی گھٹی ہوئی آواز آئی۔ سکھا کے جسم میں چنگاریاں سی لپکنے لگی۔ اصغر کی بھاری سڑک کوٹنے کے انجن جیسی آواز اُن کی آواز کو پیستی ہوئی گھرگھرا چاندکی پھیکی روشنی میں اُس نے حمیدہ بی کا کاغذ جیسا سفید چہرہ ایک رُخ کو مڑا دیکھا۔ اصغر اُن کا ہاتھ پکڑے کھینچ رہا تھا۔ اور وہ بل کھائے جاتی تھیں۔

"آہ!" حمیدہ بی کے منہ سے آخری بار نکلا۔ اور پھر اصغر نے اُن کا منہ بند کر دیا۔

بھیڑوں کا چھتہ کانوں کے راستے سکھا کے دماغ میں گھس گیا۔ دوسرے لمحے میں وہ اُن کے سر پر تھا۔ بھاری مصالحہ کی قاب اُس نے پوری طاقت سے اصغر میاں کے سر پر دے ماری اور چاروں شانے دھکا مار کر سینے پر چڑھ بیٹھا۔ مگر ایک دم ہی اسکے اوپر اونچی ایڑی کے جوتوں اور تیز ناخنوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے برس پڑے۔ رحجواس کتے کی طرح وہ جھاڑی میں جسم کو کھرونچے لگاتا اندھا دھند بھاگا۔

"یہ کیا ہو گیا تھا اسے" اُس نے اصغر کو کہتے سُنا۔

"نہ جانے ——— دماغ خراب ہے بگھیلے کا ——— آپ کے چوٹ تو نہیں لگی؟"

دوسرے دن صبح جب ھدیا چائے لینے باورچی خانہ میں گئی۔ تو نل کے پاس

موٹی سی گردن کا سانڈ جیسا مردوا برتن مانجھ رہا تھا۔ اللہ جانے اُس نے کیا کہا کہ وہ سہمی ہوئی باورچی کے بالکل پاس جا کھڑی ہوئی "کتنا دھواں ہے باپ رے باپ"! اُس نے کیل پہ ٹنگی ہوئی سپی بنیائن دیکھ کر تولئے کے سُرخ دوپٹے میں آنکھیں چھپالیں اور باہر بھاگ گئی۔

قرۃ العین حیدر

"میں ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئی۔ کافی عرصہ
پورٹ بلیئر (جزائر انڈامان نکوبار) اور مشرق قریب میں گذرا۔ ڈیرہ دون
کانونٹ، اور ازابیلا تھوبرن کالج لکھنؤ میں پڑھا۔ اور اب لکھنؤ یونیورسٹی
سے انگریزی میں ایم اے کر رہی ہوں۔ آرٹ اور مطالعے کا بے حد شوق
ہے۔ مغربی موسیقی اور Dramatics سے دلچسپی ہے۔ ہندوستانی
کلاسیکل موسیقی اور مصوری سیکھ چکی ہوں۔ اب تک خاصی فضول اور
بے مقصد زندگی گذاری ہے! اور آئندہ کے متعلق بھی کوئی بہتر پروگرام
ذہن میں نہیں ہے۔"

قرۃ العین حیدر

رقصِ شرر

پارٹ وَن ۔ کشتی پر

صبیہ ما۔ یہ!

ہُم۔ صبیہ ما۔ یہ !! (بالکل ولایتی لہجہ)

اوہ۔ ادھر دیکھو۔ چھتر منزل کے نیچے نیچے درختوں کے سائے میں گومتی کا رنگ کتنا گہرا سبز نظر آ رہا ہے۔

تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی تو ایسا ہی ہے۔ دھندلا سا سبز اور جھلکتا ہوا جیسا۔

ہوں۔ کیسی — میرا مطلب ہے کہ — نفیس بات ہے دراصل مجھے اس سے

بہتر اُردو بولنی نہیں آتی۔

بہت نفیس۔ (افسوس کہ مجھے بھی نہیں آتی)

کیونکہ ہم دونوں ہندوستان کے ہو کر بھی ہندوستان کے نہیں ہیں۔

ہیں ہیں

کس قدر بُری بات ہے یہ۔

بے انتہا۔

غروب آفتاب کی خاموش قرمزی موسیقی کے ساتھ ساتھ کشتی کھینا تمہیں پسند آ رہا ہے؟

خاصا (اے میرے گیتوں کے ماتاج)

اجازت دو کہ عرض کروں کہ کاش شفق کی سُرخی پانیوں پر چھائی رہے شام کی دیر ہوائیں تمہارے خوبصورت بال اسی طرح پریشاں کرتی رہیں۔ اور یہ کشتی ان نامعلوم آبی راستوں پر یوں ہی رواں رہے۔ (ٹیمز کی لہروں پر میں انہی الفاظ کا بہترین انگریزی ترجمہ کر دیا کرتا تھا)

میرا خیال نہیں۔

اور جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء کے جاڑوں میں تھیٹر بال روم کی سٹیج پر سفید پھولوں کا تاج پہنے جنوبی اطالیہ کے ساحلوں کا رقص کرتے دیکھا تھا (جہاں تمہارے کالج کا ڈرامہ ماہی گیر کی لڑکی پرل کھیلا جا رہا تھا) اور پھر پچھلے ہفتے جب تم پھولوں کے ڈبے سنبھالے کینٹین سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

بعید طویل عبارتیں دیانی کیوں لیتے ہو۔ ذرا مختصر الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرو ——

ار —— میں یہ کہہ رہا تھا کہ چھپر منزل کے سائے دریا پر پھیلتے جا رہے ہیں اور میں بے انتہا خوش قسمت ہوں —— ظاہر ہے ——

شپ۔ شپ۔ شپ۔ شپ۔

تمہیں میرا شہر کیسا لگا؟

اچھا ہے بخصوصاً ہوانڈ یا کی بالکونی اور امبیڈر یہ پُر سکون ندی —— اور وہ دوسرے کنارے پر سبز ھی ہوئی لمبی ماڈ کا سلہٹ اور اس کے سائے میں چھپا ہوا اچپوس کا گھر

جناب وہ ہمارے ہاں کا بوٹ کلب ہے۔

تمہارے ہاں کا؟

جی یونیورسٹی کا ہمارا ہی۔

اور وہ بعید شاندار سائیل۔

موتی محل برج۔

اسی پہ سے رواں خوابوں کے گیت گاتا ہوا گذرتا ہے!

معلوم نہیں۔

شپ۔ شپ۔ شپ۔ چاروں طرف یہ سائے طویل ہوتے جا رہے ہیں فطرت کے یہ مبہم بے معنی سے اشارے —— ایک نظم سنو گی —— ہم تین دوست ہیں میں اور میرا سایہ اور زرد چاند —— شنتو فو کی رات میں جب ستاروں کے دیپ بجھ چکے

کوکا مقدس بربط بجاتے ہیں تو میں چیری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر یاما شیشا کے
چاولوں کی سُرخ شراب پیتا ہوں۔ لیکن چاند اور میرا سایہ شراب نہیں پی سکتے۔
پھر میں شاما کو مار کے مندر میں واپس چلا آتا ہوں ہم تین دوست ہیں۔ یہ جاپانی
نظم تھی۔ چینی نظم سُناؤں۔ یا روسی!

اُف۔ خدا کے لئے چُپ رہو۔

شپ۔ چپ۔ شپ۔

کیا سوچ رہی ہو؟

کچھ نہیں۔ ارے یہ کون؟

کہاں — ؟ آنکھوں کے پپوٹے بھاری۔ سانسوں میں نشے کی دھاری ہونٹوں
سے لہو سا جاری کون آیا۔ یہ کون آیا؟

بے حد لغو ہو۔

لیکن اس طرف اتنی دلچسپی سے کیا دیکھ رہی ہو اُس بہوونس کے گھر کے نیچے
سے کوئی رومال ہلا رہا ہے۔ ہوگا کوئی۔ وہ ہسپانوی نغمہ سنو جو سترھویں صدی کی
ارے وکٹر۔ قطعی وکٹر ہے۔ ولیو آؤٹ کر رہا ہے۔ بیچارہ اتنی دیر سے —

کون ہیں یہ بزرگ؟

وکی — وک — ٹر — ہیلو — شی — شی — سو —

اُس لئے تمہاری آواز نہیں سنی۔ ہنہ —

وکی — آئی سے — شو شو شو (وہ بھی سیٹی بجا رہا ہے بہترین سیٹی
بجاتا ہے)

آخر یہ کون صاحب ہیں جن سے آپ اتنی بے تکلف ہیں ——
وکٹر، رونلڈ اجیت کمار سنگھ ——۔ لا مارٹینیر میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔
بہر حال، ایک تھرڈ کلاس اینگلو انڈین لڑکے کا تمہیں اس طرح رومال ہلانا
میری نظروں میں سخت نامناسب اور معیوب بات ہے۔
کیا فرمایا آپ نے —— تھرڈ کلاس —— جناب والا وہ سر مہاراج سنگھ
کا خالص سگا۔

فوہ

شپ۔ شپ۔ چپ۔ شپ۔

فوہ۔ شوہ ——

لالہ!

فرمائیے!

میں تم سے صمیم قلب سے معافی چاہتا ہوں۔
اور میں آپ کو اس صمیم قلب سے معاف کرتی ہوں۔
اچھا تو باتیں کرو۔
گومتی کے پانیوں پر اڑنے والے نیلے پرندے دیکھے ہیں تم نے —— (جنرل قسم
کے TOPICS پر گفتگو کی جائے گی)
ہم —— ندی کی جھیل میں دیکھے تھے۔ اور سارس۔ اس کے علاوہ بطخ بھی نہایت
عمدہ اور مفید پرند ہوتا ہے۔
کس قدر زبردست بور ہیں آپ۔

لالہ۔

ایشا۔
کبھی تم نے یہ بھی غور کیا قطع نظر اور تمام باتوں کے، کہ محبت کتنا شیریں،
خوبصورت، پیارا خیال ہے۔

رابش (للجوں سے محبت پر آپ خوب پہنچ گئے)

لالہ ایسے خوبصورت وقت میں (جبکہ آئینہ آب پر موجۂ شاداب پر، سایہ مہتاب پہ منظر شب تاب پر ـــــ ہے مری کشتی رواں اور میں ہوں نغمہ بار) اگر تم نے اپنی فلسفیانہ سنجیدگی چھوڑ کر تھوڑی دیر رومان کی باتیں نہ کیں تو یقین جانو ان تمام چیزوں کے ساتھ (جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے) سخت زیادتی ہو گی۔ (لہٰذا محبت کے متعلق اپنی رائے مفصل کہو)

روٹ۔

ایں!

ہوّہ!

(جاپانی زبان میں بولتی ہو۔) تو یہ افواہ درست تھی کہ آپ انتہا سے زیادہ میٹر آف فیکٹ ہیں۔

قطعی درست۔ تم سے کس نے کہا تھا۔

عارف کہہ رہا تھا بیچارہ۔ حالانکہ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کی پسند کی منگنی ہے۔

پسند کی منگنی۔ اس سے زیادہ تو کاروباری چیز اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی

جیسے دُنیا کی اور بہت سی باتیں ایک خالص پروگرام کے ماتحت چل رہی ہیں۔ رات کا سونا صبح کی چائے ـ دوپہر کو یونیورسٹی کے لیکچر، شام کو کافی ہاؤس اور اس وقت تمہارے ساتھ یہ کشتی رانی!

ایں؟ لیکن اس رومان آفرین ——

اس سے آگے پہنچ کر سارا رومان کوچ کر جائے گا۔

پر اگر تم میرا یقین کرو ——

تم جیسے گدھوں پر یقین کرنا کس —— گدھے نے بتایا ہے

میرا خیال ہے تمہیں اپنی زبان کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

بہرکیف ـ آپ اطمینان رکھئے۔ میں دہلی کلاتھ ملز کے کپڑے کے کوپنوں اور پولسن مکھن کے ڈبوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکی۔ لیکن آپ اور عارف اور آپ کے سارے شبیلے والے گلنار شفق کی سُرخی اور شبنم کے گیت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اور اگر اس وقت تمہیں بتاؤں کہ میں تم پر بالکل۔ مرتا ہوں تو تم کیا کرو گی؟

میں فوراً یہ کشتی الٹ دوں گی۔ تاکہ ڈوب کر تم زیادہ آسانی سے مر سکو۔

کشتی الٹ دو گی؟ خدا کی قسم —— اوہ! غالب نے یا شاید ذوق نے خوب کہا تھا ؎

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

اس کے علاوہ جذبی کہتا ہے جب کشتی ثابت و سالم تھی ——

ہائے اللہ کس قدر برجستہ اور باموقع شعر پڑھتے ہو واقعی۔

تسلیمات۔ تسلیمات۔ عرض کیا ہے کہ —— گیتوں کا طوفان اٹھا ہے اپنی

بینا بیز کرو —— یعنی غور کرو کہ ان الفاظ میں طوفان —— ریڈیو آرکسٹرا اور شاعر

کے جذبات کی باہم چپقلش کو کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ —— محبت کے فلسفے

پر نوٹ رکھتے ہوئے اس دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ——

خدا کے لئے تم چپ بھی ہوگے یا نہیں محبت۔ محبت۔

واللہ خوب۔ محبت کا افسانہ اور ان لبوں سے —— خوشا آں زبانے زہے

آں بیانے۔

خوشا آں —— راز بھی بھئی بڑے پایہ کا شاعر ہوگا ایک دن۔ علیگڈھ میں

میرا کلاس فیلو تھا۔ اور سنو —— کہتا ہے کہ —— ارے تم تو واقعی اس قدر گلنار ہو

رہی ہو جیسے ——

اتنے بکواسی ہیں آپ خدا کی قسم —— اب میں سچ مچ میں رونا شروع

کر دوں گی۔

اچھا تو آؤ پھر تمہارے مطلب کی کاروباری باتیں کریں۔ بھئی مارکیٹ میں

پچھلے تین گھنٹے میں دکھنی کپاس اور خاندیش کی موم پھلی ساڑھے بینا لیس فی

صدی کے بھاؤ سے گر گئی —— اور گنیش فلور ملز کے پریفرنس شیئرز ——

شپ۔ شپ۔ چپ۔ شپ۔

ہائے اللہ اگر میں تمہیں قتل کر سکتی —— تم اتنے برے کیوں ہو؟

اور تم اتنی پیاری سی گڑیا کیوں ہو؟

کاش تم میں عقل کام کرتی ہو۔
کاش تم اتنی فاضل نہ ہوتیں۔ (ورنہ میں تم سے شادی کر لیتا)

پارٹ ٹو ۔۔۔ کینٹین میں

حبیبو ماریہ!

ہا۔ حبیبو ماریہ!!

سیلما ۔۔۔ چاندنی رات کا گیت، موسم گل کے نغمہ زاروں کی شراب۔
اندر آجاؤ ۔۔۔ میری نیلی آنکھوں والی سینوریتا ۔۔۔ اور آج کی رات
کو محض کرسمس کی رات سمجھو۔

سیلما۔ تمہیں کونسی شراب پسند ہے۔ اسکوچ ۔۔۔ شیری ۔۔۔ ورموتھ
۔۔۔ کوک ٹیل بناؤں؟

دونٹ مائنڈ اسے لیل شدی ۔۔۔

اور آپ ۔ مس ۔۔۔ اں ۔۔۔ مس ۔۔۔ لالہ رُخ ۔۔۔

مس لالہ رُخ۔ وونٹ یو لائک ٹو ۔۔۔

نیو، تھینکس، کرنل ۔۔۔ آئی ڈونٹ ڈرنک ۔۔۔ اوہ ۔
۔۔۔ فخر الدین سیلما ماریہ فرینڈ ہوگ ۔

مس لالہ رُخ ۔۔۔!

ڈیلائیٹڈ ٹو میٹ یو ۔۔۔

یقین جانو ہم بہترین دوست ثابت ہوں گے۔
سیلیا مارینا ــــ کیسا رومانٹیک اور حسین جیسا نام ہے (میری انتہائی ٹوٹی پھوٹی فرنچ کا سارا زور لگا دینے پر بھی تم محض مسکرا رہی ہو۔ یہ بات ٹھیک نہیں)
تمہارے کیونکس کا شیڈ بہت پیارا ہے۔
ناچ کے تہوار کے بعد بھی ہم ملا کریں گے نا۔ تم لکھنؤ ہی میں رہتی ہو۔ لاملازمی مجھے تم بہت اچھی لڑکی معلوم ہو رہی ہو حالانکہ عموماً غیر ملکی مجھے ذرا نہیں بھاتے۔ (کیونکہ ہم لوگ بہت سخت قوم پرست ہیں۔) میرا بھائی بھی تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔
تمہارا بھائی؟
ہاں۔ بہترین لیڈی کلر ہے۔ اس کنٹین کا ٹھیکہ اسی کے پاس ہے۔
میں اس سے مل کر بہت خوش ہونگی۔
ـــ سیلیما ـــ آج کی رات ـــ کتنی بیوقوفی کی باتیں ہیں یہ ساری کی ساری ـــ جبکہ ـــ جبکہ خاموش ہوا پام کے پتوں کو آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے۔ اور باہر سبز آسمان پر روپہلے ستارے جھلملا رہے ہیں اور کل جب میں یہاں سے سینکڑوں میل دور جا چکا ہوں گا۔ یہ پتے اور یہ ہوا ئیں یونہی گاتی رہینگی سیلیما۔
ہوں ـــ
کیا سوچ رہی ہو؟
وہ کون ہے؟

میرا منگیتر — آفیشل، فیانسے —
آفیشل فیانسے۔

بیپ۔

اور وہ — دوسرا۔

وہ کمال ہے — انتہائی بالتونی آدمی۔ اور یہ میں ہوں۔ لالہ رُخ امیر اصل یہ نام نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس نام میں رومان زیادہ نظر آتا ہے اس لئے میں اپنے آپ کو یہی کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں) اور تم — محض ایک سنگرین سی بال روم ڈانسر — اور یہ اپریل کی رات ہے — اور ہم کینٹین کے باہر پائن کے سائے میں سبز بید کی کرسیوں پر بیٹھے انتہائی بے معنی باتیں کر کر کے بےحد خوش ہو رہے ہیں اور پہلی مئی کے جشن بہاراں کی شام کو تم نیلے ڈینیوب کے سبزہ زاروں کا ناچ دکھلاؤ گی جس کیلئے تم کو ساڑھے تین سو روپے جنگی فنڈ میں سے دئے جائیں گے — سیلیا۔

ہاں۔
کیا خیال ہے تمہارا؟
سب خوب۔
تمہیں میرا منگیتر پسند آیا؟
نہیں۔
اور کمال؟
نہیں۔

میرا بھائی؟

وہ بھی نہیں۔

اوہ ۔ پھر تمہارے لئے کیا کیا جائے؟

کچھ نہیں۔ شکریہ۔

تمہیں ہندوستان کے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔

بہت اچھے لگتے ہیں۔

کیونکہ بہت ویل ڈر یسیڈ ہوتے ہیں بڑی عمدہ انگریزی بولتے ہیں۔ بیحد اسٹائیل سے پیار کرتے ہیں انتہائی احمق ہوتے ہیں لیکن انتہائی عقلمند نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمہارے ملک کے لڑکے ایسے نہیں ہوتے۔

نہیں۔

۔ فرالین سیلما۔

ہاں۔

تمہاری ماں کون تھی؟

اس کنٹریکٹ میں میری ماں کا ذکر بھی ضروری ہے۔؟

نہیں یونہی پوچھ رہی ہوں ۔ ازراہ ہمدردی۔

اچھا، شکریہ، بوڈاپسٹ میں لوڑیاں بیچتی تھی —— مر گئی۔

اوہ تچ تچ تچ —— اور باپ؟

اس سے بھی بیحد ہمدردی ہے ۔ وہ برلن کے ایک لوہے کے کارخانہ میں تھا۔

نازیوں نے مار ڈالا؟
نہیں، خود ہی مر گیا۔ خودکشی کر کے۔
اوہ۔ ہاؤ ریئلی سیڈ —— برلن واپس جانا چاہتی ہو؟
نہیں۔
کیوں؟
وہاں کے نائٹ کلب اجڑ چکے ہیں اور یہاں روز ایک نیا نائٹ کلب قائم ہو رہا ہے۔
تو تمہیں ہمارا ملک پسند ہے گویا۔
بہت
سبلیما ——
تم نے پولٹ گوڈرڈ اور آئن شیریڈن کو دیکھا ہے؟
نہیں —— تم نے دیکھا ہے؟
ہاں۔ دلی کے روشن آرا کلب میں۔ دونوں ہالی ووڈ سے ہندوستان اتحادی فوجوں کو محظوظ کرنے کے لئے آئی تھیں۔ (جی چاہتا ہے۔ بیورلی نکولس کو پکڑ کر کھا جاؤں۔)
بیورلی نکولس کون؟
ارے تم بیورلی نکولس کو نہیں جانتیں۔ اُس نے ہمارے متعلق ایک سخت بیہودہ کتاب لکھی ہے۔
اچھا۔ میں کتابیں نہیں پڑھا کرتی۔

ارے۔ پھر کیا کرتی ہو؟

کچھ نہیں۔

اوہ۔

— ہلو۔ چکو۔ ٹچ ٹچ ٹچ۔

سیلما یہ کس کا اتنا سوئٹ سا بچہ ہے۔

میرا۔

تم — ہا — را — ؟

ہاں کوئی اعتراض نہیں؟

یقیناً نہیں۔

(تم ایک زبردست سماجی انقلاب کی قائل ہو)

— بھئی اللہ — واقعی — اُفوہ —

کیا ہو رہا ہے۔

فلسفۂ حیات کی تفسیر

اہم — کب سے؟

ہہ میں ایک جدید ترطرز کی نظم لکھ رہی ہوں — (ایک سفید فام بال روم ڈانسر سے متاثر ہو کے)

فرمائیے۔

یہ — اے سیلما مار بنا — آج کی رات (جسے محض آج کی رات سمجھا)

اے اجنبی عورت۔
ٹھیرو۔ اس رفتار سے بہت دیر لگے گی۔ لکھو:۔
دنیا ایک کینٹین ہے۔
یا میونسپلٹی کا دفتر —
ایک آرمی کنٹرکٹر کے بھاری ٹرک کا گھومتا ہوا پہیہ۔
گوالیار پوڑی کا۔
خوبصورت شکردان جس کا۔
چینی کا روغن بہت جلد اتر
جاتا ہے۔
چنانچہ میں چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
اور آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
یہ ڈرائنگ روم ہے
اور یہ پائپ ہے مرا
اے اجنبی عورت
— ٹھیرو۔ یہ تو تم چرا رہے ہو صفا۔
چپ چاپ سنتی رہو۔ آگے لکھو:۔
ساقی کی اک نگاہ پہ لہرا کے پی گیا۔ رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا
ارے میاں گھبرا کے پی گیا — اجی ٹھکرا کے —
یہ راشد کی مشہور غزل ہے۔

اچھا آپ میری جان پر کرم کیجئے۔
لیکن مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے
ارشاد۔
کیا آپ واقعی عارف ہیں، اس نامعقول سے جس کے آگے سارے کافی ہاؤس ڈبنڈی
پانی بھرتے ہیں واہ، جو بے انتہا اسٹائل سے ہکلا کر پائپ پیتے ہوئے خالص ولایتی
انگریزی بولتا ہے، شادی کر رہی ہیں۔
جی۔ (اور کل تک آپ اس کی ترجمانی اور نمائندگی فرما رہے تھے)
لیکن۔
اچھا۔ کمال صاحب ایک کام کیجئے۔ یہاں سے تشریف لے جائیے فی الحال
———۔ اوہ لالا یہ کتنے خوش رنگ، پیارے سے پھول ہیں۔ کہاں
سے خریدے۔
شکریہ۔ ہم دراصل پھول خریدے نہیں جاتے ہیں۔ میرے منگیتر نے اپنے
باغ سے صبح بھیجے تھے (ہماری دکانوں میں صرف مصنوعی پھول بکتے ہیں!)
اوہ — تمہارا منگیتر —— آفیشل طور پہ آ گئی ہیں۔
ہاں اس سے ملو۔ دفتر سے آ کر صوفے پر سمیٹا گتا یا ہوا سا بیٹھا ہے جوائنٹ
مجسٹریٹ ہے یا اسی قسم کا کوئی بڑا سا کام کرتا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ
پر ایسا رعب ڈالنا چاہتا ہے جیسے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر بڑا عظیم الشان احسان
کئے دے رہا ہے سیلی گوہس۔
ہماری منگنی کی اطلاع گذشتہ مہینے آفیشل طور پر اخباروں میں چھپ

چکی ہے لیکن ہم نے اب تک بہت کم باتیں کی ہیں۔ (موسم اور سینما کے متعلق) ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بہترین قسم کے منگیتر ثابت ہوئے ہیں۔ کرکیٹ اور مثالی۔ وہ ستر میل کی رفتار سے کبھی ڈرائیو نہیں کرتا۔ پن اپ گرلز کی تصویروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ پکچرز کو موویز یا فلکس کہتے اسے نہیں سُنا گیا۔ چار آنہ پوائنٹ سے بھی برج نہیں کھیلتا۔ صبح بہت جلد اُٹھ جاتا ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے ہرگز نہیں بناتا (اور کمال صاحب جو کچھ اس کے متعلق بیان کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔) بین اور نو کو بیپ اور نوپ نہیں کہتا۔ ہم دونوں کا جب کسی دوسری جگہ پر ملنا ہو جاتا ہے۔ تو دونوں فوراً از راہ اخلاق تھوڑا سا شرما کر دوسروں سے مختلف بیحد ضروری باتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ (اسی لئے میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں۔)

مجھے انتہائی مسرت ہوئی تمہارے منگیتر سے مل کر۔

اور یہ کمال صاحب ہیں۔ آپ چار پانچ لڑکیوں سے بیک وقت عشق فرماتے ہیں اور ہر تیسرے منٹ پر شعر پڑھتے ہیں۔

شعر!

ہاں۔ ہمارے ہاں کے ڈان جان شاعروں اور کتابوں کے حوالے پہلے دیتے ہیں۔ اور اپنا مطلب بعد میں بیان کرتے ہیں۔

اس کم عمری میں خاصا وسیع تجربہ رکھتی ہو۔ یہ بھی تمہارے ملک کی خاصیت ہے۔

در اصل ہمارے خطۂ زمین کی گرم مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے۔

نفطی۔

تم لپ اسٹک کیوں استعمال کرتی ہو۔

تم بھی تو ــــــ

لیکن میں محض ایک بال روم ڈانسر ہوں۔ ہمارے ہاں کوئی اعلےٰ خاندان لڑکی میک اپ کا استعمال نہیں کر سکتی۔

تم نے زندگی کو جمالیاتی احساسات سے علیحدہ کر دیا ہے اور ہم جذبات و احساسات پر مرتے ہیں۔ آرٹ اور خوبصورتی کے پرستار ہیں (تم نے لکھنؤ آرٹ اسکول کی نمائش دیکھی ہو گی)

یقیناً۔ یہی وجہ ہے۔ غالباً کہ تمہارے کافی ہاؤس آرٹ اور خوبصورتی کے پرستاروں سے پُر ہوتے ہیں۔

اوہ سیلیما۔ نہ جانے تمہارے کیسے خیالات ہیں۔ تمہارے علاوہ کوئی اور غیر ملکی خصوصاً امریکن جب ہم سے ملتے ہیں ہماری ایک ایک چیز کی تعریف کرتے ہیں۔ ہماری رنگ برنگی ساریاں، ہمارے سیاہ لمبے لمبے بالوں میں سجے ہوئے کنول اور یاسمین کے پھول، ہمارے مانی پوری رقص۔ وہ کہتے ہیں کہ چغتائی کے نقوش اور اجنتا کے ابھاروں میں جان پڑ گئی ہے۔ (اس اتوار کو ایسٹ اینڈ ویسٹ فریٹرنٹی کی میٹنگ میں چلنا۔ تمہارے خیالات ٹھیک ہو جائیں گے۔)

اور یہ میرا بھائی ہے۔ فوج میں تھا لیکن جب ہمارے یہاں ٹینکوں کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ تو وہ کسی ترکیب سے ملازمت چھوڑ کر گھر آ گیا۔ بڑی بڑی تجارتی اور قومی فائدہ کی اسکیمیں ہیں۔ اس کے دماغ میں۔ علی گڑھ میں میڈیکل کالج قائم ہو جانے

بر وہاں ایک کافی ہاؤس کھولے گا۔ (تا کہ ملت کے فرزندوں کو اسٹیشن جانے سے نجات ملے ۔) اور پھر اعلیٰ کاروباری تجربہ حاصل کرنے امریکہ جائے گا۔

پارٹ تھری ——— فائنل

——— اپنے نیلے پردوں والے دریچے میں سے صرف ایک بار اور جھانک لو۔ آخری بار ——— پھر جب تمہیں نیند آ جائے گی اس وقت ساحل بہت پیچھے رہ چکا ہوگا۔ اس گیت کی لہریں تمہیں فراموش کر دیں گی۔ جن کے سہارے سہارے بہار کا چاند آسمان کا چکر لگاتا رہا آہستہ آہستہ قدم رکھو۔ سمندر کی سبز دھیں ریت پر اپنے نشان چھوڑتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ بہت دور تمہاری خوابوں کی کشتی سمندر کی ایک اجنبی کرخت چٹان سے ٹکرا کر ڈوب چکی ہے اس کے ٹوٹنے کی آواز، لہروں کا غمگین نغمہ اب بھی تمہیں سنائی دے رہا ہے۔ دھوئیں سے ان نیلے بادلوں کے پرے سے کوئی تمہیں پکار رہا ہے۔ آخری بار انہیں جواب دے دو۔ پھر وہ آوازیں واپس چلی جائیں گی۔ اپنا دریچہ بند کرنے سے پہلے سوچ لو، وہ گیت جو تم انہیں نہ دے سکیں۔ وہ بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ان کا پیچھا کرنے کی تم میں ہمت نہیں۔ اس شکست کا خیال کرو جو ایک شاہین کو ایک اونچی چٹان پر سے گرتے ہوئے محسوس ہو سکتی ہے۔ وہ راہیں کہاں کھو گئیں جن کے سبز کناروں پر مسرتوں کے جوان اور خوبصورت چہرے والے اپنی رنگین بانسریاں بجایا کرتے تھے۔ اور جہاں پہاڑیوں کے پرے سے روپہلی تلواروں کی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں۔ اپنی آنکھیں، اپنے لب بند کر لو۔ اپنی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے

ہوئے ہم نے خیالوں کے اونچے ایوان سجائے تھے، ہم ان چٹانوں پر کھڑے تھے
لیکن ہمارے پرچم مخالف طوفانی ہواؤں کا مقابلہ نہ کر سکے اور آج جبکہ تم زرد بالوں
اور نیلی آنکھوں والے سیگفریڈ سے بہت دور ہو جو تمہارے دریچے کے نیچے آتا ہے
وہ سیگفریڈ ہوتا ہے۔ سیلیا، سیلیا ——

—— فوہ —— ہاں —— وہ سستی سی دوغلی چھوکری جو ہماری کینٹین کے ہندستانی
کنٹریکٹر کو پرلنس کے اسٹال پر چوکریار زبیجتی ہوئی مل گئی تھی۔

ہنری! مجھے پچاس روپے چاہئیں۔

اسم۔ نہیں دے سکتا۔

ایک ہفتے سے مانگ رہی ہوں۔

میرے پاس نہیں ہیں۔ اپنے کالے ہندوستانی دوستوں سے لو۔

تم —— بیحد شور ہو ——

اور تم شیطان کی اپنی سگی بیٹی —— فانی فانی —— فو —— (جنگ ختم ہو
گئی۔ ہم فاتح ہیں)

—— فانی نو —— جنگ ختم ہو گئی —— خدایا تیرا شکر۔ آج شام کو ہم چراغاں
دیکھنے گنج حضرت گنج چلیں گے اور پھر امبیڈر (کیونکہ دونوں کافی ہاؤسوں میں
ساری یونیورسٹی اس قدر بھری ہوتی ہے کہ بڑا ذرا عجیب سا لگتا ہے وہاں جانا)
افوہ۔ کتنے خوش ہیں ہم آج۔ اور سیلیا تم چرچ کے لئے اب تک تیار نہیں ہوئیں چھاؤنی
کی طویل اور چمکیلی سڑکوں پر پولیس کی گارد خاموشی سے ٹہل رہی ہے کیونکہ گورنر
شکرانے کی سروس کے لئے سینٹ پال جانے والا ہے۔ اور مہاراجہ جہانگیر آباد

کی لمبی سیاہ کاریں انتظام کے سلسلہ میں ان سڑکوں پر سے بار بار تیزی سے گزر رہی ہیں۔ اور ان کی کوٹھی کے پھاٹک میں سے نکل کر کلکتہ لائٹ ہارس کے سیاہ پوش لڑکے قطار در قطار سیٹیاں بجاتے چرچ جارہے ہیں۔ لفٹ۔ رائٹ۔ لفٹ۔ رائٹ اوہ خدا۔ ہماری آزمائش کا یہ آزمانہ نصرت کے ترانے گاتا ہوا آج آخر ختم ہو گیا۔ ظلم اور تشدد کی اندھیری طاقتوں کے طوفان کے مقابلہ میں ہم اور ہمارے ساتھیوں نے کتنی عظیم الشان قربانیاں پیش کیں۔ مصائب کا کیسی بہادری اور مسکراہٹ کے ساتھ سامنا کیا اور کیا مضائقہ تھا جو ہندستان کے ایک پست سے خطہ کے چند لاکھ نفوس (جو صدیوں سے ہل کھا کھا کر زمین پر رینگتے آئے تھے۔ اور جنہیں ٹن فروٹ کھانے کی تمیز نہیں تھی) سڑکوں پر لیٹ لیٹ کر مر گئے۔ یا جنہوں نے وطن کا ناقہ ملنگ کے دروازوں پر بلوے کر کے غیر ملکیوں کو کتابیں لکھنے اور رپورٹوں کے گوناگوں تفکرات میں اضافہ کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ یہ ہماری طرف سے آزادی اور جمہوریت کی قربان گاہ پر ایک معمولی سی پیشکش تھی۔ جیسا کا بر ثلاثہ نے از راہ لطف و کرم قبول فرمایا۔ ہم اپنی کوششوں میں اپنے ساتھی ملکوں سے پیچھے نہیں رہے (دیکھو ریڈیو اسٹیشن، کونسل چیمبر گنج کی اونچی اونچی عمارتوں اور ہماری موٹروں پر ہمارے ساتھی قوموں کے پرچم کس خوبصورتی سے لہرا رہے ہیں۔ یہ یونین جیک اپنی کار کے ریڈی ایٹر پر لگانے کے لئے تم بھی خرید لو۔ صرف ساڑھے چار آنہ کا) منہ —— تم —— تم جو ہیں چین اور روس کی عورتوں کے کارنامے سناتے ہو۔ چین اور روس —— چین اور روس کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہفتوں۔ دن دن اور رات رات بھر ریڈ کراس پارٹیوں کے ساتھ بعض مرتبہ صرف ٹی کے

پھلوں اور کریم کو بکھیر نہ پر گذارا کر کے ہم نے محاذ پر بھیجنے کے لئے اونی چیزیں اٹھائیاں اور تحفوں کی پارسلیں تیار کیں۔ اے۔ آر۔ پی کی ریہرسلوں کے بعد گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں کا انتظام کیا۔ ہفتہ میں صرف ایک بار سینما دیکھا اور باقی کے روپے سے رسالے اور کتابیں خرید کر ہسپتالوں میں بھیجیں۔ اس کے علاوہ بنگال ریلیف کے لئے ٹیگور اور شا کے ڈرامے اسٹیج کئے۔ خود اپنے ہوسٹل میں شاندار مشاعرے منعقد کروائے ہم نے دنیا کو جمہوریت کے لئے محفوظ بنایا ہے۔ ہم ایک نئے دور کے پیغامبر ہیں۔ یہ امن اور صلح کی خوشگوار دنیا ہے۔ ایٹم بم کی نئی دنیا جس میں پاکستان کے خواب دیکھنا انتہائی حماقت ہے! زندہ باد اخوتِ انسانی۔ پائندہ باد عالمگیر جمہوریت۔

. . . .

فائی فو ——جنگ ختم ہو گئی۔ اُف کمال —— مجھے سنبھالو۔ میں بیہوش ہوئی جا رہی ہوں ——— Horror — Horror جنگ ختم ہو گئی۔ اس نے کہا۔ اور تم فاتح ہو۔ یہ تمہارے جشنِ فتح کی رات ہے اور تم انگریز ہو اور میں جرمن تم میرے پاس رقص کے لئے آؤ گے۔ میں تمہیں پیار کروں گی۔ تم مجھے چونگ گم دو گے اور پھر میں تمہیں —— جانتے ہو —— میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔ بڑی آسان بات ہے میں تمہیں اس ریوالور کے ذریعے (جو اصل جرمن ساخت کا ہے اور جسے سیگفریڈ نے ہٹلر یوتھ میں شامل ہو کر اپنے قصبہ سے رخصت ہونے والی صبح شراب خانہ کے مالک سے خریدا تھا۔) شوٹ کر دوں گی۔ پھر تم مر جاؤ گے۔ ایک کے بعد ایک۔ اسکوئیج کی بوتلیں لنڈھاتے ہوئے —— کینٹین میں کھلبلی مچ جائے گی۔ ملٹری پولیس کی لاریاں اور ایمبولینس کاریں، چاروں طرف دوڑنے لگیں گی۔ تمہارا آفیسر کمانڈنگ

اس ہندوستانی آئی سی ایس کو جو اس کیمپ کا انچارج ہے اور وہ ہندوستانی آئی سی ایس اپنی منگیتر اس ہندوستانی کنٹر یکٹر کی بہن کو جو میری دوست ہے۔ یہ دہشت ناک خبر پھولے ہوئے سانس سے سنائے گا اور پھر وہ بیہوش ہو جائے گی۔ سب بیہوش ہو جائیں گے۔ او خدا ___ کس قدر لذیذ، مسرت بخش خیال ہے۔ پھر اس نے سچ مچ تین گوروں کو ریوالور کا نشانہ بنا دیا۔ اُف کمال۔ کمال ___

ایں ___ جان سے مار ڈالا۔ اور تم واقعی بیہوش ہوئی جا رہی ہو۔ کس قدر دلکش انداز ہے۔ کاش میں شاعر ہوتا ___ علاوہ ازیں تم اس وقت قطعی ان بے انتہا ترقی پسند خاتون افسانہ نگار کی طرح ایکٹ کر رہی ہو جنہیں پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن پر سیاہ رومینٹک برقعے میں ملفوف، ایک ڈرامہ میں حصہ لیتے ہوئے مائیکروفون پر براڈ کاسٹ کے دوران میں ایک مرد آرٹسٹ کی زبانی خود کو لفظ "پیاری" سے مخاطب ہوتے سن کر فی الفور غش آ گیا تھا، یقین کرو تمہارے دوست کی اس سنسنی خیز حرکت سے میرے قلب کو انتہائی صدمہ پہنچا۔ (لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔)

(کتنا لمبا جملہ تھا۔ اس کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ ورنہ اب تک اطمینان سے بیہوش ہو چکی ہوتی) shocking ___ اور پھر جب عارف معائنہ کے لئے (جائے) وقعہ واردات پر پہنچا تو شیطان کا چھوٹا بھائی وہ کمبخت بچہ اسے دیکھتے ہی پپا پپا کہتے ہوئے چلا چلا کر دیر تک روتا رہا ___ اُف ___ (فائی فو) ___

ایں ___ (فائی فو) لالہ ___ تمہاری دھندلی سی سبز، چھلکتی ہوئی آنکھیں سنو گرانے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔

وہ — بچہ — اور — عارف —

یہ بھی زندگی کے کاروبار کی ایک شاخ تھی (یعنی برانچ آفس) رومان اور
سچائی — اور — اور یہ تمام خرافات زندگی کے خالص تجارتی پروگرام میں
قطعی نہیں سما سکتیں (لہٰذا الالہ رُخ پیاری، اس snocking واقعہ کو
بھول کر گومتی کے پُرسکون پانیوں پر چلو جہاں میں تمہیں وہ جاپانی نظم سناؤں گا
جو شنتو فو کی رات میں یا ماشیٹا کے سایہ تلے فوجی کو مارو کے ساز پر گائی جاتی ہے
ہم تین دوست ہیں، میں اور میرا سایہ اور زرد چاند۔ (فائی فو — شپ
شپ — چپ — شپ)

کوشلیا اشک

کوشلیا اشنک

۱۹۱۶ء میں گجرات (پنجاب) میں جنم لے کر اور بچپن کے دن انتہائی لاڈ۔ پیار۔
محبت اور فراوانی میں گزار کر لڑکپن کے خاتمے پر میں نے اپنے آپ کو بھرے جولہرات
میں گھرے ہوئے اس بے بس انسان سا پایا جسے ان میں سے کسی کو چھو نہ سکنے کی بد
دعا دے دی گئی ہو۔ میں تقریباً بارہ سال کی تھی جب صرف ۲۸ دن کے وقفے سے میرے
باپ اور پھر ماں دونوں اس لاڈ پیار کی محض ایک دھندلی لیکن انمٹ یاد مجھے سونپ
کر اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ میرا ماحول وہی رہا۔ سب ہی محبت بھی تھی۔ لاڈ پیار
بھی اور فراوانی بھی۔ لیکن وہ سب میرے لئے نہ تھا۔

اس کے بعد کہانی بہت طویل ہے۔ زندگی کا ایک ایک دن ایک کہانی ہے۔
مختصر یہ کہ جب رشتہ دار مجھے کسی "ضرورت مند" لیکن خوشحال کے ہاتھوں سونپ
کر اس بار عظیم سے سبکدوش ہونے کی فکر میں تھے۔ میں نے اپنی نیا کو آپ ہی
کھینے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک ہمدرد اور رحم دل خدا بھی مل گیا۔ سب سے چھوٹے ماما
نے میری ہمت کو سراہا۔ میرے فیصلے کی داد دی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ماں باپ کی
کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔

ہیں صرف چار جماعتیں پاس تھی اور پڑھائی کو چھوڑے ہوئے چار سال گذر چکے تھے۔ کہ میں نے پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ ہندی رتن اور بھوشن کے بعد مڈل کا امتحان دیا پھر دو سال بعد پرائیویٹ طور پر میٹرک کیا اور خوش قسمتی سے وظیفہ پا گئی۔ اس کے بعد میری زندگی کی کشتی کو ایک دوسرے ناخدا نے سنبھالا۔ اس سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ لیکن اسکی محبت اور رہنمائی میں نزدیکی رشتہ داروں سے زیادہ فکر اور پیار تھا زندگی کے سمندر کی بے پناہ موجوں کے تھپیڑے کھانے کے باوجود میں اس کی رہنمائی میں بڑھتی چلی گئی۔ میرا یہ ناخدا میرے کالج کی پرنسپل تھیں۔ میں بی۔ اے تک اپنے کالج میں فرسٹ رہی اور انہوں نے ہر طرح سے میری مدد کی۔

۱۹۴۷ء میں میں نے مکلیگن کالج لاہور سے بی۔ ٹی کی ڈگری لی اور پنجاب کے دورافتادہ قصبہ رینالہ خورد میں ہیڈ مسٹرس ہو گئی۔ رینالہ خورد اس لئے مشہور ہے کہ یہاں پنجاب کے مشہور دانی انجنیئر سر گنگارام کے فارم ہیں۔ اور سنگتروں کا سات میل لمبا باغ۔ لیکن مجھے وہاں کی جو چیز پسند آئی وہ سکون تھا۔ سکون ۔۔۔ میں جیسے سمندر کے ساحل پر آ گئی اور ٹھنڈی ریت پر پاؤں پسارے، ہلکی میٹھی دھوپ کا لطف لینے لگی۔ لیکن سمندر کو شاید یہ ناپسند ہوا۔ ایک تیز ہوا آئی اور میری کشتی کو بے پناہ موجوں میں لے گئی۔

میری زندگی کی کشتی کو ایک اور ناخدا نے سنبھالا اور ایک بار تو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ اپنے ساتھ اس کشتی کو ہمیشہ کے لئے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں ڈبو دے گا لیکن میری وہی ضد آڑے آئی۔ اپنے ناخدا سمیت میں کشتی کو موجوں سے نکال لائی اب بھی موجوں کے تھپیڑے اگرچہ کم نہیں۔ لیکن ان کا زور کم ہو گیا ہے اور کبھی کبھی

ان میں سے کنارا جھلک اٹھتا ہے............. سکون۔ ٹھنڈی ریت اور ہلکی میٹھی دھوپ۔

لکھنے کا شوق مجھے جب سے ہے جب میں نے صرف اپنے آپ کو اپنا رفیق پایا۔ کالج میں مجھے سال بھر میں سب سے اچھے مضمون اور کہانیاں لکھنے پر انعام ملا تھا۔ میری پہلی کہانی بھی میگزین کالج میں شائع ہوئی۔ پھر کچھ افسانے "ریت لائی" میں شائع ہوئے ہندی میں ڈیش دوت۔ دنیا اور ہنس میں کہانیاں چھپیں۔ اُردو میں صرف "آجکل" میں لکھ پائی ہوں۔ میں جانتی ہوں میرا لکھنا ابھی بچے کے تتلانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن مجھے یقین ہے کہ تتلاہٹ پر عبور پا کر میں اچھی طرح اپنے جذبات کو بیان کرنا سیکھ جاؤں گی۔ اور وہ سب کچھ لکھ سکوں گی۔ جسے لکھنے کی خواہش عرصے سے میرے دل میں بیتاب ہے۔

کوشلیا اشک

تھکان

"آخر بات کیا ہے۔ آپ بولتے کیوں نہیں؟" ہری کی بیوی نے اسے تیسری بار بلانے کی ناکام سعی کرتے ہوئے اسے ذرا اپنی طرف کھینچ کر پوچھا۔

ہری نے جواب نہیں دیا۔ سامنے دیوار کے ساتھ پڑا ایک معمر پیڑ کھڑا تھا بستر پر لیٹا لیٹا وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے صرف اتنا کہا۔

"تم ذرا چائے بنا لاؤ لیلا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"میں ابھی بنا لاتی ہوں چائے۔" میٹھی، قریب قریب گیلی آواز میں اس کی بیوی نے کہا۔ لیکن اُٹھنے سے پہلے وہ کچھ لمحوں تک ایک ٹک اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی —— وہ کیوں اتنا کمزور ہو گیا ہے۔ اس کا چہرہ کیوں اتنا زرد پڑ گیا ہے۔ وہ کیوں اس طرح چپ چاپ پڑا سوچتا رہتا ہے؟ بڑی بے حس شاموں میں اس کے کون سے ارمان اٹک گئے ہیں اور ان حالات کا کچھ بھی جواب نہ

پلٹنے پر اُس کے دل کی گہرائی سے ایک لمبا سانس نکل گیا ـــــ وہ کیوں اس کی زندگی میں آ گئی؟ اس کا دل ایک عجیب درد اور ہمدردی سے بھر گیا۔ اپنے شوہر کے بکھرے لمبے بالوں کو سلجھاتے ہوئے اس نے اچانک اسے چوم لیا۔

ان ہونٹوں کے لمس سے ایک ٹھنڈی سی سرسراہٹ ہری کی نس نس میں دوڑ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی لجلجی سی چھپکلی نے اُسے چھو لیا ہو۔ اس کی بیوی نے اُس کا تکیہ ٹھیک کیا اور چائے بنانے چلی گئی۔

وہ بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کئی ایسے لمحے گھوم گئے جب اس کے ہونٹوں کو دوسرے ہونٹوں کا لمس حاصل ہوا تھا۔ اور ٹھنڈی سی سرسراہٹ کی بجائے اسکی رگ رگ میں ایک آگ سی دوڑ گئی تھی۔

اُس نے دیکھا ـــــ ایک چھوٹا سا کمرہ (جو بہن نے اپنے بھائی کے مطالعہ کی خاطر اسکے لئے وقف کر دیا تھا) کونے کی میز پر قرینے سے چنی ہوئی کتابیں سرخ نیلی پنسل، قریب ہی رکھے ہوئے گلدان کے کچھ پھول (جو پوجا کے بعد بہن بھائی کی میز پر رکھ جاتی تھی۔) اور پلنگ!

اس پلنگ پر تکئے کے سہارے وہ آدھا بیٹھا آدھا لیٹا ایک کتاب میں مستغرق تھا۔ گرم گدگدے بستر پر لیٹے لیٹے اسے بڑی تسکین سی مل رہی تھی۔ اس وقت اُسے کچھ کھٹکا سا سنائی دیا۔

سامنے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ اُس نے دیکھا کہ طاق کی ایک اینٹ ہل رہی ہے۔ دوسرے لمحے کسی نے وہ اینٹ اٹھالی اور سا اس

ذرا سے جھروکے میں دو چنچل آنکھوں نے جھانکا۔ جونہی اس نے نگاہ اٹھائی وہ آنکھیں ایک طرف ہو گئیں اور وہ اینٹ وہیں کی وہیں آ گئی۔

یہ ایک جھلک کئی دنوں تک اس کے دماغ میں گھومتی رہی اور تصور ہی تصور میں وہ کئی بار ان جھانکتی ہوئی چنچل آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

پھر اس کے سامنے وہ دن آیا جب اُس نے اپنی بہن کے پاس پڑوس کی ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ دو شوخ آنکھیں اس کی طرف اُٹھیں۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو وہی آنکھیں تھیں ــــ وہی بجلی کی طرح کوند کر چھپ جانے والی آنکھیں جوانی کے ان پاگل لمحوں میں اُس نے چاہا تھا۔ کہ اس لڑکی کو اپنی آغوش میں لے کر اسکی ٹھوڑی اوپر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکے۔ ــــ اس طرح کہ اس کی نگاہ کے بوجھ سے اس کی پلکیں بند ہو جائیں۔ اور وہ ان بند پلکوں کو چوم لے ــــ اس طرح چوم لے کہ وہ خود مسحور سی کبوتری کی طرح اسکی گود میں آ گرے ــــ لیکن وہ صرف نیچی نگاہ کئے اس کے پاس سے گذر گیا۔

اس نے دیکھا برگد کی بیچ شاخوں میں وہ اینٹ ہل رہی ہے۔ ہلتے ہلتے ایک دم غائب ہو گئی۔ اور وہاں وہی جھروکہ بن گیا ہے ــــ یہ جھروکہ انہیں ایک دوسرے کے کتنا نزدیک لے آیا تھا۔ وہ جیسے ان دونوں کا ساتھی تھا۔ اور ان کے سارے بھیدوں کو جانتا تھا۔

ان کے درمیان ایک دیوار تھی ــــ اینٹ چونے کی ظالم دیوار ــــ لیکن کیا در حقیقت صرف یہی دیوار ان کے درمیان تھی۔ اس دیوار کے علاوہ دوسری دیواریں نہ تھیں؟ ــــ ذات پات مذہب اور اخلاق کی سخت سنگ دل دیواریں!

جن پر سماج پہرے دار بنا کھڑا تھا۔ لیکن یہ جھروکہ ـــــــ
اس کے سامنے اس جھروکے سے پار دو گرم تشنہ ہونٹ اٹھے تھے۔ جس طرح سمندر کی لہر کو دُور سے آتے دیکھ کر دل میں ایک سرسراہٹ سی اُٹھتی ہے۔ اس طرح ان دو ہونٹوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کا جسم سرسرا سا اٹھا تھا۔
وہ پتلے گلابی ہونٹ ذرا کھلے تھے۔ شاید کچھ کہنے کے لئے لیکن اُس نے اپنے جلتے ہونٹ ان ہونٹوں پر رکھ دِئے تھے۔
اور ابھی اُن کے ہونٹ آپس میں مل بھی نہ سکے تھے کہ اس کا سارا جسم سنسنا اٹھا تھا۔ ایک عجیب مسّرت کی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ بالکل سمٹ کر بڑی مشکل سے اُن کے ہونٹ چھو سکے تھے۔ اس ہلکے لمس ہی سے اس کے جسم میں وہ میٹھی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اور اس وقت اس کا جی چاہا تھا کہ ایک ہی دھکے سے اس دیوار کو توڑ دے۔ اور ان کے سینے بھی اُن کے ہونٹوں کی طرح ایک دُوسرے سے مِل جائیں۔
اس وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی بہن سے کہے گا ـــــ مجھے تو یہ لڑکی پسند ہے۔ اگر اس سے میری شادی طے ہو جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن زندگی کی ندی اور اس کی بے پرواہ لہریں ـــــ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اور ایک بار کی بچھڑی ہوئی وہ لڑکی ـــــ پتہ بھی نہ چلا کہ کس گھاٹ اور کس کنارے جا لگی۔
اس کے دل کی گہرائی سے ایک لمبا سانس نکل گیا۔ اس نے کروٹ بدل لی۔
سامنے آنگن کے ایک طرف پھولوں کے دو گملوں کے درمیان مکڑی نے جالا بن رکھا تھا۔ ایک پتنگا کہیں سے اڑتا اڑتا اس میں آ پھنسا۔ بجلی کی سی تیزی سے

مکڑی اسے تاروں کی بیڑیوں سے جکڑنے لگی جب وہ تلملا کر بندھ کر بے حس ہو گیا۔ تو مکڑی نے اپنا خونخوار منہ اس سے لگا دیا۔ وہیں لیٹے لیٹے اس کے سامنے اس جلسے پر سفید سلک کی ہرے کنارے کی ساڑھی، ہرے چیک دار بلاؤز اور ہرے سفید سینڈل پہنے اپ ٹو ڈیٹ لباس میں ملبوس منجھلے قد کی ایک لڑکی کی تصویر کھنچ گئی — جس کے ارد گرد اس نے کبھی اسی طرح جالا بننے کی کوشش کی تھی۔

وہ اسکے کالج میں اسکی جماعت میں پڑھتی تھی۔ لیکن اس کے لئے وہ سدا دور ہی کی چیز رہی تھی — سراب کی سی — دور سے چمکنے اور پاس جانے پر اور بھی دور ہو جانے والی — اور جب ایک دن وہ اچانک اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور فلسفہ کی کتاب اس کے سامنے رکھ کر اس نے کہا تھا "مہربانی کر کے یہ مسئلہ سمجھا دیجئے۔ میری سمجھ میں خاک بھی نہیں آ رہا۔ پروفیسر صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" تو وہ حیران سا رہ گیا تھا۔

جماعت میں وہ فلسفے کا سب سے اچھا طالب علم مانا جاتا تھا جب کبھی طلباء پروفیسر گپتا سے کچھ پوچھنے جاتے اور وہ مصروف ہوتے تو وہ ہمیشہ انہیں ہری کے پاس بھیج دیتے۔ اس نے وہ سوال اسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔ کسی دوسرے کے لئے فلسفہ کی کسی گتھی کو سلجھانے کے لئے اس نے اتنی محنت سے پہلی بار ہی کام لیا تھا۔ اپنی تمام لیاقت کو بروئے کار لانے کا بھی شاید اسے پہلا ہی موقع ملا تھا۔

"میں فلسفے میں کچھ کمزور رہ گئی ہوں۔" سوال سمجھنے کے بعد اس نے کہا تھا

"مجھے اس مضمون میں دلچسپی ہے۔ شروع سے میں اس میں کمزور بھی نہ تھی۔ لیکن بھائی کی علالت کے باعث بہت دن کالج نہیں آ سکی۔ اس لئے پیچھے رہ گئی ہوں۔ اگر کچھ دن تک آپ میری مدد کریں تو چل نکلوں گی"۔ اور اس نے اس تکلیف کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

ہری نے اسے یقین دلایا تھا۔ کہ وہ حتی الامکان اس کی مدد کرے گا۔ "میرا راستہ ادھر ہی سے پڑتا ہے"۔ اس نے کہا تھا۔ "میں کالج سے جاتے وقت آپ کو کچھ بتا جایا کروں گا"۔

اور وہ لگاتار اسے پڑھانے جاتا رہا تھا۔ اسے پڑھانے کا اسے اتنا خیال تھا کہ چھٹی کے دن بھی اس کے ہاں چلا جاتا۔ پڑھنے اور پڑھانے والے میں جو دوری ہوتی ہے آہستہ آہستہ وہ کم ہوتی گئی۔ وہ اس کے ساتھ سیر اور سینما تماشے بھی گیا تھا۔ چاندنی راتوں کی تنہائی میں نیم کے چھدرے سایوں میں گھوما بھی تھا۔ اور اس کے جلتے ہونٹ اس کے جھجکتے لیکن گرم ہونٹوں سے ملے بھی تھے۔ اسے ایسا بھی محسوس ہوا تھا۔ کہ زندگی میں اس سے پہلے کوئی سکھ کوئی مسرت نہیں۔ اور وہ نہایت صفائی اور سمجھداری سے اس کے ارد گرد جال بنتا جا رہا تھا۔

لیکن نہ جانے تاروں میں کونسی کمزوری رہ گئی تھی۔ کہ وہ اس کے جال میں آ کر نکل گئی تھی۔ کچھ دن بعد اس نے سنا تھا کہ انڈین ایر فورس کے ایک اونچے افسر کی بیوی بن کر وہ کچھ دن میں چلی جانے والی ہے۔

اس نے پھر لمبا سانس لیا اور کروٹ بدلی۔ لیکن اسی نے جال نہ بنے تھے۔ اس کے گرد وہی جال بنا گیا تھا۔

"آپ کی اس مہربانی کے لئے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ اُمید ہے آپ اس طرح ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے"
نسبت روڈ کے ایک پرائیویٹ کالج کی طالبات کو لکچر دینے کے بعد ملتے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ کہ اس کے کانوں میں کالج کی پرنسپل کی میٹھی آواز نے رس انڈیلا۔

اس کا گندمی رنگ یہ کہتے کہتے لحظہ بھر کے لئے سُرخ ہو گیا تھا۔ اور کچھ لمحے ہری کی طرف دیکھ کر اُس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔
یہی ان کی پہلی ملاقات تھی۔ شکریے کا جواب دے کر اور ضرورت پڑنے پر پھر خدمت کے لئے حاضر ہونے کا وعدہ کر کے وہ چلا آیا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ اور جب ایک دن وہ اس کے گھر آ پہنچی تھی تو اُسے حیرت بھی ہوئی تھی۔ لیکن اُس نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اور جب وہ بیٹھ گئی تھی۔ تو اس نے اسے نظر بھر کر دیکھا بھی تھا —— گندمی رنگ نازک سڈول جسم پتلے گلابی ہونٹ لیکن اس کی آنکھیں —— ان میں سے ایک کچھ چھوٹی تھی۔ اس لئے وہ خوبصورت ہونے کے باوجود اسے کچھ کچھ بدصورت دکھائی دی۔ وہ تین چار گھنٹے ٹھہری تھی۔ اس دوران میں وہ اسے کئی بار خوبصورت اور کئی بار بدصورت لگی۔ وہ اپنے دل میں سوچتا رہا کہ اگر اُس کی آنکھیں بھی خوبصورت ہوتیں ——

اگر دونوں ہی چھوٹی ہوتیں یا دونوں بڑی ہوتیں ——— اور وہ اسے پسند نہ کر سکا تھا۔ ہاں اسکے دل میں اس کے لئے ہلکے سے اُنس۔ ہلکی سی ہمدردی کا جذبہ ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے اپنے جذبات کا تجزیہ نہ کیا تھا۔

اس کے بعد وہ باقاعدہ ہری کے پاس آنے لگی تھی ——— پہلے پہل کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اور بعد میں صرف ملاقات ہی کے لئے۔ یہاں تک کہ وہ آتی تو گھنٹوں ہی بیٹھی رہتی۔ ہری کی بھابی بہن اور ماں سے بھی اس نے گھر کا سا ناطہ بنا لیا تھا اور وہ اسے ناپسند نہ کرتی تھیں۔

گھنٹوں بیٹھی وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ اور اگرچہ اس نے کبھی یہ نہ کہا تھا۔ کہ وہ ہری کو چاہتی ہے یا اسے پیار کرتی ہے لیکن نگاہ اور اس نگاہ کی ہر ایک لرزش سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنا سب کچھ ہری کو ارپن کر چکی ہے۔

وہ ہری کی ہر بات کا دھیان رکھتی۔ اسکی ضرورت کی سب چیزوں اس کی صحت اور اس کے کمرے کی صفائی سب کا خیال رکھتی۔ آتی تو ہری کی میز پر بکھری ہوئی چیزوں کو قرینے سے سجانے لگتی۔ اس کے بکس میں پڑے ہوئے کپڑوں کو دیکھتی بٹن ٹانک دیتی، کپڑے سی دیتی ——— اس طرح گویا اس سے پہلے کبھی ہری کا کمرہ سجا ہی نہ تھا۔ یا وہ ہمیشہ بغیر بٹن کی گھسی پھٹی قمیضیں پہنتا تھا، یا ہمیشہ بیمار رہتا تھا۔

ایک دن اس نے دیکھا۔ کہ ہری کے صوفے کی گدیاں پھٹ گئی ہیں تیسرے ہی دن بڑے خوبصورت کپڑے کی بنی وس گدیاں اس کے صوفے اور کرسیوں کو سجانے لگیں۔ اور پھر ایک دن اس بات کا اعلان کرتے ہوئے کہ اس کے ٹرنک میں کپڑے بالکل تھوڑے ہیں وہ اس کے لئے قمیضوں کا کپڑا لے آئی

تھی۔ ہری کبھی کبھی بڑے شوق سے دھوتی پہنتا تھا۔ لہٰذا شانتی پور کی بلدیک کنارے کی دو دھوتیاں بھی وہ اس کے لئے لانا نہ بھولی تھی۔ ہری نے اُسے منع کیا۔ سمجھایا کہ خواہ مخواہ روپیہ برباد کرنے سے حاصل ——— میرے پاس کپڑے ضرورت سے کہیں زیادہ ہیں۔ شاید دھوبی لایا نہیں۔ لیکن وہ نہ مانی تھی۔ اور سب کپڑے اس کے ٹرنک میں رکھ گئی تھی ——— ۔ اس پر ہری کی بھابی نے ہنس کر کہا تھا "تمہیں تو سونے کی چڑیا مل گئی۔ ہری ——— نئے کپڑے نئی گدیاں ——— " وہ اس کے آگے اور کچھ کہتی لیکن ہری ہنستا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

یہ سب چیزیں ہری کو اس کے نزدیک لے آئی تھیں۔ اتنے نزدیک کہ ایک ہی چارپائی پر وہ بارہا اکٹھے بیٹھے لیٹے اور سوئے بھی تھے۔ ان کے سینے اور ہونٹ بھی آپس میں ملے تھے۔ اور ان کی یہ نزدیکی بارہا سماج کی بنائی حدود کو پار کرنے کرتے لوٹ آئی تھی، بارہا خودی جذبے کے ماتحت اس نے چاہا تھا کہ ایک ہی بار جبت کر کے وہ ان حدود کو پار کر جائے ——— لیکن اسے کبھی اس کا شوہر بننا منظور نہ تھا۔ وہ اس سے نفرت نہ کرتا تھا لیکن محبت بھی نہیں۔ اس کا انس صرف اس کی اپنی انا کی تسکین تک ہی محدود تھا۔ وہ اسے اتنا چاہتی ہے اس سے اسے مسرت حاصل ہوتی تھی اور ناکام محبت نے اُس کے دل پر جو زخم لگایا تھا۔ اُسے ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی روشنی دیکھ کر فخر سے اس کا سینہ دگنا ہو جاتا تھا۔ اور اپنی انا کی تسکین کے اس ذریعے کو وہ بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ ——— لیکن جال آہستہ آہستہ اسے جکڑ رہا تھا (وہ جیسے بھی ممکن ہو۔ اُسے اپنے جال میں پھانس لینا چاہتی تھی اور اس غرض کے لئے وہ ہر اقدام

کے لئے تیار تھی ــــــ شادی سے پہلے ماں بننے کے لئے بھی) اور ہری گھبرا اٹھا تھا۔ اس محبت کا انجام ــــــ اگر وہ اس دم گھوٹنے والے جال میں سے بچ پھنس گیا اور باہر نکلنے کا راستہ نہ ڈھونڈ پایا تو۔۔ ــــــ کہیں جال کے تاروں میں الجھ گیا۔ تو! ــ وہ ایک ہی زقند میں اس جال سے نکل جانا چاہتا تھا۔

تبھی ایک دن گھبرا کر اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ اس کی شادی کر دی جائے اور جلد از جلد کر دی جائے۔

کچھ دن بعد ہی اُس کے بھائی نے اسکی سگائی پکی کر دی تھی۔ اس کی بہن اور بھائی نے بتایا کہ لڑکی بے حد خوبصورت ہے پڑھی لکھی اور سلیقے شعار ہے۔ بہن نے یہ بھی کہا کہ لڑکی کا ایک ایک انگ سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ کچھ ایسی موہنی ہے ایسی کہ انسان بے اختیار کھنچا چلا جاتا ہے۔

وہ خوش تھا اور اسکا دل اپنے بھائی بھابی اور بہن کی اس عنایت پر شکر کے ایک بے پناہ جذبے سے معمور تھا۔

"لیجئے" اس کی بیوی نے چائے کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اُس نے دھیرے سے اٹھ کر پیالا تھام لیا ــــــ

اسکے سامنے گاڑی کا ایک سکینڈ کلاس کا ڈبہ آ گیا ــــــ اس کے ساتھ کی سیٹ پر جھلملاتے سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن بیٹھی تھی اور سامنے کی سیٹ پر ایک موٹی تھل تھل پل پل مہری۔ ہری اپنی سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس پہرے دار کی موجودگی میں دلہن کے خوبصورت چہرے کو دیکھے ــــــ بیتابی سے کبھی

وہ ڈبے میں گھومنے لگتا کبھی کھڑکی کے باہر منہ کر کے کھڑا ہو جاتا۔ اور کبھی باتھ میں جاکر شیشے میں اپنا مُنہ دیکھ آتا۔ وہ دلھن سے بات کرنے، اس کا گھونگٹ اُٹھانے کے لئے بیتاب تھا۔ لیکن وہ کالی کلوٹی مہری ——— اس کے جی میں آیا وہ اسے کہہ دے کہ دُوسری طرف بیٹھ جاؤ۔ لیکن وہ اس بات کا حوصلہ نہ کر سکا۔ تبھی ایک اسٹیشن آگیا اور مہری اٹھ کر دُوسری طرف چلی گئی۔ شاید اس نے ہری کی نگاہوں میں چھپی ہوئی بیتابی کو جان لیا تھا۔ کیونکہ اگرچہ شام کی تاریکی لحظہ بہ لحظہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور باہر تیزی سے بھاگتے اِکّے دُکّے درخت اور اوپر نیچے ہوتے ہوئے بجلی کے تاروں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ تو بھی مہری اپنا آدھا جسم کھڑکی میں باہر کی طرف جھکائے بیٹھی تھی۔ جیسے اس خُوبصُورت اور دلکش نظارے سے اس کی آنکھیں ہٹائے نہ ہٹتی ہوں۔

مہری کی طرف سے بے فکر ہو کر ہری نے دلہن کا گھونگٹ اٹھا دیا ——— اپنی بہن اور بھابی کی باتیں سُن کر وہ اسے دیکھنے اور پانے کو بے قرار تھا۔ اس کے سامنے شیلا، کانتا، رما اور نہ جانے کن کن لڑکیوں کے خاکوں پر ایک بے حد خوبصورت تصویر بن گئی تھی، اس تصویر کے سامنے وہ سب خاکے دھندلے پڑ گئے تھے۔ اور اُسے اپنی ناکامی کا ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ وہ خوش تھا کہ اچھا ہُوا اس کی شادی یہاں ہو رہی ہے۔ اس کی بیوی اتنی سُندر اتنی خوبصورت ——— لیکن گھونگٹ اٹھاتے ہی اس کی نظر پہلے اس لمبی ناک پر پڑی۔ جو دلہن کے تکون چہرے میں طوطے کی طرح جڑی ہوئی تھی۔

وہ سن بیٹھا رہا۔ دلہن کی مٹیوں جیسی آنکھیں لحظہ بھر کے لئے اٹھیں اور پھر

کی آنکھوں سے مل گئیں۔ شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس کا رنگ بھی اسے سانولا سا لگا۔

اچانک گھونگٹ اس کے ہاتھ سے کھسک پڑا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے چلتے چلتے گاڑی اچانک تھم گئی ہے ——— زندگی کی ساری حرکت خاموش ہو گئی ہے۔ اور اب اس میں کبھی دھڑکن نہ پیدا ہو گی۔

اس کے سامنے ایک وسیع و عریض صحرا گھوم گیا ——— وہ کب سے اس میں بھٹک رہا ہے۔ لیکن اسے کہیں بھی تو ہریالی کے دو تنکے دکھائی نہیں دئے۔ جن سے وہ اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر سکے اور ابھی اس صحرا کا کہیں اختتام نہیں۔

اس نے ایک لمبا گہرا سانس چھوڑا۔

چائے کی پیالی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے چپ چاپ اسے اپنی بیوی کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی بیوی نے خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا کیا آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے

"نہیں کچھ تھکان سی محسوس ہوتی ہے"۔

"آپ اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہیں۔ کیوں نہیں کچھ عرصہ چھٹی لے کر آرام کرتے"۔ اور رحم اور ہمدردی کے بے پناہ جذبے کے زیر اثر بیوی کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے ایک بار اُسے چوم لیا۔

ہری کو محسوس ہؤا جیسے کوئی چھپکلی اس کے ہونٹوں سے چھو گئی ہو۔ ——
ایک ٹھنڈی سرد لرزش اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔

مسز عبدالقادر

میرا آبائی وطن جہلم ہے۔ میں ۱۸۹۶ء میں وہیں پیدا ہوئی۔ میرے والد بزرگوار مولوی فقیر محمد صاحب مرحوم مالک سراج الاخبار جہلم مشہور و معروف دینی عالم تھے آپ کا فتویٰ چلتا تھا۔ اور بہت سی دینی کتب کے مصنف بھی تھے۔ میری والدہ ماجدہ بہت عابدہ و زاہدہ اور تہجد گذار خاتون تھیں۔ میرے والدین اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ آخری عمر میں انہیں خدا نے دو اولادیں دیں یعنی ایک میں اور دوسری میری چھوٹی ہمشیرہ جو کہ خانصاحب مولوی فیروز الدین صاحب مالک فیروز پرنٹنگ پریس لاہور کے خلفِ اکبر عبدالمجید خاں کی بیوی ہیں

چار سال کی عمر میں میری بسم اللہ ہوئی اور میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی کریم اللہ صاحب قرآن کریم کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ اور اُستانی رحیم بی بی صاحبہ اُردو فارسی پڑھانے کے لئے اور اُستانی حاکم جان صاحبہ سوزن کاری وغیرہ سکھانے کے لئے۔ دوپہر کے وقت مجھے صرف دو گھنٹہ کی چھٹی ملتی۔ پھر سہ پہر کو میر نیک عالم صاحب پلیڈر گجراتی جو کہ میرے والد صاحب کے دلی دوست تھے تشریف لاتے۔ یہ بھی مجھے اردو فارسی پڑھایا کرتے تھے۔

بچپن میں میری عادات عام بچوں سے جداگانہ تھیں۔ مجھے کھیل کود کا شوق مطلق نہ تھا۔ اور نہ ہی میری کوئی ہمجولی تھی۔ میں تنہا بیٹھ کر اکثر اپنے دل سے باتیں کیا کرتی تھی۔ کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں اور یہاں آنے سے پیشتر کہاں تھی۔ پھر پہروں اسی فکر میں ڈوبی رہتی۔ اور یہ خیالات میرے دماغ کو بیحد پریشان کرتے چنانچہ اسی پریشانی کے باعث میں راتوں کو عجیب و غریب خوابیں دیکھا کرتی اسکے علاوہ دو خاص جذبے میری فطرت میں موجود تھے یعنی ایک سیاحت کا اور دوسرا علماء و صلحا کی صحبت میں بیٹھکر معلومات حاصل کرنے کا۔ اور میرا یہ ذوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا۔ کہ میری رُوح ہر وقت بے قرار رہتی تھی۔ دس سال کی عمر میں والدین نے مجھے روحانی تعلیم کے لئے حافظ عبداللہ صاحب کے ہاتھ پر (جو کہ ولی کامل تھے) بیعت کرایا۔ اور میں سلسلہ نقشبندی قادری میں شامل ہو کر حافظ صاحب سے روحانی فیض حاصل کرنے لگی۔ لیکن اسکے بعد بد قسمتی سے جلد ہی حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور میری رُوحانی تعلیم ادھوری رہ گئی لیکن میری دوسری تعلیم برابر سرگرمی سے جاری رہی۔ چودھویں سال میں میری شادی ایک سرکاری عہدیدار ایم عبدالقادر صاحب سے ہوئی۔ اس [illegible] نے تعلیم کے علاوہ میرے دوسرے جذبات کو بھی کمال کر [illegible] میں میرا پہلا بچہ محی کا لڑکا [illegible] پانچ سال بعد محی الدین عالمگیر اور پھر دو دو سال کے [illegible] الدین ہمایوں عصمت آرا و عفت آرا پیدا ہوئے۔ اور ابھی یہ بچے بالکل معصوم تھے۔ کہ میرے شوہر پر فالج کا حملہ ہوا۔ انہیں علاج کے واسطے لاہور لایا گیا مگر وہ یہیں فوت ہو گئے۔ شوہر کی وفات کے بعد

مجھے جہلم میں رہنا مشکل ہو گیا۔ کیوں کہ وہاں اب میرا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار
باقی نہ تھا۔ جو کسی وقت میری یا میرے بچوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس لئے مجبوراً
میں اپنی جائداد کا انتظام ملازموں کے سپرد کر کے خود لاہور چلی آئی۔ جہاں میرے
پانچوں بچوں نے پرورش پا کر اعلےٰ تعلیم حاصل کی۔ اور علمی قابلیت میں ایک سے
ایک بڑھ چڑھ کر نکلے۔ لیکن قدرت نے جو خصوصیت ظفرؔ اور عالمگیر کو بخشی وہ اُن
کے دوسرے بہن بھائیوں کے حصے میں نہ آسکی۔ یعنی ظفرؔ پیدائشی شاعر اور عالمگیر
پیدائشی مصور تھا۔ یہ چیز بالکل خداداد تھی۔ جو انہیں بغیر استاد کے حاصل تھی۔ اور اس
وقت یہ دونوں بھائی اپنے اپنے فن میں یکتا ہیں۔ جب تک میرے بچے زیر تعلیم رہے
میں نے اپنے جذبۂ سیاحت کو دبائے رکھا۔ لیکن عالموں کی صحبت میں بیٹھنے کا
موقع ملتا رہا۔ کیونکہ ظفرؔ کی باوجود کمسنی کے بھی اچھے اچھے علماء و فضلاء سے دوستی
تھی۔ اور اس طرح میں ہر مذہب و ملت کے علماء کی حکیمانہ گفتگو سے تبادلۂ
خیالات کرتی رہی۔ ظفرؔ چونکہ بہ نسبت دوسرے بچوں کے زیادہ میرے رنگ میں
رنگا ہوا تھا۔ اس لئے وہ بھی سیاحت کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ وہ بڑا ہو کر سیاحی تندگی
میں میرا معاون ثابت ہوا۔ اُس نے مجھے بے شمار پرانے مندروں اور ویران
کھنڈروں کے علاوہ بہت سے دشوار گزار مقامات کی سیر کرائی اور اسی سیاحت
کا نتیجہ افسانہ نویسی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں افسانے لکھنے لگی۔ لیکن بہت
عرصہ تک انہیں شائع کرانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مجھے خوف تھا کہ مبادا میرے
افسانوں پر مسلمان لوگ نکتہ چینی کریں۔ دوسرے مجھے اپنی والدہ ماجدہ کے
اُن مذہبی عقائد کا بھی خاص احترام تھا۔ جو کہ دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے اُنکا

لئے میں جو بھی افسانہ لکھتی اُسے ضائع کر دیا کرتی۔ لیکن میرے چند افسانے جو نہ
جانے کس طرح ظفر کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اُس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی مختلف رسالوں
میں شائع کرا دئے۔ میرے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ لوگوں نے مجھے مبارکباد
کے خط لکھے۔ شائقین کی اس حوصلہ افزائی سے میرا دل بڑھ گیا۔ اور اسی سال
والدہ ماجدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور میں نے ظفر کے زور دینے پر اپنی پہلی کتاب
"لاشوں کا شہر" شائع کرا دی اور اُس کے کچھ عرصہ بعد دوسری کتاب "صدائے
جرس" بھی شائع ہوئی۔ لیکن تیسری کتاب "راہبہ" ابھی زیرِ تکمیل ہی تھی۔ کہ دُنیا کی
تباہ کُن جنگ چھڑ گئی۔ اور میرے تینوں بیٹے مع اپنی چھوٹی بہن کے لفٹیننٹ
بھرتی ہو کر فوج میں چلے گئے انہیں ایام میں بڑی لڑکی کی شادی بھی ہو گئی۔ اور
میں بالکل یکہ و تنہا رہ گئی ان سب بچوں کے یکدم جدا ہو جانے سے میرا تمام وقت
اُداسی اور غمگینی میں گذرنے لگا۔ چونکہ میرے چاروں بچے میدانِ جنگ میں تھے۔
اس لئے اتنے سال تک میرا قلم صرف اُن سے خط و کتابت کے واسطے مخصوص رہا
جس سے میری افسانہ نویسی تقریباً مردہ ہو کر رہ گئی۔ لیکن اب خدا کے فضل سے
جنگ کے خاتمے کے ساتھ میرے تفکرات کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور [illegible]
نویسی پھر زندہ ہو رہی ہے چنانچہ "راہبہ" پایۂ تکمیل [illegible]
کتابت ہو رہی ہے اور اب چوتھی [illegible] ہوں جو کہ "راہبہ"
کی طرح لمبا انتظار نہ ک[illegible]

مسز عبدالقادر

(۱)

میں اور جمیل کلاس فیلو تھے۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد وہ بے روزگاری کی وجہ سے شیلانگ چلا گیا۔ جہاں اس کو بنک میں ملازمت مل گئی۔ لیکن میں اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا جو میرے لئے ایک زبردست رکاوٹ تھی ——

۱۹۱۰ء میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں نہایت دل برداشتہ اور آزردہ خاطر رہنے لگا۔ انہی دنوں جمیل کا خط گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ثابت ہوا۔ اس نے اپنے پاس بلا بھیجا تھا۔ کیونکہ اس کے ماتحت بنک میں ایک جگہ خالی تھی۔ میں نے آسام جانا ہی مناسب سمجھا اور اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر جمیل کے پاس جا پہنچا۔

—— مجھے اپنی نوکری پر بحال ہوئے تین مہینے گزر گئے۔ جمیل میری ہمدردی اور دلجوئی میں برادرانہ الفت کا ثبوت دیتا رہا۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں

رہتے تھے۔ تاہم میری اُداسی دُور نہ ہو سکی۔ اسکی وجہ جمیل کی آسامی بیوی ہانہ تھی۔
ہانہ نہایت بدمزاج اور تند خو عورت تھی۔ وہ میری اور جمیل کی دوستی
سے بدظن تھی۔ اور میرے ساتھ حریفانہ سلوک کرتی تھی۔ گو جمیل اس کی باتوں کو کچھ اہمیت
نہ دیتا۔ اور ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر ہر وقت کی خانہ
جنگیوں سے میں اکثر گھبرا جاتا اور اپنا دل بہلانے کے لئے شہر سے باہر دور دور تک
نکل جاتا۔ جہاں نشیب زاروں کی خوشگوار تنہائیوں۔ پُرسرار خاموشیوں اور سحر آمیز
یکسوئیوں میں بیٹھ کر ہری بھری وادیوں کے قدرتی حسن سے حظ اُٹھاتا۔ اور پان کی
بیلوں سے لدی ہوئی خوبصورت جنگلی پھلواڑیوں میں سکونِ رُوح تلاش کرتا۔ ساگوان
کے تن آور اشجار اور سپاری کے طرح دار درخت میرے ساتھی ہوتے اور میں اُس
وقت سبزہ کی نرم و ملائم چھاتی پر حقیقی سکھ کا احساس کرتا۔

(۲)

موضع شوشیلانگ سے اٹھارہ کوس پرے ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ یہ
جگہ مجھے سب تفریحی مقامات سے زیادہ پسند تھی۔ یہ مقام گویا حسن و تجلیات کا
مرقع تھا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ نمودِ قدرت کا آئینہ دار تھا۔ چمکتی دمکتی [illegible]
رنگین شعاعوں سے ہولی کھیلتی ہوئی سحر آفریں رنگینیاں [illegible]
لمبی لمبی تر و تازہ گھاس میں چمکیلے [illegible] سینہ
کو تان کو نہایت خوش [illegible] دیوتاؤں کی طرح حسین
پردوں کو پھیلا کر [illegible]ے۔ میں اکثر اتوار کو یہاں آتا تھا۔ اس رومانی
سرزمین اور رشکِ ارم خطہ میں تنہا بیٹھ کر صانعِ قدرت کی کاریگری کا مطالعہ کیا

کرتا۔ ـــــ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آسامی لوگوں میں مردہ گاڑنے یا جلانے کا
رواج نہ تھا۔ یہ لوگ مردہ کو آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد کسی خوبصورت دلدل
یا کسی خوشنما گھنے پیڑ کے نیچے رکھ آتے۔ جہاں وہ جنگلی جانوروں کی خوراک بن جاتا تھا
ـــــ ان دلدلوں کے کنارے پر اکثر انسانی ڈھانچے۔ بکھرے ہوئے
پنجر اور شکستہ کھوپڑیاں پڑی ہوئی ملتی تھیں۔ ایک دن میں ایک خوبصورت دلدل کے
کنارے بیٹھا چیل کے بچوں کے لئے مرغوں کے رنگین پر جمع کر رہا تھا۔ قریب ہی
ایک کہنہ کاسۂ سر پڑا تھا۔ جسے میں نے اٹھا لیا اور پروں کو اس میں بھرتا رہا۔
ـــــ لیکن جب میں نے اس شغل سے فارغ ہو کر کھوپڑی سے پر نکالے
تو مجھے خیال آیا کہ یہ بھی میری طرح کے ہی کسی انسان کا سر ہے۔ نہ جانے زندگی میں
وہ اس سر کو کس قدر بلند کر کے چلتا ہو گا۔ اور نہ معلوم اس کے دماغ میں کیا کیا جوہر
بھرے ہوں گے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سامنے آ گیا۔ آہ انسانی زندگی کا ایسا پُر درد
انجام۔ میرا دل بجھ گیا اور دیر تک اس کاسۂ سر کو پکڑے اسرار ہست و بود پر غور کرتا
رہا۔ ـــــ دفعتاً مجھے ایک عجیب خیال آیا۔ میں نے بچپن میں امی جان سے
سن رکھا تھا کہ ہر انسان کی پیشانی کی ہڈی پر اس کی قسمت لکھی ہوتی ہے اور اس
خدائی [illegible] کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اسی خیال کے ماتحت میں نے پیشانی
کی ہڈی کو بغور دیکھا [illegible] پیشانی کی ہڈی پر کچھ حروف کندہ تھے اور
یہ حروف جو اڑھائی سطروں میں مرقوم [illegible] زبان میں لکھے ہوئے تھے میں
نے سوچا شاید یہ لکیریں ہڈی کے تڑخ جانے سے بن گئی ہوں۔ تحریر وغیرہ کچھ نہ ہو
سو اسی غرض سے میں نے دو اور کھوپڑیوں کا معائنہ کیا تو ان پر بھی پہلی کھوپڑی

کی طرح اڑھائی اڑھائی سطریں مرقوم تھیں۔ یہ خطِ تحریر ایک ہی تھا۔ مگر حروف ہم ایک کے جُدا تھے ۔۔۔۔۔ میں ان تینوں کھوپڑیوں کو ساتھ لے آیا۔ اور روزانہ رات کے وقت تنہائی میں بیٹھ کر ان تحریروں میں دماغ سوزی کرنے لگا۔ میں نے اپنے کئی دوستوں کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔ لیکن وہ بھی کچھ نہ سمجھ سکے ۔۔۔۔۔ اسی طرح ایک سال گذر گیا۔ اسی دوران میں میری ملاقات فیض سے ہوئی فیض پچیس سال کا ایک ہندوستانی نوجوان تھا۔ اس کا باپ یہاں سوداگری کرتا تھا ۔۔۔۔۔ فیض پہلے محکمہ سراغرسانی میں ملازم تھا۔ اور ایک قابل سراغرسان خیال کیا جاتا تھا لیکن کچھ عرصے سے وہ تپِ دق میں مبتلا ہو کر ایک سال کی رخصت پر اپنے باپ کے پاس چلا آیا تھا ۔۔۔۔۔ ڈاکٹروں نے اسکی صحت کے لئے شُو کی آب و ہوا مفید قرار دی تھی۔ اس لئے اسکے باپ نے موضع شُو سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر خودرو پھولوں کے ایک خوبصورت جنگل کے درمیان اسکے لئے ایک فراخ اور دیدہ زیب جھونپڑا بنوا رکھا تھا۔ جہاں وہ اپنی ماں اور دو ملازموں کے ہمراہ رہتا تھا ۔۔۔۔۔ فیض اکثر دلدلوں پر مُرغ کا شکار کرنے آیا کرتا تھا۔ وہیں میری اُسکی ملاقات ہوئی۔ اور یہ معمولی ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی میں نے اس سے بھی اپنے خبط کا ذکر کیا۔ اُس نے مجھے صلاح دی کہ چند کھوپڑیاں [illegible] کے پاس بھیجنی چاہئیں۔ چنانچہ اُسی ہفتے [illegible] ہیر بیری کو بھیج دیں ۔۔۔۔۔ [illegible] کالج کے زمانے کا واقف تھا۔ اسکی عمر کا [illegible] سیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ اور مجھے یقین کامل تھا کہ اس کام میں پروفیسر ہیری سے بہت مدد ملے گی۔ سو بہت بے صبری سے اُس کے

جواب کا انتظار کرنے لگا ——— آخر خدا خدا کر کے دو مہینے کے بعد پروفیسر کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ ایسی تحریر دیکھی ہے۔ یہ زبان نہ تو دنیا میں موجود ہے اور نہ کبھی تھی۔ بہر حال اس کے پڑھنے کی کوشش جاری ہے۔

——— (۳) ———

اتوار کا دن تھا۔ آج میں ذرا سویرے ہی گھر سے روانہ ہوا۔ اور دس بجے کے قریب دلدل کے کنارے پر پہنچ گیا ——— فیض کا مکان یہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ہمیشہ بارہ بجے دلدل پر آیا کرتا تھا۔ اس کے انتظار میں ایک درخت کے سہارے سبزہ کے مخملیں فرش پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ سامنے ہی ایک کھوپڑی تھی ——— یہ کھوپڑی جسامت میں دوسری کھوپڑیوں سے کچھ بڑی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کھوپڑی ضرور کسی عالی دماغ شخص کی ہو گی مگر اسکی شکستگی اور ابتر حالی سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں میں نے اُسے اُٹھا لیا اور پاگلوں کی طرح اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "اسے [illegible]ست تم کیوں اتنے خستہ اور بے بس ہو رہے ہو۔ وہ کونسی ایسی زبردست [illegible] اس قدر بے بس کر دیا۔ تم موت کا زہریلا جام چکھ چکے ہو۔ کیا مجھے نہ بتاؤ گے کہ وہ [illegible] ——— عین اُسی وقت ایک آبی پرندہ نہایت رقت خیز آواز سے بے اختیار چیخ [illegible] [illegible] کانپ گیا۔ اور حیات فانی کی بے مائگی پر بے اختیار رونے لگا ——— [illegible] قریب تھا میں نے کھوپڑی کو پھینک کر اُٹھنا چاہا مگر میری قوت زائل ہو چکی تھی [illegible] ایسا

محسوس ہؤا کہ وہ کھوپڑی مجھے اپنے اندر جذب کر رہی ہے ——— دوپہر کا وقت سنسان سبزہ زار۔ خاموش اور وسیع دلدل عجیب و حرکت اشجار۔ کپکپاتی ہوئی خفیف سی کمزور ہوا۔ مکمل تنہائی اور اُس پر شکستہ کھوپڑی کا مس مجھے سخت سردی محسوس ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے۔ خون کی گردش کم ہوگئی۔ دل بیٹھ گیا۔ سانس رُک رُک کر چلنے لگا۔ گو میری آنکھیں کھلی تھیں مگر بینائی ہر لحظہ کم ہوتی جارہی تھی، آہستہ آہستہ مجھ پر ایک لاہوتی نیند مستولی ہوگئی ——— جب مجھے ہوش آیا تو میں نرم نرم مشکیں گھاس پر دراز تھا۔ اور میرا سر نصیبں کے زانو پر تھا۔ جو ایک پتے کا چمچہ بنا کر میرے مُنہ میں پانی ڈال رہا تھا ——— جب میرے اکڑے ہوئے جبڑے ذرا نرم ہوئے تو میں نے نقاہت سے پوچھا "میں کہاں ہوں"۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ بہت خوش ہؤا۔ اور محبت سے بولا "خدا کا شکر ہے۔ کہ تمہاری جان بچ گئی۔ اگر میں وقت پر نہ آتا تو تمہاری زندگی محال تھی۔ خدا کے لئے ان منحوس کھوپڑیوں کا خیال چھوڑ دو۔ ورنہ تم آسیب زدہ ہو جاؤ گے" ———

اُس وقت تو میں خاموش رہا لیکن واپسی پر میں نے اسکی نظر بچا کر وہ کھوپڑی جس کے طلسمی اثر سے تھوڑی دیر پہلے میں بیہوش ہوا تھا) اُٹھا کر اپنے [illegible] اور گھر چلا آیا ——— دوسرے دن رات [illegible] اپنے کمرے میں ایک سایہ چلتا پھرتا د[illegible] میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اُس کھوپڑی کے متعلق وہم پیدا ہؤا۔ میں نے اُسے باہر پھینکنے کے ارادے سے اپنی کمیں کھولا لیکن میں فوراً ہی دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ کھوپڑی غائب تھی۔ ——— پریشانی سے تمام رات میری آنکھ نہ لگی۔ صبح میں نے کسی

ضرورت سے اٹیچی کیس کھولا تو کھوپڑی موجود پائی۔ میں نے سوچا کہ رات کو شاید گھبراہٹ کی وجہ سے میں نے اچھی طرح نہیں دیکھا یا واہمہ کے اثر سے اس پہ نظر نہ پڑ سکی ——— میں تمام دن اسی خیال میں کھویا سا رہا۔ رات کو پھر میرے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا۔ میں نے اپنا شک رفع کرنے کی غرض سے فوراً اٹھ کر اٹیچی کیس کھولا، کھوپڑی غائب تھی۔ رات جوں توں کر کے گذری۔ صبح پھر میں نے آزمائشاً اٹیچی کیس دیکھا تو کھوپڑی بدستور موجود۔ میں بہت ڈرا۔ اور اُسے اٹھا کر مکان کے پچھواڑے بدھ کے شکستہ مندر کی طرف پھینک دیا۔ مگر اسکے بعد بھی وہ سایہ نہ ٹلا جس کی وجہ سے میں بہت فکرمند تھا۔ پھر بھی میں نے کسی سے اُس کا ذکر نہ کیا ——— آخر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا آدھی رات کے وقت ہانہ کی خوابگاہ سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گھر بھر میں کھل بلی مچ گئی میں بھی ننگے پاؤں دوڑتا ہؤا بدحواسی سے اُس کی خوابگاہ تک پہنچا ——— کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور جمیل ہانہ کو سنبھالنے میں مصروف تھا ہانہ بستر پہ پڑی بے تحاشہ چیخ رہی تھی۔ اُس کا بدن برف کی طرح یخ تھا ——— دیر کے بعد اُسکی [illegible]ت ہوئی سو وہ بہت خوفزدہ تھی۔ اُسنے بتایا کہ نیند کی حالت میں یکدم [illegible]دی محسوس ہوئی۔ اُس نے کپکپا کر آنکھ کھولی تو ایک سایہ اس پہ [illegible]لت پھر اس واقعہ پر غور کرتا رہا کہ اس سایہ سے کیسے چھٹکارا حاصل ہو [illegible]س کھوپڑی کو بھی پھینک چکا تھا جس کا اس واقعہ سے کچھ تعلق خیال کیا جا سکتا تھا ———

غرضیکہ صبح تک میں اسی الجھن میں گرفتار رہا۔ اور ابھی میں بستر سے اٹھا نہ تھا

کہ جمیل میرے کمرے میں آیا وہ کچھ مغموم دکھائی دیتا تھا۔ اور مجھے مخاطب کر کے سراسیمگی سے کہنے لگا۔ "رات والے واقعہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے" میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ بھی نہیں ہانہ یونہی ڈر گئی تھی"۔ جمیل نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مگر صرف ہانہ کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا بلکہ مجھے بھی یہ واقعہ پیش آچکا ہے۔ لیکن میں نے اسے واہمہ خیال کرتے ہوئے اب تک اہمیت نہ دی تھی"——

میں خاموش رہا۔ کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا۔ کہ یہ سب مصیبت اُسی کھوپڑی کی وجہ سے نازل ہو رہی ہے۔ پھر جمیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اس مکان کو چھوڑ دینا ہوگا۔ یہ مکان ضرور آسیب زدہ ہے۔ اور میں تو فوراً مکان تبدیل کر لیتا۔ لیکن آجکل کام کی بھرمار ہے اس لئے کچھ دن اور یہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ مگر ہانہ کی بابت میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُسے میکے بھیج دُوں اور جبتک مکان تبدیل نہ ہو۔ وہ وہیں رہے"۔ میں نے اس کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا اور اُسے تسلی دینی چاہی تاہم اُس پر کچھ اثر نہ ہوا —— اس واقعہ کے دوسرے تیسرے دن ملازمین بھی اُس سرو سایہ کی شکایت کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ تمام گھر میں دہشت کی لہر دوڑ گئی اور سب چھوٹے بڑے سہمے ہوئے دکھائی دینے لگے —— ایک دن اتفاقاً پھر میں نے اٹیچی کیس کھولا۔ تو خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ کھوپڑی پھر اٹیچی کیس میں موجود تھی۔ شاید پھر کسی نے لاکر یہاں رکھدی تھی۔ مگر لانے والا کون تھا۔

(۴)

ہانہ موضع پنگ کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ موضع پنگ شیلانگ سے سات

میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ جمیل مع بیوی اور بچوں کو
لے کر وہاں جا رہا تھا۔ سرِ شام ہی اسباب وغیرہ بندھ گیا تھا۔ اور رات کو تمام
لوگ سکھ کی نیند سوتے رہے۔ لیکن صبح سویرے ہی جب ہانہ بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا
کہ الماری کھلی پڑی ہے۔ چابیوں کا گچھا تالے میں لٹک رہا ہے اور اس کے زیور کا
ڈبہ غائب ہے ——— فوراً ہی گھر میں شور مچ گیا۔ کچھ دیر ملازموں سے
پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ پھر پولیس میں اطلاع کی گئی۔ پولیس نے موقع دیکھا اور انتہائی
تحقیقات کی۔ مگر چور کا کچھ پتہ نہ چلا ——— ہانہ مایوس ہو کر میکے چلی گئی
جمیل ہر ہفتے کی شام کو وہاں چلا جاتا۔ اور اتوار کا دن گذار کر پیر کی صبح کو وہاں سے
واپس آتا۔ چونکہ پولیس کی تحقیقات ابھی جاری تھی۔ اس لئے جمیل کی غیر موجودگی
میں میرا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ چنانچہ اسی ردوکد میں کئی اتوار میں فیض کو ملنے نہ جا سکا۔
——— آخر ایک اتوار کو مجھے بڑی مشکل سے موقع ملا اور میں سیدھا
فیض کے گھر جا پہنچا۔ مگر اُسے دیکھ کر میں بہت گھبرا گیا۔ وہ بالکل پہچانا ہی نہ جاتا تھا
اُس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر غیر معمولی رونق دکھائی دیتی
[illegible] نے مجھے بتایا کہ ایک سنیاسی کہتا ہے کہ ایک ہفتے تک
[illegible] ——— میں تمام دن اُسکے پاس رہا۔ دورانِ
گفتگو میں میں نے اُسے جمیل کا [illegible] اُس نے سرا اعترافانہ انداز
سے نام واقعہ سنا اور دیر تک کسی گہری [illegible] پھر وہ بھر کر کہنے لگا۔
کاش کہ اگر آجکل میں تندرست ہوتا تو چٹکیوں میں سراغ [illegible] لیتا۔ پولیس بیچاری
ان باتوں کو کیا جانے۔ اچھا دعا کرو کہ میں جلد اچھا ہو جاؤں۔ تو فوراً مال مسروقہ

برآمد کرا دوں گا۔ یہ کونسی بڑی بات ہے ——— اُس نے مجھے کئی پراسرار چوریوں کے واقعات سُنائے جس کے فیض نے سراغ لگائے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں وقت کٹ گیا۔ اور شام کے قریب میں وہاں سے واپس لوٹا ———

——— فیض کی ملاقات کے پورے سات دن بعد یعنی ہفتے کی شام کو جمیل اپنی بیوی کے پاس بنک چلا گیا۔ میں اکیلا تھا۔ کام سے فارغ ہوتے ہی گھر آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اور ایسی گہری نیند سویا کہ رات کے دس بجے تک بے خبر سوتا رہا۔ اب بھی اگر ملازم کھانے کے لئے بیدار نہ کرتا۔ تو شاید دوسری صبح آنکھ کھلتی ——— کھانا کھا کر میں کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ چاندنی رات تھی میٹھی ہوا کے لطیف جھونکے رُوح کو آسودگی بخش رہے تھے یہتی کہ ایک بج گیا۔ ملازم بھی میٹھی نیند سو گیا۔ تمام گھر ویران اور ہر طرف سناٹا غالب تھا ——— دفعتاً مجھے ہوا کے جھونکوں سے ملی جلی خفیف سی ایک آواز سُنائی دی۔ جیسے کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو۔ میں فوراً نیچے اترا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ میں دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں واپس جانے لگا۔ تو پھر ایک خفیف سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی ———

یہ آواز مکان کے پچھواڑے کی طرف کسی دروازے پر دستک ہونے کی تھی۔ میں نے مکان کے پچھلے حصے کا آخری دروازہ کھولا ——— ہمارے مکان کے پچھواڑے بدھ کا ایک ویران اور شکستہ مندر تھا جس کے بیرونی احاطے میں گنجان درخت اور بے ترتیب اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی ——— گو چاندنی رات تھی۔ مگر آسمان پر ہلکے ہلکے چھیچھڑے بادل پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے

دھندلے سائے چاندنی کی اُجلی رداکو جابجا داغدار بنا رہے تھے۔ ہر چہار طرف پُرہیبت خاموشی طاری تھی۔ آسام کی تمام آبادی سکوت اور نیند کے نشے میں مدہوش تھی۔ یہاں بھی دروازے پر کوئی موجود نہ تھا! البتہ مندر کے احاطہ کی شکستہ منڈیر پر ایک سفید سا سایہ دکھائی دیا۔ میں پھر دروازہ بند کرنے کو ہی تھا۔ کہ کسی نے دوبارہ میرا نام لے کر پکارا۔۔۔۔۔۔ اُف یہ آواز ایسی بے رس ناگوار اور کھوکھلی تھی۔ جیسے قبر کی تہوں سے نکلی ہو۔ یا کنوؤں کے عمق سے کسی نے پکارا ہو۔ میں پہلے تو لرز گیا۔ لیکن حوصلہ کر کے پوچھا "کون ہے"۔ اسکے جواب میں اُسی خوفناک آواز میں کسی نے کہا۔ "میں ہوں فیض" خوف اور تعجب کے ملے جلے احساس سے میں کانپ گیا۔ تاہم مروت کے خیال سے آگے بڑھنا پڑا۔ لیکن اُسکے قریب جانے کی جرأت نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔ آواز دینے والا شخص سچ مچ فیض ہی تھا۔ میں نے بمشکل اپنی آواز میں ملائمت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "یار تم اس وقت یہاں کیسے آئے"۔ اس نے کچھ رُکتے ہوئے جواب دیا۔ "مال مسروقہ برآمد کرانے آیا ہوں کیونکہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ صحت یاب ہو کر پہلے یہی کام کروں گا"۔ میں نے نرم لہجہ میں دریافت کیا کہ "تم [illegible]ت سے کیوں نہیں آئے" وہ خاموش رہا جس پر میں نے رسماً کہا "خیر [illegible] آواز کو کیا ہو گیا ہے"؟ وہ کافی وقفہ کے بعد کہنے لگا "آج جو دوائی مجھے دی [illegible] پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گرم تھی۔ کہ اسکی گرمی نے میرے تن بدن [illegible]ثر سے میری آواز بھی بدل گئی ہے۔ اُف اس کا تلخ اور عذاب دہ ذائقہ [illegible] زبان پر موجود ہے"۔۔۔۔۔۔ گو فیض کی بے وقت آمد مجھے ناگوار گذر رہی تھی۔ تاہم میں

نے اخلاقاً اُسے اندر چلنے کی دعوت دی۔ مگر اُس نے اُداسی سے کہا "میرے پاس اتنا وقت نہیں میرا پو پھٹنے سے پہلے واپس جانا ضروری ہے" میں نے کہا "خوب شاید تم گھر والوں سے چوری آئے ہو"۔ اُس نے جواب نہ دیا ———— میں نے پھر کہا "تو کیا تم ابھی واپس چلے جاؤ گے"۔ اس نے سست انداز سے کہا "ہاں مگر پہلے ذرا میرے ساتھ چلو"۔ نہ جانے کیوں مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ اُس نے میری حالت کو بھانپ کر افسوسناک لہجہ میں کہا "کیا تمہیں میری طرف سے نقصان کا اندیشہ ہے" ———— میں نے دل کڑا کر کے کہا "نہیں دوست لیکن جانا کہاں ہو گا؟" اس نے کہا "چلو تو سہی تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا"۔ میں لاجواب ہو گیا۔ اور جبراً و قہراً اس کا ساتھ دینا پڑا۔

———— (۵) ————

مدھ کا شکستہ اور غیر آباد مندر اپنی کہنگی اور قدامت کے لحاظ سے مافوق الفطرت خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ اسے بھوت پریت کا مسکن سمجھتے تھے۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کی روایتیں بیان کی جاتی تھیں اکثر لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ مندر کے نیچے خزانہ دفن ہے۔ اور ایک بہت بڑا سانپ اُس پر بحیثیت نگہبان کے بیٹھا ہے اگر کوئی شخص وہاں چالیس دن تک ایک ٹانگ پہ کھڑا رہے تو سانپ مہربان ہو کر اُسے مالا مال کر دیتا ہے۔ کئی لوگ کہتے کہ یہ مندر کسی راجہ نے بدھ مت کے جنوں کے لئے بنوایا تھا۔ اب تک بھی اس میں عبادت کرتے ہیں اور اُن کا خلیفہ بیان کرتا تھا۔ کہ اس مندر کے احاطہ میں اُن سب بندگوں نے دن دہاڑے درختوں پہ چراغ جلتے دیکھے تھے۔ اور کئی ایک یہ بھی کہتے کہ اس مندر میں ایک چڑیل رہتی

ہے جو حسین عورت کا روپ دھارن کرکے اکثر رات کو احاطے کی منڈیر کے قریب کھڑی
ہو کر راہگیروں کو پکارتی ہے۔ اور اُن کو پوری حلوا دیتی ہے۔ لیکن راہگیر جب اس حد
سے نکل کر آگے بڑھتا ہے تو وہ پوری حلوا گندگی بن جاتا ہے ——— میں
نے ہمیشہ ان روایات کا مذاق اڑایا تھا۔ لیکن اس وقت جبکہ فیض مندر کے احاطہ
میں داخل ہو رہا تھا۔ تو وہ سب بے سروپا باتیں میری ہمت کو پست کرنے لگیں۔
قریب تھا کہ میں بھاگ جاؤں مگر فیض کی پھٹی ہوئی آواز (بڑھتے آؤ) نے مجبور کر دیا۔
——— مندر کے احاطہ میں درختوں کی کثرت۔ جھاڑیوں اور بیلیوں کی افراط
سے سخت اندھیرا تھا۔ اونچی اونچی گھاس میں جو انسانی قد کے برابر تھی۔ چلنا سخت
دشوار تھا۔ فیض اس مقام پر بغیر کسی رکاوٹ کے چل رہا تھا۔ لیکن میں اندھوں
کی طرح ٹٹولتا۔ اور بُری طرح قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ جھاڑیوں کی رگڑ سے میرے
کپڑے پھٹ گیا۔ ہاتھوں اور مُنہ پر بھی خراشیں آگئیں کبھی کبھی میں الّو کی طرح جھاڑیوں
کے ساتھ ٹکراتا۔ کہ جنگلی پرندے خوفزدہ ہو کر پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے گھونسلوں سے
باہر نکل آتے۔ آخر ایک جگہ پر فیض بالکل میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ———
یکایک چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز نہایت دلخراش اور لرزہ خیز تھی۔ جیسے کسی
متورم گلے یا کسی زخمی دہن سے نکل رہی ہو۔ میرا دل دہل گیا۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔
اور بڑھتا گیا۔ آخر کچھ دور آگے مجھے صاف زمین دکھائی دی یہاں پتھر کا فرش
تھا۔ جس کے درمیان بوسیدہ مندر کھڑا تھا ——— عین اسی وقت
چاند نے بھی نقاب کا کونہ سرکایا۔ جس کی کپکپاتی اور تھرکتی ہوئی چاندنی میں میں نے دیکھا
کہ فیض ایک پرانے تناور درخت کے قریب کسی سے دست و گریباں ہو رہا ہے

میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ پاؤں زمین نے پکڑ لئے۔ کیونکہ چیخوں کی آواز انتہائی حد تک خوفناک تھی۔ گویا کوئی بد روح آتشیں زنجیروں میں جکڑی ہوئی چیخ رہی تھی۔ یا کوئی دوزخی کتا بھونک رہا تھا۔ میں آگے نہ جا سکا ــــــ تھوڑی دیر بعد فیض کا حریف چیختا چلاتا بھاگ گیا۔ فیض نے درخت کی کھوکھ میں ہاتھ ڈالکر کچھ نکالا۔ اور بجلی کی سی سرعت سے واپس چلنے لگا۔ جب ہم لوگ مندر کے احاطے سے باہر آئے تو اس نے ایک ڈبہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ جو زیورات سے پر تھا ــــــ فیض نے کہا "زمیں جانتا ہوں"۔ میں نے بے چینی سے پوچھا" مگر پہلے یہ بتاؤ کہ چور کون تھا" اس نے کہا" تمہیں کیا حاصل"۔ میں نے کہا" یہ نہایت ضروری ہے"۔ وہ دیر تک سوچنے کے بعد بولا" اچھا سنو۔ آج سے چند سال پیشتر موضع ننگ میں ایک حسین لڑکی رہتی تھی۔ بدقسمتی سے ایک نوجوان اُس سے محبت کرنے لگا۔ یہ نوجوان گو ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر تھا بالکل مفلس اس لئے وہ لڑکی اسکی محبت کو بے حقیقت اور بے قیمت سمجھتی تھی۔ وہ نوجوان بار بار ذلت اٹھانے پر بھی اُس پر جان دیتا تھا۔ آخر اس لڑکی نے تنگ آ کر ایک دن اُسے کہا۔ کہ اگر تم ایک بہت بڑی رقم میرے نام پر بنک میں جمع کرا دو۔ تو میں تم سے شادی کر لونگی ــــــ نوجوان نے مطلوبہ رقم مہیا کرنے میں خون پانی ایک کر دیا۔ لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ ان پے در پے ناکامیوں سے اُسکے خیالات باغیانہ ہو گئے اس نے چوری اور راہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اور ایک بڑے آدمی کے گھر ڈاکہ ڈال کر اُسے قتل کر دیا۔ مگر اسی سلسلے وہ گرفتار ہو گیا اور قتل کے جرم میں اُسے سزائے موت ملی ــــــ اس حسین لڑکی کی دوسری شادی ہو

گئی۔ وقت کی رفتار نے اس خونیں واقعہ کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا لیکن محبت مرتے کر بھی اپنا اثر دکھلائے بغیر نہ رہ سکی یعنی کسی شخص کو اتفاقاً اُس نوجوان کی کھوپڑی مل گئی اور وہ اُسے گھر لے گیا۔ یہ گھر وہی گھر تھا جس میں اس کھوپڑی کے مالک نوجوان کی محبوبہ رہتی تھی ———— نوجوان کی رُوح اپنی کھوپڑی کی تلاش میں اسی جگہ گئی۔ اُس نے اپنی محبوبہ کو وہاں دیکھا تو اس کے مجرمانہ خیالات بیدار ہو گئے۔ کیونکہ مرتے وقت جو خیالات انسانی دماغ میں ہوں۔ موت کے بعد بھی روح پر ہمیشہ اُن کا اثر رہتا ہے۔ چنانچہ اُس دن سے وہ آوارہ رُوح چوری کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگی۔ اور ایک دن وہ اپنی محبوبہ کے کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ تو محبوبہ کی چابیوں کا گچھا دیکھ کر اس کی رُوح چوری پر مجبور ہو گئی۔ اور چوری کے بعد مال مسروقہ اس نے پرانے مندر کے احاطے میں درخت کی کھوہ کے اندر چھپا دیا۔ اب اسی آوارہ اور چور روح سے میں نے یہ صندوقچہ چھینا۔"

میں نے سہم کر پوچھا۔ "تو کیا تم اُس وقت رُوح سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔؟"

فیض نے جواب دیا۔ "ہاں"۔ میں نے کہا۔ "روح تو لطیف چیز ہے اُس سے کون لڑ سکتا ہے؟" فیض نے اکتا کر کہا۔ "روح کی لطافت نیکی پر منحصر ہوتی ہے ایک گنہگار کی رُوح تو بوجھل ہوتی ہے۔ جو خدا سے دُور رہتی ہے۔ اور مقام معمور تک نہیں جا سکتی۔"

میں نے بے اعتباری سے کہا۔ "لیکن تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں" اُس نے رو کھائی سے جواب دیا۔ "مرا غرسان کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ اگر اس وقت وہ کھوپڑی

موجود ہوتی جس کے اثر سے تم ایک دفعہ دلدل کے کنارے بے ہوش ہوئے تھے۔ تو میں اس کی پیشانی کی تحریر پڑھ کر تمہیں مطمئن کر دیتا۔ میں نے انتہائی حیرت زدہ ہو کر کہا "کیا ان تحریروں کا راز بھی تم نے پا لیا ہے" فیض نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ——— میں سخت متحیر تھا میری آنکھیں اس کے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں وہ اس وقت مجھے ایسا لاغر اور خوفناک معلوم ہوا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ فیض نے میری بگڑی حالت کا اندازہ کر کے اداسی سے کہا "اچھا اب میں جاتا ہوں" یہ کہکر وہ بغیر مصافحہ کئے روانہ ہوا اور بہت جلدی میری نظروں سے غائب ہو گیا ———
اس کے جانے کے بعد مجھ پر ایک لرزہ خیز خوف طاری ہو گیا اور خدا جانے میں کس طرح اپنے کمرے میں واپس آیا۔

———(۶)———

شب کا سحر ٹوٹتے ہی صبح کے اجالے نے دامن کائنات کو نور سے بھر دیا۔ نسیم سحر کے خوشگوار تازہ جھونکوں نے میرے سوئے ہوئے دماغ میں نئی روح پھونک دی اور میں ایک لمبی بیہوشی سے ہوشیار ہوا۔ میرا بدن تھکن سے چور تھا اور بند بند درد کر رہا تھا ——— یکے بعد دیگرے مجھے رات کی سب باتیں یاد آنے لگیں یہ سب واقعہ مجھے خواب معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب میری نگاہ زیور کے ڈبے پہ پڑی تو مجبوراً یقین کرنا پڑا۔ اتنے میں ملازم چائے لے کر آ گیا جس کے پینے سے میرا پریشان دماغ کچھ درست ہوا۔ اور میں نے وہ ڈبہ بکس میں رکھا اور بعد ازاں فیض سے مفصل حالات معلوم کرنے کے اشتیاق میں موضع سور کی طرف روانہ ہو گیا ———
برسات کی وجہ سے راستے خراب ہو رہے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا زمین اور دلدل

میں تمیز دشوار تھی۔ غدار بوجھل ہوا۔ گدلے پانیوں میں سڑی ہوئی گھاس اور مچھلی کی لیتا طبیعت کو مکدر کر رہی تھی۔ مینڈکوں کے بے کیف شور و غل نے تمام وادی سر پر اٹھا رکھی تھی ——— میں بدقت تمام فیض کے گھر تک پہنچا۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی مجھے یہاں کا نقشہ بدلا ہوا دکھائی دیا۔ بیلوں سے ڈھکی ہوئی منڈیریں ننگی ہو رہی تھیں۔ سبزہ پامال ہو چکا تھا۔ بارش کی کثرت سے پھول دار پودے زمین پر لمبے لیٹے ہوئے تھے۔ ——— بدشگونیوں کے آثار دیکھ کر میں سخت بدحواس ہوا۔ اور حالتِ اضطراری میں جھونپڑے کی طرف دوڑا۔ مگر جھونپڑے میں بالکل اجاڑ تھی، جیسے یہاں کبھی کسی انسان کا گذر ہی نہیں ہوا۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی اور قبر کا سا سکوت تھا۔ تمام کمرے بند تھے اور بڑے کمرے کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی ——— میں کنڈی کھول کر اندر گیا۔ تو ہال کمرے میں ایک بڑی سی قبر دکھائی دی۔ جو بالکل تازہ بنی ہوئی تھی۔ اس قبر کو دیکھ کر میں کانپ گیا طرح طرح کے منحوس وسوسے اٹھنے لگے۔ دماغ پریشان اور بھاری ہو گیا۔ یکایک سامنے سے اس کا بوڑھا ملازم آتا دکھائی دیا جس کی آنکھیں کثرت گریہ سے سوجی ہوئی تھیں اور گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مغموم آواز میں کہا "حضور میرے آقا انتقال کر گئے۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا "کب"؟

اس نے جواب دیا "کل شام کو۔ اور آج صبح ان کو دفن کر دیا گیا ہے یہ انہیں کی قبر ہے اُن کی والدہ اس صدمے سے یکلخت بیمار ہو گئی تھی۔ اس لئے بڑے آقا ان کو شہر لے گئے ہیں۔ اب میں ہی صرف قبر کی نگہبانی کے لئے یہاں رہ گیا ہوں۔"

ممتاز شیریں

"انگڑائی" میری پہلی کوشش ہے اور یہ مجھے اپنے افسانوں میں بہت پسند ہے
یہ افسانہ ایک اہم نفسیاتی نکتہ کے گرد بنا گیا ہے Adolescence کے پہلے دور
میں اپنی ہی صنف کی طرف کشش ہوتی ہے پھر جیسے جیسے عمر پختہ ہوتی جاتی ہے
مخالف جنس کی کشش غالب آجاتی ہے "انگڑائی" کی "میں" ایک نوخیز پردہ دار
لڑکی ہے کچھ تو اسکی عمر کا تقاضہ، لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ مردوں سے بالکل
الگ رکھی گئی تھی۔ اسے ایک عورت سے جذباتی محبت ہو جاتی ہے اپنی کالج کی ایک
ٹیچر سے لیکن جب مرد پہلی دفعہ اسکی زندگی میں آتا ہے۔ اس کے منسوب کے روپ
میں، تو وہ اس کی طرف بے اختیار کھنچ جاتی ہے۔ وہ اپنی پہلی محبت کو بھلا ہی نہیں دیتی،
بلکہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اب تک کتنی بے وقوف رہی تھی۔ وہ اب اپنی اس ٹیچر سے
بے پرواہ ہی نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اپنے نئے محبوب کا ذکر کر کے اسے جلانا چاہتی ہے "وہ
محبت جیسے ایک خواب تھی۔ وہ ایک انگڑائی لے کر اس نیند سے بیدار ہوتی ہے اور
مسکراتی ہوئی اپنے مستقبل کا خیر مقدم کرتی ہے ایک "انگڑائی" جس میں بے اعتنائی
ہے، بے اعتنائی ہی نہیں ایک ہلکی سی تحقیر بھی گویا ماضی کی زندگی رات بھر کی تکان تھی
جسے وہ اس جسم کی تان، اور بانہوں کی لچک سے دور کرنا چاہتی ہے۔" انگڑائی "زندگی

کا بنا بنایا افسانہ ہے میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس مواد کو ایک مخصوص تکنیک میں ڈھالا ہے۔ افسانہ کا وقفہ مشکل سے ایک گھنٹہ کا ہے۔ لیکن لڑکی کی پچھلی زندگی کے واقعات کا عکس اس کے ذہنی تصورات میں نظر آتا ہے۔ خارجی اثرات مخل انداز ضرور ہوتے ہیں۔ جن سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹتا رہتا ہے لیکن یہ ایسے نہیں کہ خیالات کی رو کو دوسری ہی طرف پھیر دیں۔ اس لئے ان تصورات کا مرکز ایک ہی ہے۔ ان کا رنگ بدلتا جاتا ہے، لیکن تسلسل قائم رہتا ہے۔

"انگڑائی" ۱۹۴۲ء کے اواخر میں لکھا گیا۔ اس وقت جب میں خود اس اسٹیج سے گذری تھی۔ میرا اٹھارواں سال تھا، میں نے تبھی تبھی بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اور لڑکیوں کے کالج (مہارانی کالج بنگلور) میں یہی آخری کورس تھا۔ یہ مایوس کن حقیقت سامنے تھی کہ سکول اور کالج کا زمانہ اب بیت چکا۔ زندگی پھیکی اور بے کیف معلوم ہونے لگی۔ گھر پر بہت سخت پردے کا رواج تھا ——— مجھے نو برس کی عمر ہی میں پردہ کرایا گیا تھا۔ اور بہت پابندیاں، گھر سے باہر کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی کوئی فلم تک نہ دیکھا تھا۔ لیکن ان پابندیوں کے خلاف کبھی میرے دل میں بغاوت نہیں پیدا ہوئی۔ اور مجھے اپنے نانا سے (جن کی وجہ سے گھر میں اتنی پابندیاں تھیں) بہت محبت رہی مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ یہ سب کچھ ہمارے بھلے ہی کے لئے ہے نانا جان کی نیک اور ایثار بھری زندگی سے بہت متاثر رہی۔ ان کی میٹھی میٹھی نصیحتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ بعض باتوں میں بہت روشن خیال تھے اور تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ میں پردے سے مانوس ہو چکی تھی۔ پھر کالج کی پرکیف، خوشگوار اور کامیاب زندگی نے اس گھٹن کا احساس نہ ہونے دیا۔ جانے والی سہیلیوں کا ساتھ، اور میں سبھی ٹیچروں کی بھی "فیورٹ" تھی کیونکہ

ہمیشہ ہر جماعت میں، ہر مضمون میں اوّل رہا کرتی تھی۔ پبلک امتحانوں میں ریاست بھر کی امیدوار لڑکیوں میں اول رہی، یونیورسٹی میں اونچے درجے لئے، لیکن بی۔ اے میں فیل ہونا چاہا۔ ارادتاً امتحان کے لئے بالکل نہیں پڑھا۔ پرچے خراب کئے تاکہ کالج کی زندگی کا ایک اور سال ملے، لیکن ایک اور سال نہیں ملا۔ کامیاب ہوگئی اور کالج چھوٹ گیا ایک خلاصی، ایک بیزاری سی محسوس ہوتی تھی، جی چاہتا تھا کوئی تبدیلی ہو، زندگی ایک نئی کروٹ بدلے اور زندگی نے کروٹ بدلی۔ صمد شاہین، ایل ایل، بی کرکے تبھی لوٹے اور ہم ایک دوسرے سے منسوب ہوگئے۔ اور اسی سال (۱۹۴۲ء) ہماری شادی بھی ہوگئی میں نے شادی کے بعد ہی لکھنا شروع کیا۔

ممتاز شیریں

انگڑائی

"آپا، گلنال آپا! وہ دیکھو مچھ فنا ——— " جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساڑی کھینچ رہا تھا۔

"ارے ہٹ بھی جیب دیکھو آپا آپا ——— دیکھو تو میری ساری کا ناس کئے دے رہا ہے۔ سفید ساڑھی، کل ہی تو پہنی تھی، اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ! مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!" میں نے غصہ سے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی "نہیں تو آپا ——— مچھ فنا نچھ ہمارے لوڈپل ———" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "انہیں بلاؤ نا ——— مچھ فنا نچھ کتنی اچھی ہیں۔ اچھے دن مجھے کیک دیا تھا اور کوکو ——— کبھی اچھی کوکو ——— آپا انہیں بلالو۔ اچھی آپا!"

"ارے!" میں چونک پڑی "مس فنانس یہاں!" میں نے دریچہ کی طرف نگاہ ڈالی ہاں! وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی آرہی تھیں۔ تو انہیں بلالیجئے؟

میں نے سوچا پھر جلدی سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی، اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منہ کئے کونے میں پڑی ہے تو ایک کمرے کے عین بیچ میں، گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو! اور صوفہ! ہونہہ، یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی ——— ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جا و بے نے بڑے ہی خوشنما نقش بنا رکھے ہیں اور سیاہی کے برتنے میں تو بڑی فیاضی دکھائی میرے اللہ! ایک چیز بھی سلیقہ کی ہے؟ اُف! کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں۔ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہہ! ——— یہ کریمن بی کہاں مرگئی؟ کمبخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دے دیا کرے۔

"کریمن! او کریمن ذرا جھاڑن لیتی آنا! کیا تم نے یہ دھول بیچنے کے لئے جمع کر رکھی ہے؟" "آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اتار لوں، جل جائے گی" بھاڑ میں جائے وہ اور اسکی روٹی کمبخت ہر وقت چولھے میں گھسی رہتی ہے ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی مجھے خود شرم آنے لگی بیچاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اسی کے سر تھا ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رک گئی۔ اُف! مس فنانس کتنی نزدیک آگئی تھیں۔ !" زکیہ! زبیدہ!" میں حلق پھاڑ کر چلائی، جواب ندارد! دروازے میں جاکر دیکھا تو بس جل ہی گئی دونوں آنگن

میں موجود! زکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی۔ تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زکیہ! کچھ مدد بھی کرو گی؟ شرم نہیں آتی تمہیں یوں باہر کھڑی ہو۔" خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یونہی آج"........ پھر میرے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑی۔" آخاہ آپا! آج تو آپ کے غصہ کا پارہ سو ڈگری پر چڑھا ہوا ہے۔ اہاہا۔ ابھی اتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹمپریچر۔ دیکھو نا! ایسے مزے کی بات بتاؤں گی" منہ بنا کر تالی بجاتے ہوئے" بتادوں آپا؟........ او.......

اوں...... مس فنانس یہاں سے گذر رہی ہیں!"

"یہ تو مجھے معلوم ہی ہے، اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو، تمہیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا" تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟" اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

زکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنا گئی" کاغذ سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

"ہونہہ! میں نہیں بلاؤں گی، دیکھو تو کمرہ کتنا صاف ہے"۔ میں نے جھنجلا کر سمیٹتے ہوئے کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

"کیا کہہ رہی ہو آپا؟" زکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کئے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا۔" زبیدہ! آجاؤ اندر"

"کیوں آپا؟" زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"آ جاؤ! اگر مس فانس تمہیں دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی" میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو اور اچھا ہوگا، وہ کیوں نہ آئیں آپا؟"

"گویا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے۔! ہم ابھی سب ٹھیک کر دیں گے۔ انہیں آنے دو آپا!" دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

"کہہ جو دیا کہ نہیں بلائیں گے"۔

"اوہ آپا! مس فانس! اور اتنے دنوں کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا آخر تمہیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آئیں، ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!........ تم انہیں نہ بلاؤ! آپا تم مس فانس پر!" زکیہ سنجیدہ لہجہ میں کہتی کہتی یکایک زور سے ہنس پڑی اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "ہوں! اچھا میں جان گئی .... جب سے پرویز بھیا........"

"ارے چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے"۔ میں نے زور سے اس کے ایک چٹکی لی۔

"ہونہہ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں" میں یونہی شرمائی، لجائی، کسمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے کتنا پیارا نام ہے! ——— پرویز! جب اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں، پردہ ہوا سے اڑا جا رہا ہے اور مس فانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں

کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جونہی میں نے انہیں دیکھا، وہ مسکرا کر ہمارے گھر
کی طرف بڑھنے لگیں۔

"یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟" میں زکیہ کو جھنجوڑنے لگی۔ "اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔
دیکھو وہ آ رہی ہیں!" میں بے تحاشہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں
جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا، مس فنانس برآمدے کے بازو
والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور زکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے
لئے ہوئے ان کے پاس کھڑی تھی۔ "گلنار کو بلاؤ نا" مس فنانس کہہ رہی تھیں۔
اچانک انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا اور مسکرا کر آواز دی "گلنار!" میں
شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی ——— میرے یوں شرما جانے سے وہ
کیا سمجھی ہوں گی؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ!
انہیں کیا معلوم کہ میں اب .... مگر انہیں یہ غلط فہمی ضرور ہو گی۔ میں پہلے
بھی تو ان کے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ
کر کہیں جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی گو دل
تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے! رفتہ رفتہ میں ان سے
کھل کر بات کرنے لگی تھی پھر بھی جب کبھی ان سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی تو میری
بدحواسی نہ پوچھئے۔ وہ دن بھی کیا دن تھے! چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں
گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر میں جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا،
وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا! ہاں میں ان پہ مرتی تھی۔ انہیں دیوانگی کی
حد تک چاہتی تھی۔ اور لڑکیاں مجھے کیسے تنگ کرتی تھیں "گلنار! نہ جانے تم

کیوں مس فنانس پر مرتی ہو وہ کونسی ایسی حسین ہیں بلکہ انہیں بدصورت بھی کہا جائے
تو بے جا نہ ہوگا۔" جی چاہتا ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ مجھے
کیسی حسین نظر آتی تھیں! دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اس دن خفا ہو کر
روٹھ گئی تھی۔ گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اس دن میں نے کالی ساڑی
پہن رکھی تھی۔ اور پر پہلے سے سادہ ٹانک کر سیاہ "بوٹو" بھی لگایا تھا۔ میں اور زرینہ
ہاسٹل کے کمپونڈ میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا بھی کہیں سے آنکلی۔ "آہا۔ آج تو تم
بلا کی حسین نظر آرہی ہو گلنار!" "مس فنانس کی سی؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل
گیا تھا۔ "ہونہہ! مس فنانس!" زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔ "مس فنانس! وہ
تین مرتبہ مر کر جنم لیں تو شاید تمہارا حسن انہیں نصیب ہو!" مجھے کتنا غصہ آیا تھا
اس پر! "روٹھ گئی گل؟ اچھا بھئی وہ تجھ سے پانچ گنا زیادہ حسین ہیں! خوش
ہوگئی اب تو؟" پھر وہ قہقہہ پر قہقہہ لگانے لگی۔ اور اندرا بھی مسکرانے لگی۔ جی میں
آیا زرینہ سے لڑ پڑوں، آخر وہ کون ہوتی مس فنانس کی توہین کرنے والی! یہاں
میرا جی جل رہا ہے۔ اور وہ یوں کھڑی ہنس رہی ہے!۔ اگر ایک بات بھی ان
کے خلاف کہی جاتی تو میں زرینہ سے تو کیا کالج بھر کی لڑکیوں سے لڑنے کے لئے
تیار تھی بھلا میں ایک ہی تھی۔ کئی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور یوں تو بہت سی
لڑکیاں انہیں چاہتی تھیں۔ للتیا غریب لڑکی وہ تو مجھی کو ان کی محبت کا حقدار
سمجھتی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتی بلکہ مس فنانس کو مجھ سے
محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی! اسکے برخلاف وہ
لکشمی! حسد کی پتلی! کیا کیا جتن نہ کرتی تھی۔ کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے

اس پہ چھوڑ۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساریاں! اور انہیں کس سلیقے
سے پہننے کی کوشش کرتی۔ چھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیور بنا کر پہنا کرتی
اور بعد میں تو اس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگریالے بھی بنا لیا تھا۔ ہونہہ ان
سب جتنوں سے کیا ہوتا۔ وہ حسین تو تھی نہیں۔ مس فانس مجھی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل
مرتی۔ مس فانس کے خاص سبجکٹ "سوشیالوجی" پہ تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر
مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی؟ مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لے سکتے؟ آخر کچھ بن نہ
پڑتا تو مجھ سے غضب جلا کرتی اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگی رہتی کہ ایسی باتیں
کرے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی۔ وہ کیسے کڑھتی
تھی، کہا کرتی "ہونہہ! سرخ و سفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین کہا جا سکتا ہے۔ دراز قد
اور چھریرا بدن تو حسن کے ضروری جزو ہیں" وہ بھی خود گوری تو نہ تھی لیکن تھی دراز قد اور دبلی
پتلی مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حسن نہ تھا۔ وہ ایسی دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی
سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو۔ نہ وہ بدن کے دلکش نشیب و فراز، نہ کوئی
لچک، ناز و ادا، چپٹی بے جان لکڑی! جی چاہتا منہ توڑ جواب دوں "ہونہہ! خوبصورتی
کے لیے دلکش نقش، صبیح رنگ سے زیادہ ضروری ہیں۔ بھرا بھرا گول بدن اتنا ہی خوبصورت
ہوتا ہے جتنا نازک جسم بلکہ اس سے کہیں زیادہ دلکش" مگر میں مسکرا کر چپ ہو رہتی اور یہ
ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی کی گوری رنگت والی لڑکی کو دکھا
کر کہتی "دیکھو گلنار وہ لڑکی کیسی حسین ہے" اور اس کی بتائی ہوئی لڑکی اتنی بدصورت، اتنی کریہہ
صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی، نکٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے، بے حد موٹے ہونٹ
بھدا جسم، مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنس کر کہتی "تمہاری حسن شناسی کی داد دیتی ہوں" جیسے

ان باتوں سے کام نہ چلتا تو سیدھی ذاتیات پر اُتر آتی اور بار بار مجھے کالی کہتی حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصہ گندمی تھا .... اور زینت، وہ تو مس فنالس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی کیسی سادگی سے شکار کیا کرتی تھی "گلنار! مس فنالس تو تمہیں کو زیادہ چاہتی ہیں" اور وہ بے حد موٹی لڑکی، لڑکی نہیں بلکہ عورت .... وہ بھی تو انہیں کا دم بھرا کرتی تھی! اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی مس فنالس کو بھی بے اختیار ہنسی آجاتی - اور نلینی ....

"گلنار بی بی!" "کیا ہے کریمن؟"

"بیگم نے میٹھے ٹکڑے اور سموسے بنانے کے لئے کہا ہے وہ جو کوئی مس صاحب آئی ہے نا! بہت کام ہے بیٹی، ذرا اس روٹی کے ٹکڑے کو کاٹ لو۔ اچھی بیٹی عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔"

میں نے کواڑ کھول لے اور آہستہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنالس ادھر دیکھ تو نہیں رہی ہیں؟ امی بھی پاس بیٹھی ہوئی تھیں - وہ امّی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نظر بچا کر جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی - چاقو کو اچھی طرح صاف کر کے روٹی کاٹنے بیٹھ گئی - کریمن نے قیمہ دھو کر چولھے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ ڈال کر آٹا گوندھنے لگی۔

.... تو یہ میٹھے ٹکڑے مس فنالس کے لئے پکائے جا رہے ہیں یہ انہیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ میٹھے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انہیں بھیجے تھے، ان دنوں وہ ہمیں کالج میں پروفیسر تھیں اور جب اُن کا ٹرانسفر ہوا تھا تو میں حق حق روئی تھی، اور وہ مسکرا کر مجھے تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جاتی تھی .... پھر میا

نے۔ ودھو کر ابا کو مجھے اسی جگہ بھیجنے پر رضامند کر لیا۔ جہاں مس فنالس کام کر رہی تھیں اور ان سے جا ملی تھی دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گذر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا۔ اور اسکے بعد مس فنالس سے دائمی جدائی! میں اس کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی کاش اس کالج میں ایم اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو سال ان کے ساتھ رہ سکتی۔! پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے لئے جو جماعت میں ہمیشہ اول آیا کرتی ہو، فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی۔ اس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا، پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں——— میں کانووکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کروں گی سب لڑکیوں میں اول آنا تو میرا معمول تھا۔ اسکے الگ تمغے ملیں گے سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اوّل رہوں گی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے، اور کالج کا نام کیسے چمکے گا

——— ان کی ان امیدوں پر پانی پھرنے کی پروا نہ تھی۔

آخر وہ دن آ گیا جب امتحان ختم ہو گیا تھا۔ اور میں مس فنالس سے آخری بار ملی تھی انہیں خدا حافظ کہہ کر جب ہاسٹل لوٹی تو سیدھی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر پڑی اتنی روئی کہ تکیہ بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگا لیا اور تسلی دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی میں اور زیادہ روتی جاتی تھی! .... اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں، نیند کے غلبہ سے بند ہونے لگیں کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ! ....

"تو تم نے ٹکڑے کاٹ لئے بیٹھی ہو؟ ادھر لاؤ میں انہیں گمی میں بھگو دوں" اور

اچھی بیٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنا لینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کا حکم دیا
کیا کروں بیٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام بن نہیں پڑتا۔
ورنہ میں تمہیں کام کرنے کو کہتی؟ توبہ توبہ اس بوڑھے مُنہ میں کیڑے نہ پڑ جاتے! یہ
نازک نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑتے تھے، ان کو میں، موئی نوکرانی کام کرتے دیکھتی!
آنکھیں نہ پھوٹ جائیں" بوڑھی کرکین خوشامد کرنے لگی، میں بغیر جواب دئے قیمہ بھر کر سموسے
بنانے لگی۔

.... وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں کئی بار انہوں نے مجھے اپنے گھر پہ
بلایا تھا۔ اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں انکے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان
کی آواز میں کیسی التجا تھی "صرف ایک بار آجاؤ گلنار! میں تمہیں اپنی کار میں گھماؤں گی
فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی" میں نے بصد ناز انکی التجا کو ٹھکرا دیا تھا.......
...... اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں اسی پچاسی فیصدی!
یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں، کہا کرتیں آخر تم تو انکی فیورٹ ہو نا! ہمیں کہاں سے
ملیں اتنے نمبر"...... میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں۔ گویا ان کے منہ میں لذیذ
مٹھائی رکھی ہو جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسم کتنا محبت آمیز ہوتا
تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ انہیں مس فنالس کی بجائے
"اینجلینا" کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں "میری اینجلینا" مگر مجھے کبھی
جراءت نہ ہوتی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا لکھ دیتی
تھی۔ میرے دل کی ملکہ، میری جان، ملکہ حسن، میری آسمانی اینجلینا، اور کیا کچھ نہیں لکھا
کرتی تھی عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی میں تو! اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں انہوں

نے بھی تو ایک دن........ اُس دن میں اور للیتا ان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں للیتا نے پوچھا تھا۔ "مس فنالش آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟" "نہیں" انہوں نے جواب دیا" مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے اور اس کے لئے مردانہ سوٹ بھی سلانے والی ہوں" اور پھر اچانک میری طرف مخاطب ہو کر" کوٹ اور پتلون گلنار!" اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی: "میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد معلوم ہوں گی نا؟" میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ وہ کتنی ہی لڑکیوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوں۔ وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کر رہی ہوتیں مگر نظر مجھ پر جمی ہوتی اور نارنجی ساری میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ شاید ساری کے عکس کی وجہ سے چہرہ کا رنگ سنہری ہو جاتا اور رخساروں پر ہلکی سرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی........ اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے........

میں نے سموسوں کی پلیٹ کرمین کے آگے رکھ دی۔ کرمین انہیں نگلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی ان کاموں سے! اتنی دیر چولھے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے، ساری کے آنچل سے انہیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں مس فنالش بیٹھی ہوئی تھیں، انہوں نے آج بھی نارنجی ساری پہن رکھی تھی، کسی بات پر وہ مسکرا رہی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پر جادو سا کر دیتی تھی، اب میں بخوشی ان کے پاس جانے کو تیار تھی۔ سو فنالش میری

نظر ساری پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی اور جاوید کے ہاتھوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میں یہ ساری پہن کر کیسے جا سکوں گی؟ اتنے میں زبیدہ آ نکلی۔

"زبیدہ!" میں نے آواز دی۔ وہ توجہ کئے بغیر بھاگی جا رہی تھی۔ "زبیدہ ادھر تو آؤ!"

"ہونہہ! نہیں آؤں گی مجھے مس فنالس کے پاس جانا ہے!"

"میری اچھی منی مان لے گی اپنی آپا کی بات۔ چاکلیٹ دوں گی منی کو!"

"کیا ہے آپا؟" چاکلیٹ کا نام سنکر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اچھی منی! مجھے الماری میں سے ایک ساری لا دو نا، دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے مس فنالس کے پاس یہ پہنکر کیسے جاؤں۔ یہ لو الماری کی کنجیاں!"

"ہاں آپا، جلدی آؤ مس فنالس بار بار تمہیں یاد کر رہی ہیں۔"

.... تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعہ انہیں خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ خط پا کر کیسے خوش ہو گئی تھیں، .... اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں نا جب میں اطلاع دیئے بغیر اچانک اس کالج میں آ گئی تھی۔ جہاں وہ اب کام کر رہی تھیں میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی۔ جہاں سے میں تو انہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں اور ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیجا تھا۔ کہ انہیں اطلاع کر دے میں اس کالج میں داخلے کے لئے آئی ہوں۔ انہوں نے فرط مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔ گلنار، گلنار! گلنار یہاں کا سچ کہو؟ لڑکی نے انہیں یقین دلایا۔ "وہ کہاں ہیں بتاؤ نا؟" لڑکی انہیں بتا رہی تھی۔ ہر کس جگہ ہوں مگر وہ دیکھے بغیر گلنار، گلنار، تم کہاں ہو؟ کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ انہیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا ہی مزا

آیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"الحمد للہ کہ سب چیزیں تیار ہو گئیں۔ اب میں اس بوڑھے جسم کو ذرا آرام تو دے لوں"۔۔۔۔۔۔۔۔

کمبخت بوڑھی جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

"خدا اچھا کرے گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے"۔ کریمن باورچی خانہ میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی۔ "آہا بیٹی تم یہیں ہو۔ ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہو گی۔ میری بی بی کی! اور بیٹی! تمہارے لئے کتنی ہی دعائیں میرے مُنہ سے نکلتی ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا پر نا بابا ایسی بچی کہیں نہ دیکھی۔ ذرا سے ذرا سے تک مجھے ڈانٹ بتلاتے تھے۔ میری بی بی نے تو آب تک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن آ گئے۔ اسی لئے تو تمہارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں بیٹی صرف تمہاری شادی کی خبر سُنکر آئی تمہیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے بہت اچھا دولہا نصیب ہو۔ بھلا پرویز سے اچھا دولہا بھی کوئی ہوگا"۔ ایک ہلکی مسکراہٹ میرے لبوں تک آ گئی۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہو گیا ہو۔ اور اُنکی جگہ پر پرویز! پرویز!! پرویز!! پرویز ——— اور میں ایک حسین دُنیا میں جا پہنچی، جذبات کی ایک رنگین دنیا، ہاں نہایت حسین، کالج اور مس نالنس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو میں اپنے شوہر سے محبت بھی کر سکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی۔ میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا

"تمہارے شوہر کو تم سے بے حد محبت ہوگی"۔ تو مجھے اپنے اس ہونے والے شوہر پر کتنا رحم
آیا تھا۔ کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب؟ .... اب تو
میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہتی ہوں ....

"آپا ساری لے لو" میں نے زبیدہ سے ساری لے کر میز پر رکھ دی اور بال بنانے
لگی۔

آخر میں مس فنانس کو کیسے بھلا سکتی؟ وہ بھی تو مجھے بہت چاہتی تھیں۔ ہونہہ!
چاہتی ہوں گی۔ کبھی انہوں نے زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا؟ میں ساتھ ہوتی
تھی۔ تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں "گلنار! لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی؟" گلنار اگر پرنسپل
دیکھ لیں تو؟" لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں۔ کیا ہم نے کوئی جرم کیا تھا۔ کہ یوں ڈریں اُف
رے بزدلی! اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں تو میرے
لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ
یہ میرے پیش کئے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے تو کبھی بھولے
سے بھی میرا نام لیا تھا .... مگر وہ مجھی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں ....

ہونہہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو ہر پرچے میں اوّل آتی تھی .... لیکن
کوئی استانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھیں۔ مس فنانس تو اسّی بیاسی دے دیتی تھیں ......
ہونہہ! صرف زیادہ نمبر دے دئے تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر وہ کلاس میں لڑکیوں
کے سامنے میری تعریف کرتیں اور کہتیں۔ "دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لئے ہیں۔ فلاں نمبر
نے اتنے مارکس کئے ہیں، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، فلاں نمبر، فلاں نمبر، میں
تو بس "فلاں نمبر" ہی ہو کر رہ گئی تھی، اور وہ مس ڈیانیل جو تھیں آکسفورڈ کی ایم۔ اے۔

وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں۔ گویا ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز سوشیل! مسز جینی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لئے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں "ماشاء اللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچہ کو کئی مرتبہ پڑھا" وہ دوسری ٹیچرس اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں۔ اور مس کملا بائی بھی۔ لیڈی ٹیچرس تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے۔ فقط نہیں تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حسن کی تعریف کریں ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہدیں "گلنار! تم کتنی حسین ہو!" کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل جائے "آج تو تم بہت خوبصورت نظر آرہی ہو گلنار!" یا یہی سہی "یہ ساری تو تمہیں بہت سجتی ہے" میں اس کے لئے کتنے ہی جتن کرتی تھی۔ جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا وہی ساریاں پہنتی جو مجھے بہت بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی۔ کبھی کبھی بوٹو لگاتی۔ اچھی اچھی خوش رنگ چوڑیاں پہنتی۔ اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا۔ میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جھم کر کلائیوں پہ آپڑیں تاکہ مس فنانس کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں۔ اور جب کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آرہی ہوں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن کیا میں ایک پتھر کا مجسمہ

تھی یا نقاش کی کھینچی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش داد ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی رومانی اور جذباتی! کبھی تعریف کر دیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا؟ مانا بھی کہ وہ پروفیسر تھیں۔ تو کیا ہوا؟ آخر مسز سوشیل بھی تو پروفیسر تھیں کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اس دن جب مجھے ایک ٹیبلو میں حصہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکہ نورجہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتی ہے مسز سوشیل میرا میک اپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں گلنار! نورجہاں کی تمثیل کے لئے تم ہی موزوں ہو۔" تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو۔ مسٹر سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں وہ بھی تمہارے ٹیچر رہ چکے ہیں نا؟" پوڈر کریم اور رُوج لگا چکنے کے بعد انہوں نے کہا "اب آنکھیں اوپر اٹھاؤ ان کا میک اپ بھی کر دوں"

اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو "واللہ کتنی خوبصورت آنکھیں!!" ....

اور کس شدت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی۔ کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فنانس ہوتیں۔ آخر میں مسز سوشیل کو ہی کیوں نہ چاہتی تھی؟ مس فنانس میں کونسے سرخاب کے پر لگے تھے؟ .... اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھی! اور للیتا! وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی۔ میری آنکھوں پر! زیبی بھی کہا کرتی تھی نا "گلنار! تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ تمہاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے" سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اسی لئے تو میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔ کہ مس فنانس میری آنکھوں کو دیکھیں اور ان کی کلاس میں چشمہ بھی تو اتار کر رکھ دیتی تھی۔ گو بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں مجھے بہت دقت ہوتی تھی۔ ہونہہ! اس بے حس پیکر پر اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز! پرویز کی حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں

کا حسن دیکھ لیں گی۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھیں گے "تمہاری آنکھیں غزالی آنکھیں کتنی سیاہ! کیسی مدھ بھری!!"

.... کالج ڈے میں تو میں نے صرف اس لیے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا کہ مس فنالنس دیکھیں۔ اس دن کے لیے برنارڈ شاہ کے ڈرامہ سینٹ جون St. Joan کا انتخاب ہوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی مجھے کیسی اچھی طرح سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی مجھے یقین تھا کہ مس فنالنس آج ضرور تعریف کریں گی۔ ڈرامہ کے اختتام پر پرنسپل مس ڈیانیل، مس جونس دوڑتی ہوئی سٹیج پر چڑھ آئیں۔ اور بہت گرمجوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارکباد دی۔ کہ میں نے جون کے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کہہ رہے تھے .... یہ سب کچھ! اور مس فنالنس؟ انہوں نے تو حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا تک نہیں! پردہ کے پیچھے کھڑی ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایت دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ کہا تھا۔ کہ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ مجھے پورا بھروسہ تھا۔ کہ میرا اس وقت کا حسن اور ملتجی نگاہیں پتھر سے دل کو بھی پگھلا دیں گی۔ مگر وہ تو پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھی۔ "گلنار! کیا کروں؟ فرض کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟" واہ رے تمہارا فرض! تاہم انہوں نے پردہ کے پیچھے سے تو دیکھا تھا!

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیرے لیتی تھیں "گلنار! تم نے تو کمال ہی کر دیا" "تمہاری اداکاری کے کیا کہنے" "تم اسٹیج پر کیسی حسین نظر آ رہی تھیں گلنار!" ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری

ہاسٹل لوٹی تو سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں، وہاں بھی آپس میں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ زرینہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "میری اچھی گلنار! کالج چھوڑنے پر تم بال کٹوا کر یونہی میک اپ کیا کرو نا! آج تو تم پری معلوم ہو رہی ہو" اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی تھی۔ نیند ہی نہ آتی تھی۔ سمجھ نہ ہو! ان سب کی تعریفوں کی مجھے کیا پروا؟ کل میرا پی مس فنالنس اپنی اینجلینا سے ملوں گی۔ تو وہ یہ کہیں گی، یوں تعریف کریں گی۔ . . . . دوسری صبح ان امنگوں اور امیدوں کو لٹے ہوئے گئی۔ تو "اپنی اینجلینا" کے پاس کیا رکھا تھا، ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں!

اُف میں نے کتنی دیر لگا دی! میں نے جلدی سے بالوں کو ربن میں باندھا اور نئی ساری نکال کر زبیدہ کی لائی ہوئی ساری پہننے لگی۔

زرینہ سچ کہتی تھی "گلنار! تم اتنی رومانوی لڑکی اور مس فنالنس کی سی بے حس اور سرد مہر کہیں تمہارا جوڑ بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف . . . . ہاں، ضرور وہ جذبات سے بالکل عاری تھیں بہیں اور مردہ دل پتھر کا مجسمہ، برف کا تودہ! بھلا پرویز سے اُن کی کیا مناسبت؟ میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی بجلی ہے! تصویر میں ہی وہ کتنے رومینٹک معلوم ہوتے ہیں!! اور میں نے اُس دن چوری سے جھانک کر انہیں دیکھ بھی لیا تھا نا! جب آبا نے انہیں "سلامی دینے" "نذرانہ پیش کرنے کے لئے) کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن زرینہ بھی آئی ہوئی تھی اور جبین بھی۔ "دولہا بھائی آ گئے"! زبیدہ کی آواز آئی۔ میرا دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور جبین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ زرینہ مجھے بھی گھسیٹنے لگی۔ اُف شرم گلنار!

تم بھی اپنے دولہا کو دیکھ لونا۔" میں پہلے تو جھجکی گو میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا۔ کہ
انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ "امی کیا کہیں گی"؟ "اری امی کی بچی اٹھ ایسا زرین موقعہ
کھو دے گی؟" زرینہ نے آخر مجھے کھینچ ہی لیا۔ وہ ابا کے سامنے کیسے شرمائے شرمائے
کھڑے تھے۔ اچھا جب وہ ہال میں آئے تو ہم نے دروازے کے سوراخوں میں سے
جھانکنے کی کوشش کی کمبخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے۔ آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ
ہی گئی۔ جبین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کر دی تاکہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں
اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھینچ کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا۔
جبین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں مگر میں نہ جانے کیوں پیچھے ہٹ گئی . . . . .
"بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل!" زرینہ نے فرطِ مسرت سے مجھے گلے لگا لیا۔
میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں "میری گل! کیسا اچھا جوڑ ہے تیرا اور اس کا" وہ
میری ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے کیسی محبت
ٹپک رہی تھی! . . . . . . وہ پھر جھانکنے لگی "فارم بھی بہت اچھا ہے، اور آنکھیں
کیسی حسین ہیں۔ ادھر آ تو گل! بڑی آئی کہیں کی امی سے ڈرانے والی" زرینہ مجھے پھر
گھسیٹنے لگی "دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو؟ بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں
وہ تو!" . . . . ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا۔ اس خوبصورت چہرہ کو،
ان تبسم آمیز ہونٹوں کو، ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر
بھری تھی . . . . . . "دیوانی مس فنانس پہ مری جاتی تھی۔ آخر تو نے کیا امیدیں
باندھ رکھی تھیں اس پتھر کی سی بے حس مورت سے مسرت ہو یا رنج، غصہ ہو یا [illegible]
وہی پھیکا چہرہ وہی بے نور آنکھیں! پرویز کو دیکھ کتنا اٹریکٹیو ہے۔ اس کے چہرہ پہ

گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اس وقت وہ مجسم اضطراب نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں کس بے تابی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ میں کہیں نظر آجاؤں۔

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے کو توڑ دوں، سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے "ان" کے سامنے جا کھڑی ہو جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش میں کسی پردہ کے آڑ ہی میں کھڑی ہوتی۔ ایک لمحہ کے لئے پردہ کھسک جاتا اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انہیں دم بخود کر دیتی! ہاں وہ ضرور دم بخود ہو جاتے میں اس نیلی جارجٹ کی نقرئی باڈر والی ساری میں بہت دلکش نظر آرہی تھی نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہونہہ! میں یہ ساری کبھی پہن کر جاؤں۔ میں وہی جارجٹ کی ساری پہنوں گی جو میرے پروین کی لائی ہوئی ہے میں نے ساری کھینچ کر پھینک دی جا بھی ایسی پہن رہی تھی۔ اور زکیہ کو آواز دی۔ زکیہ ایک برتن میں سموسے لئے جا رہی تھی "زکیہ ذرا میری نیلی ساری لے آنا وہی جارجٹ کی"۔ "اچھا لے آؤں گی مگر تم جلد آنا امی کہہ رہی تھیں کہ وہ مس فنانس کے ساتھ کھانے پر نہیں بیٹھیں گی۔ ان کی بجائے تم بیٹھو تو بہتر ہے"۔

میں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی مس فنانس ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے ادھر دیکھ رہی تھیں۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں بے حد پتلے پھیکے رنگ کے ہونٹ، اور چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں۔ گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ ان کی صورت کیسی کراہیت انگیز معلوم ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اندر کھسک گئی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ کہ

دماغ پر کھنچی ہوئی تصویر ہٹ جائے...... اس کی جگہ دماغ کے پردہ پر ایک
اور تصویر ابھرنے لگی۔ پرویز کی وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی، بادامی، نشیلی،
لانبی اوپر کو مڑی ہوئی پلکیں، بیضوی چہرہ، کشادہ حسین پیشانی اور ہونٹ؟ کتنی حسین تراش تھی ان
ہونٹوں کی، رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر وہ ہلکا سا خم گویا وہ مسکرانے کے لئے ہی
بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سداماں میرے شیام اور میں رادھا
میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اٹھالی، پرویز کی، اور فرط بے تابی سے اسے چوم لیا۔ "بی بی
ساری نا؟" میں نے گھبرا کر تصویر رکھدی۔ زکیہ ساری لئے کھڑی تھی۔ "ہاں بی بی" "آپا جلدی
آؤ نا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور یہاں ساریوں پر ساریاں بدلی جا رہی ہیں۔ ادھر یہ
بے پروائی اور ادھر دیکھو تو بیچاری مس فنانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی
ہے"
"اچھا ابھی آئی" میں نے پھر تصویر اٹھالی اور سب کچھ بھول کر اسی حسین تصویر
میں کھو گئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ، نظر پہلے ان ہونٹوں پر ہی جا جمتی تھی۔
یہ ہونٹ اور ...... اُف کیا خیال آ گیا میں مارے شرم کے عرق عرق ہو گئی، میں نے
تصویر رکھدی اور ساری پہننے لگی .... ان کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی
اُف کس بلا کا سجیلا پن، گٹھا ہوا بدن یونانی دیوتا کے مجسمہ کی طرح۔ دراز قد، چوڑا چکلا سینہ
لانبے مضبوط بازو۔ ان بازوؤں میں .... اُف پھر کیسے خیال آ رہے تھے
.... جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن کیسی تیز ہو رہی
تھی! اور خون جیسے اُبلا جا رہا ہو۔ نس نس میں گرمی، آگ، اُف یہ جذبات کا ہجوم
یہ طوفان! میں بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں منہ چھپا لیا۔ یہ ہیجان، کیسی لذت تھی اس میں!

"گلنار آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" میں نے چونک کر دیکھا۔ امی کھڑی تھیں۔ اُنکا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا "مس فنانس کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں تمہیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا۔ اور وہ تو تمہاری اُستانی ہیں" امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

"تمہارا انتظار کر رہی ہیں" "تمہیں کو یاد کر رہی ہیں" "تمہارے ہی نام کی رٹ لگا رکھی ہے" "اچھا ابھی جاؤں گی . . . . . . ہاں کیوں نہیں ضرور جاؤں گی۔ یہ ساری پہن کر جو میرے پرویز نے لاکر دی۔ اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنوں گی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکالی کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ میری انگیجمنٹ رنگ P. Engagement Ring پرویز کے نام کا پہلا حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا! ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز نگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ ہاں اسی طرح جاؤں گی اور انہیں بتا دوں گی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہوں گی۔ کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منہ بسورتے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے ان کے پاس آؤں گی۔ درد بھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہونہہ ابھی انہیں کیسے حیران کروں گی ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی "ہائے کیسی خوبصورت ساری ہے" اور میں بڑے فخر سے کہوں گی "یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی خوشی سے جھومتی ہوئی انہیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں ——— شادی میں شرکت کرنے کے لئے اصرار کروں گی اور . . . . . . جذبات کی شدت کا

پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی کہ پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں
یہ سن کر تو بس جل ہی جائیں گی جلیں گی؟ ...... ضرور۔ اس وقت جب
میں چھٹی لئے بغیر گھر آئی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں "گلنار! کہیں تمہاری شادی تو نہیں
ہو رہی ہے؟" میں نے کہا "نہیں"۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا۔ "تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!"
اور جبھی تو انہوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارکباد تک نہ لکھ بھیجی تھی ....
اور اب تو میرے چہرہ پر بجائے رنج کے یہ وفور شوق، حسرت اور بیتابی دیکھ کر
کیسے جل اٹھیں گی۔ ہونہہ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!!
میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

نام - ہاجرہ مسرور

پیدائش - ۱۷ر جنوری ۱۹۲۹ء

مقامِ پیدائش - لکھنؤ

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب پڑھنے کے نام پر بٹھائی گئی تو اٹھ اٹھ کر بھاگنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ آئے دن نئے نئے ماسٹر اور مولوی چھاتی ٹھوک کر اس خاکسار۔ کند ذہن اور بدشوق لڑکی کو عالم و فاضل بنانے کا ذمہ لیتے --- دم دلاسا دیتے، دھمکیاں دیتے، کان کھینچتے، تھپڑ لگاتے، غرض جو جی میں آتا کرتے، جواب میں کند ذہن لڑکی دوات لڑھکا دیتی۔ کاپیاں پھاڑ ڈالتی قلم کی نوک توڑ ڈالتی اور زیادہ غصے میں آتی تو عالم فاضل ڈھالنے والی مشین کی گردن میں جھول جاتی یا پھر صاف گھر سے غائب ہو جاتا! --- ابا کی لاڈلی ضرور تھی لیکن اتنی نہیں کہ شیطان بنتے دیکھ کر صبر کر لیا جاتا۔ اچھی طرح کٹمس ہوتی، کھانا بند، اور بیچاری بھوکی اکیلے کمرے میں قید کر دی جاتی۔ کئی سال یہ ڈھرا چلتا رہا۔ ہر طرف سے دُور دُور فٹ فٹ --- لیکن "کند ذہن" لڑکی جب ہر روز صبح اپنے ابا کے ڈرائنگ روم میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر اردو اخبار پڑھتی، سب رسالے کتابیں آن کی آن میں پڑھ کر پھینک دیتی، پوری "قصص الانبیا" رٹی پڑی تھی --- تو اُسے یقین ہو جاتا کہ سارا گھر اس سے خواہ مخواہ جلتا ہے تبھی تو اُسے کوڑ مغز کہا جاتا ہے ورنہ ---

خیر یہ سمجھ لیجیے کہ بڑی نالائق، نہایت بدتمیز اور حد درجے کھلنڈری لڑکی تھی۔

۱۹۳۶ء میں اسکول میں ہانک دی گئی، اسکول کی تعلیم کچھ دلچسپ لگی۔ علاوہ حساب

سکے ہر مضمون میں بڑی تیز رہی، خصوصاً تاریخ میں۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں والد صاحب کی موت نے میری دلچسپی اور تیزی کا "دھڑا" کر دیا۔۔ اس سانحے کے بعد ایک سال تک سوچتی رہی، چلو اچھا ہوا، پڑھنے لکھنے سے چھٹکارا تو ملا۔ لیکن سلامت رہیں زمانے اور رشتے داروں کی آنکھیں جنہوں نے وقت سے بہت پہلے "دادی جان" کی طرح سمجھدار بنا دیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں شوریدہ سر نسیم کی روح گھس گئی اور بچپن کی ضد بھی مری نہیں تھی۔ بس محض پڑھنے کی خاطر پڑھنا شروع کر دیا۔ اکثر سولہ سولہ گھنٹے مسلسل پڑھنے میں گزر جاتے۔ والد مرحوم نے ہر موضوع پر کتابوں کا ایک خاصہ ذخیرہ چھوڑا تھا۔ لیکن خدا جانے والد صاحب کے ان بزرگ صورت دوست کو اپنی پچاس سالہ عمر میں اور کون سا علم حاصل کرنا تھا جس کے لئے انہوں نے اور بہت سے سامان کے ساتھ اسے بھی اپنی ملکیت بنا لیا۔ چونکہ وہ پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے اسلئے امانت کا مفہوم خیانت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکے۔ خیر تو اب کتابوں کی قلت نے آنکھیں دکھانا شروع کیں۔ رشتے داروں سے کتابیں عاریتاً مانگنے میں ایسی ایسی کڑوی نظریں دیکھنا پڑتیں کہ دل چاہتا بس دنیا بھر کی کتابوں کی چہا بناؤں اور مستی ہو جاؤں مگر زمانہ دلی راہ روک لیتی اس نیک کام کے سلسلے میں۔ کئی سال کی لگاتار محنت کے بعد یہ کیفیت طاری ہو گئی (اگر کوئی ہنستا تو مجھے بہت برا معلوم ہوگا)

"یعنی دیکھو خدیجہ! یہ "رویا" یعنی Dream میرا مطلب ہے کہ سپنا، بس سمجھ لو خواب ——" اور خدیجہ چڑ کر کاٹ کھانے پر آمادہ نظر آتی۔ مگر شکر ہے کہ بہت جلد یہ کیفیت کافور ہو گئی۔ اب صرف غلط سلط اردو بولتی اور لکھتی ہوں اور ہمیشہ اپنے آپ کو طالب علم سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی بلکہ ۱۹۴۲ء میں خدیجہ کی سازش سے افسانے لکھنا

شروع کئے۔ لیکن ایک بات بتاؤں کہ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی خاص خیال ہرگز نہیں
تھا۔ جب چھوٹی سی تھی تو ایک آدھ دفعہ ضرور کہانی لکھنے کا شوق چرایا تھا۔ لیکن پھر خدیجہ
کی گت دیکھ کر لیڈر اور ڈاکٹر بننے کے متعلق رات کو بستر پر لیٹ کر نہایت خاموشی سے
کشمکش کرتی تھی۔ استانی ہی بننے کا نام سن کر رونا آجاتا تھا لیکن انقلابی کام دہشت پسندی
کا دامن پکڑ کر کرنے کے خیال ہی سے ہر چیز پر پٹکّے بازی کرنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ مگر اب
تو محض افسانے لکھتی ہوں جنہیں "شریف" لوگ پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے۔۔۔ زبردست
ٹریجڈی ہو گئی نا؟

کچھ عرصے سے صحت خراب ہو گئی ہے، اگر مجھے کچھ زیادہ فکر نہیں کیونکہ زندگی میری
نظر میں اتنی پیاری نہیں جتنی کہ بوڑھوں اور بڈھے آدمیوں کو ہوتی ہے۔

(ہاجرہ مسرور)

هاجرہ مسرور

ایک بچّی

اُس دن شام ہی سے پھوار پڑ رہی تھی۔ اور بس مجھے خواہ مخواہ ہی تو اُلجھن ہو رہی تھی
ادھر چند سال سے اکثر یہی حالت رہتی تھی گھٹی گھٹی، دبی دبی بیزاری اور اُلجھن سی ——
اس پر شام ہی سے وہ ہلکی ہلکی پھوار —— مجھے ہلکی ہلکی دبی دبی کیفیتوں سے جانے کیوں
نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جھما جھم بارش ہو تو سارا پانی مکانوں کی چھتوں سے
ندی نالے کی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ ہلکی ہلکی پھوار تو ایسے غضب کی ہوتی ہے۔ کہ
بگڑے تگڑے مکان بھی ڈھے جاتے ہیں اس سے —— لاکھ کوشش کرنے کے باوجود
میں اُلجھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جتنی لمبی عمر ہوتی ہی لمبی اُلجھنیں —— سوئی میں لمبا تاگا ڈال
کر سینے لگو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں، اب میں تیس سال کے لگ بھگ ہو رہی تھی ——
بہ رہے!

میرے سرہانے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے سرد ہوا سیخ ہوا خاموشی سے داخل ہو

رہی تھی، اس پر بھی دماغ میں گویا انگیٹھی سی دہک رہی تھی ——

رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ لیکن میری گلی میں انسان تو انسان کتّے تک گم سُم ہو چکے تھے۔ اور مجھے اس وقت یہ سکوت ہمیشہ سے زیادہ کھل رہا تھا۔ اس گلی کے مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا۔ کہ میں بھی وہی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اُس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا۔

لمبے چوڑے کمرے میں برابر برابر سلیقے سے بچھے ہوئے پلنگوں پر میری ماں اور پانچوں بہنیں لحافوں میں گھسی گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی تھیں۔ چپ چاپ۔ لحافوں تلے ڈھیر جیسے میری طرح اُن سب کو بھی کوئی الجھن گھیرے ہوئے ہو۔ —— ایک کمرے میں برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ —— جیسے ہم سب قیدی ہوں، جنرل وارڈ کے مریض، یا کسی یتیم خانے کے یتیم ——

"بھئی اللہ —— بھئی اللہ ——" میرے سر میں دھمک سی ہونے لگی، اور جیسے میرے اندر رہی اندر کوئی الجھ کر جھٹکنے لگا۔ بھئی اللہ! —— سب سو گئے، سب لحافوں تلے دفن ہو گئے —— کوئی بھی نہیں بولتا، کیا سب کے سب حلق تک کھانا ٹھونس کر لیٹے ہیں جو ہوں ہاں تک کرنے کی سکت نہیں رہی —— کھائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے یہ لوگ! گویا میری کمائی تھے بھی تو حرام کی، دن بھر ڈیڑھ سو روپلّی کے لئے میں اپنا بھیجا کوڑہ مغز لڑکیوں سے پچی کروں، اور یہ سب اونگھیں مزے سے حلق تک بھر کے —— اور وہ چچا جان بھی تو نہیں آئے ابھی تک باہر سے! یہ بھی تو کچھ کم خود غرض نہیں ہیں۔ بے چارے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کے بعد اُن کی بیوہ اور بچوں کی سرپرستی کر رہے ہیں، باتوں کے چٹخنے اور کاموں کے خیال آتے

گیارہ بجے باہر سے، کون اُٹھ کر دروازہ کھولے گا، بڑے آئے چچا جان بن کر۔ یقیناً ہماری برلنے تمام جاڑا دیں بھی گڑبڑ کرتے رہتے ہوں گے جبھی تو راتوں کو باہر رہتے ہیں، بڑھاپے میں جانے کہاں چھچھوندروں کی طرح چھپاتے پھرتے ہیں۔ چچی جان کو مرے تیس سال ہو گئے جبھی سے یہ رنڈوے ہیں سکتے ہیں انہیں مرحومہ سے عشق ہے، ہاں بھئی ہوگا مرحومہ سے عشق۔ ورنہ روایت ہے کہ چچی جان زندگی بھر اُن کے عشق کی لگام اپنی طرف موڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر بھئی ہندوستانی مُردہ پرست ہیں۔ مرحومہ سے عشق ہو جانا کچھ عجب بھی نہیں، جبھی تو اس سوگ میں راتوں کو باہر رہتے ہیں ——— میں بھی مرجاؤں گی، تو سب مجھے چاہنے لگیں گے۔ کیا لڑکی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کی اور باپ کے بعد گھر سنبھال لیا ——— بھئی اللہ، اس زندگی سے تو بہتر ہے کہ مرجاؤں جلدی ——— مگر ابھی تو اُٹھ کر دروازہ کھولنا ہے ——— اللہ کرے مرجائیں چچا جان،

اور میری الجھن بڑھتی ہی گئی، روزانہ کی یک رنگی اور بے کیفی کا احساس بُری طرح چبھنے لگا۔ یہی برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ اور میری جان بہنیں اور بوڑھی ماں جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں، میز پر رکھے ہوئے لیمپ پر اپنا تکیہ کھینچ ماروں اور میز کے نیچے بیٹھی ہوئی پالتو بلی کو اُٹھا کر کھڑکی کے نیچے گلی کے سُرخ سرخ فرش پر دے ماروں تاکہ وہ اتنے زور سے چیختی ہوئی بھاگے کہ دُور تک گلی کا سناٹا درہم برہم ہو جائے ——— میری بہنیں مجھے دیوانہ سمجھ کر چیخیں مارنے لگیں۔ اور میری اماں۔ اپنی چہیتی صمت بیٹی کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اپنا سینہ کوٹ لیں،

مگر میں نے سوچا کہ یہ تو ایک بالکل فضول سی حرکت ہو گئی، کیونکہ اس کے
بعد پھر یہی گھر ہو گا۔ اور یہی سب کچھ ——— بس ایک ذرا سا ہنگامۂ آزادی
کا مذاق، جیسے الیکشن کے کرتب، جیسے نٹوں کا کھیل! جیسے ....

"بھئی اللہ ———" میرے اندر پھر کوئی پاؤں ٹیک کر ٹھنکا میں سے بیزار ہو کر کروٹ
بدلی اور میرے سر کے نیچے صبح کا اخبار کھڑکھڑایا ——— میں نے اسے اٹھا کر پلنگ کے
نیچے پھینک دیا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے بھی تھک گئی" پاکستان، اکھنڈ ہندوستان۔
——— زندہ باد برطانوی ہندوستان" میری الجھن نے ایک نئی راہ سجھائی۔ جی میں
آیا کہ بے تحاشہ برطانوی ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاؤں تاکہ میرے
پڑوس میں بسے ہوئے مختلف سیاسی عقائد کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور مجھے
بھر بھر گالیاں دینے لگیں، کتنی خوشی کی بات ہو گی ایک بار۔ تو سب کے دل پر ایک سی
چوٹ لگے۔ ایک ہی درد اٹھے ایک مشترکہ جذبہ پیدا ہو ——— اور میں اپنا نعرہ بلند
اور بلند کرتی جاؤں۔ سڑکوں پر گلیوں میں، شہروں شہروں ——— یہاں تک کہ
گاندھی جی کو اپنے اکھنڈ ہندوستان اور مسٹر جناح کو اپنے پاکستان کی ایک نمایاں
اور ٹھوس شکل نظر آجائے۔ برطانوی ہندوستان زندہ باد! مگر میری توبہ! میں
کر ہی کیا سکتی ہوں سوائے بستر میں لیٹ کر رات گئے تک الجھنے کے؟ میری زندگی
میں کوئی انقلاب نہیں ہو گا۔ خارجی نہ داخلی۔ دن بھر لڑکیوں کو پڑھاؤ ———
ہندوستانیوں کے متعصبانہ نخرے سہو۔ میری ہیڈ مسٹرس سیاست کی ابجد سے
ناواقف ہونے کے باوجود خالص اکھنڈ ہندوستانی ہیں مسلمان استانیوں کی خفیہ
پاکستانی میٹنگوں میں شرکت کرو جن میں ہندوؤں کے کفر سے نفرت کا اظہار کیا جاتا

ہے اور وہ مینگنیں جو پانی پلانے والی مہترانی تک کو دیکھ کر خندہ پیشانی سے منتشر کر دی جاتی ہیں۔ گھر آؤ تو ایک ایک کی سنو، ایک ایک کو سناؤ۔ رات کو پڑے پڑے بھول بھلیوں میں بھٹکو ——— مہینے کی پہلی کو مٹھی بھر تنخواہ، لون مرچ اور آٹا دال کے حسابات کی نذر کرتے ہوئے گرم کوٹ کی تمنا اگلے مہینے پر ملتوی کرتے جاؤ ——— لعنت ہے۔

گیارہ بارہ بجے چچا جان آئیں گے اپنے پلنگ پر اینڈا بینڈا کر ہماری سرپرستی کرنے کو تو اس لئے اٹھ کر دروازہ کھولو۔ چچا جان بقول خود خدا سے ڈرتے ہیں اسلئے ہماری سرپرستی کے لئے حاضر ہوتے ہیں ——— اور حکومت برطانیہ کو مہذب ملکوں کے ملعونوں کا ڈر ہے۔ اس لئے نیم وحشی ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتی کہ کہیں یہ ملک پتھر کے زمانے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ کانگریس اور مسلم لیگ الیکشن کے دانے پر چونچیں لڑائے ہوئے ہیں۔ میں اور میری بہنیں خواہ مخواہ ایک چھچھورے کے لئے سوچ سوچ کر مری جا رہی ہیں۔ وہ چھچھورا جسے محبت تک کرنا نہیں آتی۔ اور جسکی منگنی میرے رشتے کے خان بہادر ماموں کی ادھیڑ عمر صاحبزادی سے ہو چکی ہے۔ ——— میں نے دل شکستہ ہو کر صوبہ بنگال کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ معلمہ کی جگہ کے لئے درخواست دے دی ہے اور میری بہن نے بجائے خودکشی کرنے کے ایک مقامی اسکول میں معلمہ بننا گوارا کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ ملازمت کو عورت کی توہین تصور کرتی ہے۔ عجیب مذاق ہے یہ دنیا ——— اللہ کرے ساری دنیا میں ایسی بارش ہو جس میں ایٹم بموں کی جھڑیاں لگ جائیں ——— مگر بھئی نہ جانے امریکہ اور برطانیہ کے دو گدھوں نے ایٹم بم کے راز سے اللہ میاں کو واقف بھی ہونے دیا ہے؟

میرے سر کے اندر دھک دھک سی ہونے لگی نہ جانے یہ دل اس قدر پاؤں

چلا کیوں ہے؟ کبھی کہیں دھک دھک ہو رہی ہے کبھی کہیں ـــــ میں نے اپنا سر اُٹھا کر تکیوں پر دے مارا۔

"پتھیاں بھرت بھرت میں ہاری، ہو موری بہنیاں پرائی" گلی سے جیسے کوئی نشے میں لہکتا ہوا گزرا مست اور بے پرواہ۔ اور مجھے بھی یوں لگا جیسے میری باہیں بھی تھک گئی ہیں بیکار سینے پر پڑے پڑے ـــــ پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پہ ہالہ بنانے بناتے ـــــ چولھے میں جائیں۔ یہ بیہودہ خیالات۔

ہاں تو پھر اے اللہ میاں میری عرضی بنگال میں منظور کرا دو بس وہاں پہنچ کر اپنی موجودہ ماتحتی کارِ عمل خوب دل لگا کر کیا کروں گی۔ اور فرصت کے اوقات میں صرف روحانیات پر کتابیں پڑھا کروں گی۔ اللہ کرے میری عرضی منظور ہو جائے۔

کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ دروازے کی زنجیر کھڑکھڑائی جانے لگی ـــــ کنجی ہولے ہولے کھڑکانا، ہو راجہ دھیرے دھیرے آنا، میرے دل میں پیار امڈ و دھڑ تلملایا مگر دروازہ تو چچا جان کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اللہ کرے کبھی دن ہمارے ہاں ڈاکہ پڑے اور لمبے تڑنگے ڈاکو اس گھر کی سب عورتوں کو زبردستی اُٹھا کر لے جائیں۔

کھٹ کھٹ ـــــ

نوجوانی کی نیند آ گئی فیضو کو۔ اور کوئی بھی نہیں اُٹھتا۔ نہ اُٹھے۔ میں بھی نہیں اُٹھنے کی۔ چاہے سردی سے اکڑ کر دم نکل جائے ان کا میری جوتی کی نوک سے ـــــ اور گھومیں آدھی آدھی رات تک۔

کھٹ کھٹ ـــــ

شرم نہیں آئی کنواری بھتیجیوں کا آدھا درجن رکھے بیٹھے اسے کہاں تباہی

اتنی دیر؟

فیضو کو شاید رحم آ گیا

"جاگ رہی ہو زاہدہ ——— ہاں ابھی رات بھی کتنی گئی ہے"۔ چچا جان نے میرے پلنگ کے قریب آ کر کہا۔

"ہوں! ———" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ مٹھائی"۔ انہوں نے رومال کی پوٹلی میرے لحاف پر پھینک دی اور سب لحافوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ "بچیوں میں بانٹ دو۔" وہ اوورکوٹ اتارنے لگے۔

لبستروں سے سر بلند ہوئے، جیسے واقعی سب بچیاں ہی تو ہیں۔

"ادھر لاؤ کیا ہے حضرت آپا جانی! ——" تقاضہ ہوا تو مجھے غصہ آ گیا اِس چھچھورے پن پر۔ میں نے پوٹلی اماں کے لحاف پر اچھال دی۔

"کیا بخارات دماغ کو چڑھ گئے آپا جانی؟" ساجدہ نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔

"نہیں تو کوئی بات نہیں ——— " میں نے اپنی تلخی کو دبا کر کہا۔ میں کبھی کبھی ان سب سے دبنے لگتی ہوں ——— مٹھائی کے حصے بخرے ہونے لگے اور میں نے لحاف منہ پر ڈال لیا۔ میری الجھن اس چاؤں بھاؤں میں اور بھی بڑھ گئی ——— اور میں نے طے کر لیا کہ بنگال ضرور جاؤں گی۔ بنگال کا جادو مجھ پر نہیں چل سکے گا۔ سنا ہے، بنگال کے مرد تو اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ اپنے ہاں کی مشہور اور معقول پیداوار "بنگال کے جادو" پر بھی بڑی آسانی سے غیر بنگالیوں کا قبضہ گوارا کر لیتے ہیں۔ "ہونہہ! میری جوتی"۔ تو بہت حیدو

ہے مجھے کیا ڈر ہے؟ بس اطمینان سے مچھلی بھات کھاؤں گی ـــــ اور ـــــ بنگال کا فلاں قحط تو ختم بھی ہو چکا۔

"ایک بچی لوگی ـــــ تم میں سے کوئی؟" چچا جان نے پوچھا۔ میں ایک دم بستر سے اُبل پڑی اور میری طرح میری سب بہنیں بھی۔ مگر اماں کو جیسے مٹھائی کھاتے کھاتے اُونگھ سی آگئی۔

"دھی لوگی دھی" گوری سی گھوسن میہنہ سے ہر روز پوچھ جاتی ہے۔

"جی! ـــــ جی ہم سب نے کورس میں کہا۔

"دو کسی کال کے مارے بنگالی کی اولاد؟" اماں نے پوری طرح بُرا مانتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے نہیں بھابی، ان کنگلوں کی اولاد لے کر کیا کرنا ہے ـــــ" چچا جان کی عزت پر جیسے حرف آگیا۔

"واہ آپ قحط کی وجہ سے ہی بنگالیوں کو نیچ سمجھتے ہیں جو سرمایہ داروں کا لایا ہوا ہے۔" زہرا بالکل پنڈت نہرو کے انداز میں گرجی۔

"مگر جناب کال کے مارے لوگوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اُن کے لال چھین لینا بھی تو انسانیت کی توہین ہے۔" فاطمہ جسے گدھوں جیسی سنجیدگی کے ساتھ ہائی اسکول کی طالبہ ہونے کا فخر ہے، بھن بھنائی۔

"اور بھوک کے مارے باپ کی گود میں ایک بوند دودھ کے لئے دم توڑتے ہوئے بچے دیکھتے رہنا عین انسانیت ہے۔" ساجد بے تکے پن سے ہنستے ہوئے چلائی بیچارگی کو اپنے پچھلے ہوئے دبانے کی ہنسی بہت عزیز ہے۔

سب کے سب زور سے ہنس پڑے۔ جیسے لطیفہ ہی تو ہو گیا ہو۔

"لاحول ولا ــــ!" چچا جان کی میٹھی موٹی آواز نے سب کو خاموش کر دیا۔ "تم لوگ تو ہر موقعے پر اپنا اپنا تصنیف کردہ فلسفہ جھاڑنے لگتی ہو"۔

ساجدہ ہنسنے لگی۔ فاطمہ نے گھٹنے ٹکا کر جھوٹ موٹ نامناسب سمجھا اور فاطمہ کو اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں گرہ دینا یاد آ گیا۔ باقیوں نے محض مسکرانے پر اکتفا کی ــــ اور میں سوچنے لگی۔ کہ "ایک بچہ ــــ ایک بچہ مجھے مل جائے تو ــــ" میری نسائیت کی گود میں مامتا ہمکنے لگی۔ "ارے امیں جھینپ سی گئی ــــ" دھت ــــ خان بہادر کا داماد ہی کرمنت ہے چیز کہیں کا۔ میں تجھ سے کہیں بلند ہوں، میں غیر کی اولاد کو بھی اپنا سکتی ہوں ــــ" کھسیانی بلی کھمبے پہ جھپٹی۔

باہر بارش کی ہلکی ہلکی پھوار ننھی ننھی بوندلیوں میں تبدیل ہو گئیں اور سائبان پر جیسے کوئی گیت گنگنانے لگا۔

"وہ بچی شریف کی اولاد ہے سمجھیں تم لوگ!" چچا جان نے زوردار سفارش کی۔

"تمہاری ہی شرافت کا نتیجہ نہیں ہے میاں" اماں نے ہنس کر چھیڑا اور بھتیجیاں کھلکھلا اٹھیں۔ میرے دل میں جیسے سمندر کے کھاری پانی کی ایک لہر سر اٹھا کر لپکی کہ کہیں سچ مچ وہ چچا چچا جان کی ریاضت کا پھل تو نہیں؟

"خدا کی قسم آپ تو مذاق کرتی ہیں بھابی جان! وہ اپنا سفید بالوں سے ڈھکا ہوا سر جھکا کر شرمائے اور مجھے اس قدر بھلے لگے کہ میں بھی شرما گئی"۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"کس کی بچی ہے وہ۔ کیوں چچا جان! ــــ"

"ایک غریب آدمی کی، اسکی بیوی کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے اس نے ——— دودھ پیتی بچی چھ مہینے کی ہے۔ وہی مل جائے گی" چچا جان اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ "کوئی پرورش کرنے والا نہیں اس بچی کا ——— باپ بیچارہ بنئے کا ملازم ہے۔ کہاں بچی کو سنبھالتا پھرے۔ بڑی لڑکی پانچ برس کی ہے، اور لڑکا تین برس کا ———"

"لڑکا مل جائے مجھے ———" اماں کی حسرت زبان پر آ گئی۔ حد ہے آدھی درجن لڑکیاں اور لڑکا ایک بھی نہیں۔

"لڑکا تو نہیں دے گا وہ ——— اسکی نسل چلے گی اس سے" انہوں نے کاروباری انداز میں ٹکا سا جواب دے دیا اور میں سوچنے لگی کہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے ہمارے لیڈر اس مسئلے کا حل کیوں نہیں کرتے، کہ نسل لڑکی چلاتی ہے یا لڑکا؟ کیونکہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کا بنیادی تعلق براہِ راست اسی مسئلے سے ہے۔

"تو پھر لڑکی لے کر کیا کرنی ہے اور پھر دودھ پیتی بچی ———" اماں کی دلچسپی ختم سی ہو گئی۔

"بڑی لڑکی بھی ملے گی اسکے ساتھ؟" فاطمہ نے بقول خود "اعتذریانہ" (عذر کرتے ہوئے) جھوٹے سوال کیا۔

"نہیں پلی پلائی بچی نہیں دے گا، چار دن بعد اسے گھر میں برتن کپڑے کی امید ہو گی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا فائدہ جب تک بچی کے ساتھ بڑی لڑکی نہ ملے، جو کم از کم بچی کا گو موت تو

کرہی گی۔ چند دن بعد اور کچھ نہیں تو گود میں ٹانگے ٹانگے پھرے گی اسے چھچھڑا لے کر کون برسوں کی مصیبت مول لے۔" ناظمہ نے لیٹ کر لحاف گردن تک اوڑھ لیا۔

"میں لوں گی۔" ناظمہ کے مقابلے میں اپنی آواز مجھے کتنی بھلی لگی اور ناظمہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ وہی زاہدہ ذراسی بچی پالنے کو تیار ہے، جس نے کبھی اپنی چھوٹی بہنوں کو گود میں اٹھانے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔

"میں بھی لے سکتی ہوں۔ کیا قیمت ہوگی؟" ناظمہ پر ضد سوار ہوتی۔

"تم ہو انسان کی قیمت ادا کریں گی امیرزادی!" میں نے جل کر کہا۔

"چپ رہو ناظمہ! آپا جان کے نزدیک انسان کی کوئی قیمت نہیں" —— ساجدہ نے اپنے مخصوص بے تکلے پن میں ہنستے ہوئے کہا۔ اور میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر دو دو تھپیڑ لگاؤں ان لڑکیوں کے —— چھوٹی ہو کر —! میری ساری آزاد خیالی اور ترقی پسندی بے جان سی ہونے لگی۔

"اس بچی کو پال لو، بس یہی قیمت مقرر کی ہے اسکے باپ نے!" —— چچا جان نے دلال کا حق ادا کیا۔

"اے اللہ ہمارا ملک! اللہ کرے یہاں بھی اشتراکی نظام قائم ہو جائے جلدی سے ——" ناظمہ کی آواز بھرا گئی "بیچارے بچے اور ان کے والدین —— جو اسے اشتراکیت پر مجبور رکھنے کا دھوکی ہر وقت اکسایا کرتا تھا۔

"اور تمہارا سر ——" زہرا کی قنوطیت گرما ہوئی "ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس بڑی بڑی شو کھو اور اپنے اندر ایک کمیونسٹ کو مٹا کئے جاؤ"

"آپ کل صبح بچی کو مجھے دکھا دیجئے۔ میں اسکی پرورش کروں گی" میں نے فیصلہ

کن انداز میں اعلان کیا ...... میں نے سوچ لیا تھا کہ بنگال جا رہی ہوں فینٹیس کے لگ بھگ ہوں شادی کرنا نہیں یا یوں کہو کہ شادی کرے گا ہی کون اس بڑھاپا سے، یہ بچی مل جائے تو مستقل کنوارے رہنے کی شاندار وجہ پیش کر دیا کروں گی ——— اور پھر میرے لئے بھی زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہو جائے گا ——

باہر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا کرو گی بچی لے کر؟ تمہارے لئے اتنی بہت سی بہنیں کیا کم ہیں پالنے کے لئے" اماں نے میری دوڑتی ہوئی گاڑی کے آگے ایک پتھر لڑھکا دیا۔

"جی!" مجھے رونا سا آ گیا "میری بہنیں ——— میں انہیں پالتی رہوں چاہے یہ سب مجھے جوتی کی نوک پر بھی نہ رکھیں۔ میں کسی سے کوئی گلہ نہیں کرتی۔ مگر یہ ضرور چاہتی ہوں ——— میں چاہتی ہوں" میری آواز بھرانے لگی۔ آنکھیں جل اٹھیں کنپٹیاں دل کی طرح دھڑکنے لگیں۔

"ملکیت کا جنون انسانیت کو تباہی کے غار میں دھکیل کر رہے گا" ناظمہ جوش کے ساتھ بولی "آپ بچی کو اس لئے پالیں گی کہ اس پر آپ کو پورا اختیار رہے ——— مارکس کہتا ہے ——— "

"چپ رہو مارکس کی نانی ——— " زہرا چڑچڑائی "آپا جان ہمیں روپیہ دیتی ہیں اسی لئے اب ہمیں ذلیل سمجھنے لگی ہیں۔ ہماری بدنصیبی اس سے پہلے کہ ہم کسی لائق ہوتے ابا مر گئے۔ خیر اطمینان رکھئے ہم اپنا بوجھ نہیں رہنے دیں گے آپ پر ——— "

"اپنی چونچ بند کیجئے مستقبل کی گستاخی جی" ناظمہ بھی زہرا پہ

"صبح اللہ! میرا جی چاہا اپنا سر پھوڑ لوں ——" میری حالت کا کسی کو اندازہ نہیں مجھ سے کسی کو ہمدردی نہیں۔ میں کسی سے بھی اپنا دکھ درد نہیں کہہ سکتی اور اگر کہوں تو سب مجھے نکو بنا لیتے ہیں —— یہ ہے میری قسمت ——" میں پوری یکسوئی سے رونا چاہتی تھی۔

"سچ سچ ——" ناظمہ نے کروٹ بدل لی۔ میرا جی چاہا اسی وقت خودکشی کر لوں........

"تو پھر وہ بچی!" ناظمہ نے اصل موضوع کو پکڑا "آپ کل ضرور اسے دیکھ لیجئے آپا جان"۔

"ہاں کل اسے لے آؤں گا۔ بڑا ثواب ہوگا اسے پال کر، دستوں کی بیماری میں مبتلا ہے۔ علاج ہو گیا تو ٹھیک ہو جائے گی ——" چچا جان بولے

"عذاب ہو جائے گی نگوڑی ——۔ جو بھی لے اپنی ذمہ داری پہ لے مجھ سے اب بچوں کی چھیا لیدر نہ ہو گی۔ صاف بات ہے" اماں نے پھر ایک پہاڑ لڑھکانے کی کوشش کی "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اسے نہیں پال سکے گا بڑے دل گردے کا کام ہے بچے پالنا۔ ابھی تم لوگوں کو شعور ہی کہاں ہے"۔

"اماں جان! آپ کے ہاں آپا جان کوئی چودہ سال کی عمر میں پیدا ہوئی تھیں نا؟" ناظمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ زہر چھڑکتی۔ اماں تپ کر چپ ہو گئیں۔

"اگر وہ خوبصورت ہو تو آپ ضرور لے لیجئے" ساجدہ جلتے ہوئے بولی —— "گھر بھلا لگے گا بچے سے"۔

"اسکے باپ سے پکے اسٹامپ پر لکھوا لیجئے گا کہ اس نے ہمیشہ کے لئے دے

دی۔ اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا۔"۔۔۔۔ ناظمہ بولی۔

"اچھا اچھا آزجانے دو۔ لڑکی ذات ہے چار دن میں پڑھ کر اس لائق ہو جائیگی کہ گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی۔ آپا جان کے پاؤں دبا دیا کرے گی"۔۔۔۔ زہرا بولی۔

"ہاں بڑھاپے میں کچھ تو سہارا ہو گا ان کا" ناظمہ نے کہا۔

"لعنت ہے سب پر۔ ایک معصوم بچی کے لئے غلامی کا جال بُن رہی ہیں لیس سے تو مرجاتے وہ۔۔۔۔" ناظمہ چلائی۔

"اپنی اپنی رائیں محفوظ رکھئے آپ لوگ۔۔۔۔" مجھے ایک دم تاؤ آگیا" تمیز بھی ہے بات کرنے کی۔۔۔۔ چچا جان! صبح بچی کو ضرور لے آئیے" میں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"اچھی بات ہے۔ اب سو جاؤ سب۔ رات کافی ہو گئی" چچا جان نے لحاف سے منہ ڈھک لیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر بارش کا شور بڑھ رہا تھا "میاؤں۔۔۔۔ میاؤں۔۔۔۔" پالتو بلی میرے پلنگ کے نیچے گھوم گھوم کر گویا اظہار خیال کرنے لگی۔ میں نے اپنا جسم تکیوں پر گرا دیا۔۔۔۔ ٹھنڈک کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔

ایک ننھی سی بچی، ہنسی کھیلتی، ہاتھ پاؤں مارتی میرے احساسات پر چھائے جا رہی تھی۔۔۔۔ زندگی کی تمام محرومیاں اور ناکامیاں جو کانٹوں کی طرح کھٹک رہی تھیں ذہن میں یوں دب گئیں جیسے تھیں ہی نہیں۔

میری ٹھنڈی آنکھ دہکنے لگی۔

میں اسے لے کر بنگال چلی جاؤں گی —— ایک آیا رکھ لوں گی تاکہ وہ دن بھر اُسے اٹھائے اسکول میں میرے سامنے رہے اسکول سے واپس آکر میں بچی ہی کے کاموں میں لگ جایا کروں گی اسے اچھی طرح نہلا دھلا کر خوبصورت بھلے ہوئے کپڑے پہناؤں گی۔ کنگھی کروں گی۔ اور پھر صفائی سے دودھ بنا کر اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔ میں خود بنگالی عورتوں کی طرح ایک ہلکی سی دھوتی میں اپنا پورا جسم لپیٹ کر، بال کھول کر، ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر اسے جھولا جھلایا کروں گی، رات کو اپنے پہلو میں لٹا کر لوری دیا کروں گی۔ آجا ری نندیا تو آجا ذرا —— بٹیا کو میری سلا جا ذرا۔ وہ میرے سینے سے لگی آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسکراتی ہوئی سو جائے گی —— زلف بنگال کی سی سیاہ راتوں میں جب میں کوئی خواب دیکھ کر چونکوں گی۔ تو میں تنہا نہیں ہوں گی بلکہ وہ میرے سینے سے لگی ننھی ننھی سانسیں لے رہی ہوگی —— آہ میرے اللہ!

اور پھر میری ننھی تھوڑے دنوں بعد بولنے لگے گی۔ میری باتیں سمجھنے لگے گی —— میں ہنسوں گی تو وہ قہقہے لگائے گی۔ میں روؤں گی تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے گی۔ جب کبھی کچھ سوچ کر میں سو جایا کروں گی تو وہ میرے چہرے کو اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبا کر اپنی فکر مند آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر، وجہ پوچھا کرے گی۔ پھر میں اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا کروں گی —— میری ننھی! میری بچی! —— کتاب اٹھا لاؤ۔ میں تمہیں پڑھاؤں گی۔ اور میری ننھی نہایت فرمانبرداری سے فوراً اپنا بستہ پڑھوا لا کرے گی —— اللہ! میری ننھی مجھے مل جائے ——" میرا دل جانے خوشی کے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ سنو بچی تم لوگ! میں نے سمر

اُٹھا کر مارے خوشی کے سب کو اپنا اونچا مکان دکھانا چاہا۔" میں بچی کو صرف اس لئے لے رہی ہوں کہ اسے اپنی بچی سمجھوں سمجھی تم لوگ؟ خواہ وہ کالی کلوٹی ہو — خواہ اس کا نقشہ باورچی خانے میں بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں کی طرح ہو — میں ماں بن کر اُسے پالوں گی — میں اسے اپنے ساتھ بنگال لے جاؤں گی — میری زندگی اس کے لئے وقف ہے" — میرے مکان کے کنگورے آسمان کو چھونے لگے "ہوں — ہوں!" میری چھوٹی بہنیں اس طرح ہوں ہوں کرنے لگیں جیسے میں کہانی ہی تو کہہ رہی تھی۔

"تم لوگ کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں اتنی قربانی نہیں کر سکتی ایک بچی کے لئے؟" مجھے غصہ آ گیا،

"ہیئر ہیئر!" ساجدہ نے تالیاں بجائیں،

"بدتمیز کہیں کی کمینی! —" میری زبان مارے تاؤ کے اینٹھ کر رہ گئی۔

"زاہدہ" اماں نے پکارا۔

"کہئے" میں نے شمشیر بکف انداز میں جواب دیا۔

"بچی سے محبت کرو گی، اسکے لئے زندگی وقف کر دو گی تو دنیا کیا کہے گی؟" — اماں نے بزرگانہ لہجے میں پوچھا،

"کیا کہے گی دنیا — میں پروا نہیں کرتی"۔

"یہی کہ تمہاری حرامی بچی ہے پڑھی لکھی لڑکیوں کا نام پہلے ہی بدنام ہے"۔

اڑا اڑا دھم — میرا مکان ڈھینے لگا،

ریل چھوٹ گئی — میں خالی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور کانوں میں انجن سنسنا رہا تھا، میں چپ ہو گئی۔ میں اُسے اپنی بچی سمجھوں گی۔ اور کہوں گی — لیکن کوئی یاد کہہ

دے گا تو — کوئی اور بھی سمجھے گا تو — میں تو ڈوب کر مرجاؤں — میرے کنوارے رہنے پر تو خواہ مخواہ کلنک لگ جائے گا۔" ممکن ہے بنگال میں کوئی بہرا چاہنے والا منتظر ہو، ممکن ہے۔ — مگر حرامی بچی کا ٹیکا دیکھ کر کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کرے؟" شادی کی دبائی ہوئی خواہش نے پھر لو بیدار کیا۔

"بھئی اللہ — بھئی اللہ —" میں پھر الجھنے لگی۔

باہر پھوار گر رہی تھی —

سوالنامہ

۱ آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی ؟
۲ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟
۳ جدید اُردو افسانہ نگاری میں جنسی تجزیے کی رَو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟
۴ آپ افسانے میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہیں، یا کردار نگاری کو، یا دونوں کو؟
۵ آپ کے فن پر غیر ارادۃً کس افسانہ نگار کی زبان اور بیان اثر انداز ہوئے ہیں؟
۶ اپنے فن کا موجودہ اسلوب اپنانے میں آپ نے ارادتاً کیا کیا کوششیں کیں؟
۷ اپنے فن کے بارے میں آپ نے مستقبل کیلئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے ؟
۸ کیا آپ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں ؟

۱۔ آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی ؟

تسنیم سلیم :۔ ادب برائے زندگی کی ۔۔ اور ادب ہی کیا ، میں دنیا کی ہر چیز میں زندگی کی متلاشی ہوں ۔ ادب پارے اس لئے پڑھتی ہوں کہ وہ زندگی اور زندہ رہنے والوں کا ثبوت ہیں اور خود افسانے اس لئے لکھتی ہوں کہ یہ میری اپنی زندگی کی علامت ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ میرے پیش نظر ادب کی نہیں ، بلکہ خود اپنے دماغ کی خدمت مقصود ہے ، اگر محض ادب کو فروغ حاصل ہو ، اور میرے دل و دماغ کو سکون نہ مل سکے ، تو یقیناً میں کتابیں پڑھنا اور افسانے لکھنا چھوڑ دوں ۔

حمیدہ سلطان :۔ میں ادب برائے ادب کی قائل ہوں ، یوں تو زندگی کے تلخ حقائق کہانیوں میں سما نہیں سکتے ، لیکن میرے خیال میں یہ ضروری ہے ، کہ زندگی کے کسی رُخ کی بھی تصویر کہانیوں میں دکھائی جائے ۔

خدیجہ مستور :۔ میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں ،

زہرہ جبیں :۔ ایسا ادب جو ہماری زندگی سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق نہ رکھتا ہو ،

بے معنی اور بیکار ہے۔ ہر زمانے کے ادب کو اس عہد کی زندگی کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ اس
حقیقت پسندی کے دور میں ادب کو محض تفریح اور حظ تک محدود رکھنا اس کے اصل
مقصد سے انحراف کرنا ہے۔

سحاب قزلباش:- آج سے چار سال پہلے میں ادب برائے ادب کی قائل تھی مگر اب شاید مجھے تھوڑا سا احساس پیدا ہوا ہے یا پھر ہمارا آج کل
کا ادب جیسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چٹکیاں لے رہا ہے، نکیلے نکیلے ناخونوں سے ___ شاید
اب ہمارا ادب بھی زندگی کے دوش بہ دوش ہمیں منزل پر چھوڑ آئے۔ میرا ایک شعر ہے ؎

زندگی کو زندگی کی راہ چلنا چاہیئے
وقت کے ہمدوش ہر پہلو بدلنا چاہیئے

اب چونکہ ہمارا ماحول ہمیں خود سر بنانے کی کوشش کر رہا ہے، ہمارے جذبات کا گلا
گھونٹا جا رہا ہے، خودداری مٹتی جا رہی ہے اور ہم اب محض زندہ لاشیں ہیں، جن میں سکت
نہیں۔ اور جن کی پیلی پیلی جلد کے اندر ہڈیوں کے ڈھانچے کے نیچے ایک پسا ہوا دل اور
دبا دبا سا سانس ہے ___ ایسے ماحول میں ہمیں ضرورت ہے کہ ان ریشمی پردوں کے پیچھے
آرام گاہوں میں بیٹھے ہوئے مطمئن لوگوں کے دل ہلانے کے لئے ایسا ادب پیش کریں جو
زمانے کی بدلتی ہوئی راہگذر پر سسکتی ہوئی لاشیں لاکر ڈال دے، جہاں بھولی بسری انسانیت
انسانیت کے ڈھانچے کو ٹھٹھک کر پہچاننے لگے۔ جہاں انسان، انسان ہی کے خون آرزو
سے اپنے چہرے کی سرخیاں شفق میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ کرے، ادب کے زخمی
ہاتھوں میں پڑے ہوئے کیڑے، رینگتے تازہ خون کے متلاشی ریشمی پردوں کے
پہنچائے ان گرم گرم بستروں پر اطمینان کا سانس لیتی ہوئی ہستیوں کے کانوں کے ذریعے

ان کے دل و دماغ کو کھول کھلا کر سکیں، اس وقت وہ شاید اپنی تکلیف کا احساس کرتے ہوئے ان ریشمی پردوں سے ان سسکتی ہوئی لاشوں کو دیکھ سکیں ــــــ اور پھر شاید ہم سب کی نگاہیں ایک ساتھ تکلیف دہ مسرت محسوس کر سکیں۔

سنجیدہ اشرف:- میرے خیال میں ادب زندگی کے لئے اور زندگی کی پیچیدہ گتھیاں ادب کے لئے ضروری قرار پا چکی ہیں اور ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اگر ادب زندگی میں فکری گہرائی، بلند نگاہی اور جذبۂ انسانیت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے، تو زندگی کی کھلی حقیقتیں بھی ادب کو انسانیت سے بہت قریب کر دیتی ہیں، ادب ہمارے سامنے زندگی کی الجھی الجھی باتیں، ڈھکے چھپے زخم، اچھائیاں اور برائیاں تصور کے پردے پر فلمی تصویروں کی طرح نمایاں اور رقصاں کر دیتا ہے۔

سیدہ اشرف:- میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں، ادب برائے نشاط یا ادب برائے ادب میرے نزدیک تقریباً بے معنی چیز ہے، ادب زندگی کا عماد ہے، اس لئے ادب کو بھی ٹھوس حقیقتوں کا حامل ہونا چاہیئے۔ اور زندگی سے قریب تر ــــــ اب لیے محاسنِ زبان و بیان اور نزاکتِ خیال، تو ایک کامیاب فنکار ان چیزوں کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

شائستہ اختر سہروردی:- ادب اور زندگی کا بلکہ کل فنونِ لطیفہ اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ادب کی عمارت زندگی کی بنیاد پر ہی کھڑی ہوتی ہے اس لئے اس سوال کا جواب دینا بڑا مشکل ہے کہ میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں یا ادب برائے ادب کی، کیونکہ میری رائے میں تو ادب اور زندگی کو جدا کرنا ہی ممکن نہیں، ان کا تو جسم اور روح کا تعلق ہے اور یہی ادب زندہ رہتا ہے

جو زندگی کا آئینہ دار ہو،

لیکن میں ادب میں واعظانہ اخلاق آموزی کا بھی قائل نہیں ہوں، بلکہ جو لکھنے والا
ارادتاً اپنی تخلیق کو واعظانہ رنگ دیتا ہے، وہ ادیب کا درجہ حاصل کرنے سے قاصر رہ
جاتا ہے۔ دنیا کے ادبی شاہکاروں سے بڑھ کر کیریکٹر کو واضح اور عمیق کرنے کا بہترین
ذریعہ اور کوئی نہیں، سوفوکلیس، یوریپڈیز اور شیکسپیئر کے ڈرامے اور چل اور ہارڈی کے بیک
یہاں تک کہ شیلی کی شاعری تک اخلاق کی پیامبر ہے۔ لیکن وعظ کے رنگ میں نہیں۔

ادب کا کام زندگی کی آئینہ داری ہے اور آئینہ داری کا مقصد زندگی کے ہر ایک
رنگ کو اجاگر کر کے دکھانا ہے۔ اسی لئے اوتھیلو میں ایاگو کی فتنہ پردازی کامیاب ہوتی ہے
اگر اوتھیلو واعظ کا وعظ ہوتا تو یہ نہ ہونے پاتا، خاتمہ ٹریجیڈی کی بجائے کامیڈی پر ہوتا
لیکن اوتھیلو زندگی کا ترجمان ہے اور زندگی میں معصومیت بہت دفعہ بہت زیادہ
دفعہ مجروح ہوتی ہے۔ واعظ برائیوں کو چھپا کر لوگوں کو نیکی کی طرف آمادہ کرتا ہے اور کہتا
ہے کہ نیکی کرو کیونکہ نیکی میں فائدہ ہے، فن کار کہتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اور اس طرح ادیب زیادہ اعلیٰ و ارفع اخلاق کا پیغامبر ہے۔ اور پھر اس طور سے
اخلاق کی پیامبری کسی کا کام نہیں، اس کا کام تخلیق اور مصوری ہے اور شاہکار حیات
کا مصور ہے، اگر اس کے توسط سے زندگی کی صحیح تصویر کھنچ گئی۔ تو پھر وہ ادب بھی ہوگا
اور اخلاق بھی،

اردو ادب گزشتہ سالوں میں اخلاق آموزی کے بارے بری طرح پامال ہوا، چونکہ

انیسویں صدی کے اواخر سے مسلمانوں میں اصلاح اور تنظیم کا شور اٹھا۔ اور اکابرین قوم کی
تمام تر کوششیں قوم کے سدھارنے میں صرف ہونے لگیں۔ اس لئے ادب بھی اس کی زد
سے محفوظ نہ رہ سکا، ناولسٹ اپنے ناولوں میں، ڈراماٹسٹ اپنے ڈراموں میں اور شعرا
اپنے اشعار میں اخلاق کی درستی اور معاشرت کی اصلاح کی کوشش میں لگ گئے، جہاں
ان کی قوتِ تخیل اور قوت تخلیق ان کے واعظانہ رنگ سے زیادہ قوی تھی۔ وہاں باوجود
وعظ و نصیحت کے سچے ادب کی تخلیق ہوئی مثال کے طور پر نذیر احمد اور حالی کو لے لیجئے،
باوجود ازدیاد واعظانہ رنگ اختیار کرنے کے انہوں نے ادب پیدا کیا، اور جہاں قوتِ
تخلیق و تخیل کمزور تھی۔ وہاں وہ اخلاق آموزی کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی، وعظ زندہ
رہا اور ادب مرگیا۔

ڈر ہے کہ کہیں جدید ادب سیاست کا آلہ بن کر نہ رہ جائے۔ یورپ میں نئے ادب
کا یہی حشر ہو رہا ہے، اور اسی خوف کے ماتحت ادب کے دلدادگان ادب برائے ادب
کی تحریک کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر اس جملے سے ان کا مطلب ادب کو
معمولی دنیاوی معیار اور پست سطح سے بالا رکھنا ہے۔ تو میں ان سے بالکل متفق ہوں،
ادب کمیونزم، سوشلزم اور فاسسزم وغیرہ کی موافقت یا مخالفت کا ذریعہ نہیں ہونا چاہئیے
اگر ایک ڈراماٹسٹ صحیح معنوں میں ڈراماٹسٹ ہے، تو اس میں اتنی سچائی ہونی چاہیئے، کہ
وہ باوجود کمیونسٹ ہونے کے ضرورت کا اور موقعہ کے مدنظر سرمایہ دار حکومت کے علمبرداروں
کو بھی پسندیدہ رنگوں میں پیش کر سکے، ادیب کے لئے ہر وقت غیر جانبداری اور بلند
نظری کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔
شفیق بانو۔ ادب برائے زندگی۔

ایسے تو میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔ مگر بھونڈے پروپگنڈے

شکیلہ اختر :- کی نہیں پھر اگر ادب صحیح معنوں میں ادب ہو جائے تو ادب برائے
ادب اور ادب برائے زندگی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

ظاہر ہے، بیسویں صدی اور پھر دوسری عالمگیر اور تباہ کن جنگ کے

شیریں :- بعد "ادب برائے ادب" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ادب برائے ادب میرے نزدیک تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا میرا

صالحہ عابد حسین :- خیال ہے کہ ادب محض تفریح یا دماغی عیاشی کے لئے نہیں بلکہ
اس کا مقصد اس سے بہت بلند ہے اسے زندگی کا حقیقی اور بولتی چالتی زندگی کا آئینہ دار
ہونا چاہیئے، ادب کا مقصد ہے انسانی زندگی کی سچی تصویر پیش کرنا، زندگی کی خامیوں، کمزوریاں
عیوب اور نقائص سب کو کامیابی سے دکھانا، ان سب کے پس منظر میں اصلاح کے جذبہ کا
کارفرما ہونا لیکن ادب کا خون کر کے نہیں، جو ادب مولوی کا وعظ یا پولیس کی رپورٹ بن جائے
وہ میرے نزدیک ادب نہیں، ادب کے لئے زندگی کا ترجمان ہونے کی شرط ضروری
ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی اور ناگزیر شرط ہے کہ وہ بجائے خود
ادبی معیار پر پورا اتر سکے۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی :- میں ادب برائے زندگی کی نہ صرف قائل بلکہ معتقد ہوں۔

میں ادب برائے زندگی کی معقولیت تو قائل کر دیتی ہے، لیکن ادب برائے

عائشہ درانی :- ادب تو میری سمجھ میں آتا نہیں۔

میرے نزدیک ادب برائے زندگی کا نظریہ بہتر ہے لیکن

قرۃ العین حیدر :- اس میں شک نہیں کہ ادب محض پروپیگنڈا بن کر رہ جائے،

زندگی کتنی ہی بیمار، اور حقیقتیں کیسی ہی غلیظ اور تلخ کام ہی لیکن تصویر کے روشن اور خوشگوار رخ کو نظر انداز کر کے صحت مند ادب کسی طرح سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ رومان کو فراری ادب ماننے سے مجھے انکار ہے، فن کار کا کینوس "قومی جنگ" اور "سرخ سویرا" کی حدود سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

مسز عبدالقادر:- ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے متعلق میں نے ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کی، اور نہ مجھے ایسے نکات سوچنے کا موقع ہی ملا ہے۔ میں ایک سیاح ہوتی۔ اور سیاحت برائے سیاحت برائے زندگی کے متعلق معقول جواب دے سکتی ہوں۔

ہاجرہ مسرور:- میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔

۲- اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟

تسنیم سلیم:- اگر ادب کی ترقی پسندی ان کے اور ہمارے خیالات کو با اصول بنا سکتی ہے، اُن کو اور ہمیں غلامانہ ذہنیت سے نجات دلا سکتی ہے تھکے ہوئے دماغ سکون پا سکتے ہیں، تو ترقی بہر طور قابل ستائش ہے، خواہ کسی نوعیت کی ہو۔۔۔ بصورت دیگر اگر ترقی پسند ادب سے یہ مراد ہے، کہ ہم آنچلے کر گندگی بکھیریں، اور کسی گھٹن ماحول میں آسودگی حاصل کریں، یا اس سے دنیا بھر کو دوچار کریں، یعنی جب ہمارے قلم حیاتِ انسانی کا روشن پہلو نہیں دکھا سکتے، تو ہم اس کا تاریک رُخ سامنے

لاکر رہے سہے لوگوں کو بھی غلاظت آلود کریں، تب میں اس ترقی پسند ادب کو لائق نفریں کہوں گی، میں نے ترقی پسند ادب میں زندگی کے دونوں قدم اٹھتے دیکھے ہیں، ایک ہلکا اور مطمئن، دوسرا بوجھل اور بدرنگ ــــــ اسی لئے کبھی مسرور ہوتی ہوں اور کبھی متنفر۔

حمیدہ سلطان:۔ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک اس کے زندہ زبان ہونے کا ثبوت ہے، ادب، سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ترقی پسند ادب موجودہ دور کی بڑی پیچیدہ ہولناکیوں اور مصائب کو واضح کرتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ترقی پسند ادیب بعض اوقات جذبات کی رو میں بہ کر سنجیدگی کی باگ کو بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن ابھی تک ان پر بحران طاری ہے، ابھی ان کے قدم ڈگمگا رہے یہ لوگ لڑکھڑاتے ہوئے ایک ان جانی راہ پر چل رہے ہیں، رفتہ رفتہ سنبھل جائیں گے۔ فرسودہ لیکن دلفسیٹ قدامت کو ختم کرنا اور ایک نظام نو کی تخلیق کرنا آسان کام تو نہیں ان کے خیالات میں گہرائی نہ سہی، جوش تو ہے، امنگ تو ہے، کم از کم اب انہوں نے ؎ خواب سحر دیکھا تو ہے

اس خواب کی تعبیر بھی آ ہی جائے گی

خدیجہ مستور:۔ میں اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حمایت کرتی ہوں، بلاشبہ ترقی پسند تحریک جاندار، وسیع اور ناگزیر ہے اس سے کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہاں میں فیض کا وہ نظریہ ضرور بیان کروں گی کہ ــــ ترقی پسند ادب صرف ترقی پسندی ہی نہیں بلکہ ادب بھی ہے ــــ وجہ یہ ہے کہ کچھ ادباء شعراء دانستہ یا نادانستہ ایسے ادب کی تخلیق کر رہے ہیں جسے ادب کہنے

کو جی نہیں چاہتا

زہرہ جبین :- دور جدید میں ترقی پسند تحریک ہی اُردو افسانے کے عروج کی ذمہ دار ہے، ہر زمانے میں ترقی پسند عنصر کو زندگی کے ہر شعبے میں اہمیت دی جاتی رہی ہے، ادب میں ٹھہراؤ ناممکن ہے،

لیکن مشکل یہ ہے کہ ترقی پسندی ہر شخص کو بداخلاقی کا لائسنس دے دیتی ہے۔ اور وہ اس جنون میں فحاشی اور عریانی پر اتر آتا ہے ۔

سحاب قزلباش :- ہمارے نئے ادب میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ جبھی یہ ادب نیا بھی کہلانے لگا، آج کل کے ادب میں مجھے مختصر افسانہ اور جدید شاعری سب سے زیادہ پسند ہے، مگر حیرت کی بات ہے کہ یوپی والے ابھی زلف کے خم و پیچ ہی میں زندگی ڈھونڈ رہے ہیں، ان کے پاس زبان کی چاشنی ضرور ہے لہجے میں چونکا دینے والے ہچکولے ضرور ہیں، مگر جدید شاعری میں نمایاں حصہ پنجاب نے لیا ہے، ـــــ نثر نگاری میں اس قدر وسیع اور کشادہ راہیں ہم نے پالی ہیں، کہ زندگی کا کوئی پہلو ہمارے مشاہدہ سے مستور نہیں رہا، ہمیں عدالتوں سے اس وسیع النظری کی سزا بھی ملنے لگی ہے لیکن شریر بچوں کے ہاتھوں کو قمچیوں سے زخمی کیا جا سکتا ہے، دماغ نہیں بدلے جا سکتے، چاند پر خاک ڈال کر اپنا منہ ہی کالا کرنا ہوگا۔ میں بھی چاہتی ہوں، کہ بوڑھے ہندوستان کی نظروں سے بچ کر اپنے دائرے سے باہر اسی روشن پر چلنے لگوں، نئی نئی چیزوں کے مشاہدے کا شوق تڑپا دیتا ہے مگر گھبرا کر پھر پیچھے لوٹ آتی ہوں، ترقی کی راہوں پر بھاگتے ہوئے ادیب مجھ سے کتنی دور نکل گئے، اور میں اس قافلے کی گرد میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی !

سنجیدہ اشرف ادب اور زندگی کا ایک دوسرے سے ابدی رشتہ ہے، اور اس ابدی وابستگی کو ترقی پسند ادب نے مزید استحکام بخش کر اُسے لا ابدی کر دیا، جس طرح زمانے کی انقلابی کروٹیں ہر شے کی ماہیت میں تبدیلی پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں، اسی طرح یہ انقلابی کروٹیں بڑی شدت سے ادب میں بھی نمایاں ہوئیں، اور ادب کی پرانی ہیئت میں تبدیلی کر کے اسے زندگی سے قریب تر کر کے انسانی زندگی کا بہترین ترجمان و مصور بنا دیا، ترقی پسند ادب نئی زندگی کی نئی قدریں پیش کرتا ہے اور اس بدلی ہوئی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہونے میں ہمارا ممد و معاون بنتا ہے۔ نیز زندگی کی محض عکاسی ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی بہتری کے اصول پیش کر کے ایک پاک اور بے لوث زندگی کا تصور پیدا کرتا ہے ــــ مگر صرف انقلابی تحریکیں ہی ترقی کی بیّن دلیلیں نہیں، بلکہ ترقی پسند ادب علاوہ دیگر امور کے عورت مرد کی فطری و ذہنی مساوات، بہتر سلوک اور حسنِ اخلاق کی بلند ترین اقدار کا قیام ضروری قرار دیتا ہے، اور جو ادب انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترجمانی کرے وہ یقیناً ترقی پسند اور پائدار ادب ہے، ــــ جدید اُردو ادب محض زندگی کا آئینہ ہی نہیں اُس کی بہترین تصویر بھی ہے۔

سیدہ اشرف:۔ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، بعض معترضین ترقی پسند ادب کو فحاشی عریاں نگاری اور جنسی تسکین کے سامان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ خیال محض ہٹ دھرمی پر مبنی ہے، ترقی پسند تحریک کوئی نئی تحریک نہیں، ادب زمانہ کے ساتھ ہمیشہ بدلتا رہا ہے، اور یہ موجودہ تبدیلی یعنی ترقی پسند تحریک بہت ہی خوش آئند،

تبدیلی ہے، جو اردو ادب کو مقررہ حدود سے نکال کر وسعت اور ہمہ گیری عطا کر رہی ہے
اس وقت اُردو ادب ارتقائی منازل سیر کر رہا ہے، اب ادب محض خیالی یا ہوائی نہیں رہا، یعنی صرف کیفِ نشاط، ذہنی لذت اور حظ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ — بلکہ اس میں حقیقت کا پرتو نظر آرہا ہے، سماج کی دُکھی زندگیوں کی پکار — مسرور دلوں کے قہقہے — تشدد، بربریت، خودغرضانہ مظالم، امیری غریبی، محبت اور نفرت، مجبوریوں اور بیچارگیوں کے نقوش — بھوک افلاس پیار اور ہمدردیوں کے مرقعے — غرض سب ہی کچھ جو زندگی میں ہوتا ہے، اور زندگی میں کیا نہیں ہوتا! کیا عجب ہے کہ سماج کے جسم کے رستے ہوئے ناسوروں کو چھیڑ کر اس جسم کو تندرست توانا بنایا جا سکے۔
پہلے ادیب زیادہ تر زندگی سے گریز کے لئے لکھتے تھے، ان کا مقصد فرار تھا۔ وہ ہمہ وقت کیف و سرور میں کھوئے رہتے تھے، لیکن اب یہ خمار اتر چکا ہے، آج کا ادیب حقیقت سے گریز نہیں کرتا، بلکہ نہنگ آسا حقائق کے بحرِ ذخار میں کود پڑتا ہے، اس کی تحریر کا مقصد حقیقت کو اجاگر کرنا ہے، زندگی کے چہرے پر پڑے ہوئے صدیوں کے سماجی پردے نوچ پھینکتا ہے، وہ زندگی کی اصلاح کرتا ہے۔ اور پھر آخر یہ زخم ڈھکے چھپے کیوں رہیں؟ ادب زندگی کا آئینہ ہے، اگر آئینہ ساز آئینہ کو اس قدر روشن اور صاف بنائے جس میں ہمارے صحیح خط و خال اور زندگی کا اصلی عکس نظر آئے، تو اُس پر برہم ہونے کی کیا ضرورت! اور اس میں آئینہ ساز کا کیا قصور! حقیقت کی تلخی تو بہر حال قبول کرنا ہی ہوگی، ادب میں انقلاب ناگزیر ہے، اگر موجودہ بیداری کو ترقی پسند تحریک کا نام نہ دیا جاتا، تب بھی یہ نئی کروٹ لازمی تھی، جو لوگ ترقی پسندوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور نئے ادیبوں کو پانی پی پی کر کوستے ہیں، دراصل معاشرت و تہذیب کا

بنظرِ غائر مطالعہ نہیں کر کے میرا دعویٰ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب میں زندگی کی تازہ رُوح پھونک دی ہے۔

اُردو ادب کے جدید رجحانات کے متعلق میرا خیال یہ ہے

شائستہ اختر سہروردی :- کہ یہ سب اُردو ادب کی زندگی کا ثبوت ہیں۔ جب کوئی ادب مردہ ہو جاتا ہے تب وہ تجربہ اور تجزیہ سے بیگانہ ہو جاتا ہے، اور مقررہ ڈھرے پر چلتے چلتے بے جان ہو کر ختم ہو جاتا ہے، لیکن ہر نیا رجحان اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب زندہ ہے۔ دورِ حاضرہ کی سیاسی و سماجی تحریکات سے متاثر ہے، بیگانہ نہیں مگر ہر نیا رجحان لازمی طور پر ماضی کی تمام چیزوں سے بالاتر نہیں ہوتا، یعنی آج نئے اصولوں کے ماتحت جو اشعار لکھے جاتے ہیں وہ غالب سے بہتر نہیں ہیں اور نہ ان کو یہ دعویٰ کرنا چاہیئے، ہاں وہ اس شاعری سے بے شک بہتر ہیں، جو کہ صرف غالب اور ماضی کے دُوسرے شعرا کے تتبع میں لکھی جاتی ہے، اور جس میں اصلیت اور ندرت اور واقعیت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، میر، سودا، غالب، مومن، داغ، اور امیر تک کا کلام اس زمانے اور اس دور کے لحاظ سے جس میں وہ لکھا گیا جذبات کا صحیح ترجمان اور اصلیت کا رنگ لئے ہوئے تھا، اس زمانے کی اصلیت وہی زلف و نگاہ کے قصے اور تیر و نشتر کا ذکر تھا، لیکن جب زمانہ بدل چکا ہے، جب بھوک اور کشمکش حیات کی نفرت انگیز لیکن نہ بھول سکنے والی شکل ہر وقت اور ہر لحظہ نظر کے سامنے ہے، تو ان حالات میں بیٹھ کر زلف و نگاہ کے دام اور تیر و نشتر کا ذکر کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن یہ نیا ہیجان اور اضطراب جو شاعری پیدا کر رہی ہے یا پیدا کر چکی ہے وہ شاعری کے معیار کے لحاظ سے اب تک قدیم شاعری سے آگے بڑھنا تو کیا اس

برابر تک بھی نہیں پہنچ سکا ہے، صرف نئے ادب کی جانبداری کی وجہ سے یہ دعویٰ کہ ہر نئے شاعر کی تک بندی صرف اس لئے کہ وہ نئی ہے، غالب سے بہتر ہوگی۔ صریح اندھا پن ہے، اور یہ نقص ادب اور آرٹ کی تخلیق کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ ہیجان اعلیٰ شاعر اور اعلیٰ شاعری پیدا کرے گا اگر اس دور میں اعلیٰ شاعر ہوں گے تو اس نئے ادب اور نئی شاعری کے علم بردار ہوں گے پرانے طریقہ کی بے جان نقالی اب کبھی اعلیٰ شاعری نہیں پیدا کر سکتی لیکن نئی تحریک تب ہی اعلیٰ شاعری اور اعلیٰ ادب پیدا کرے گی، جب اسے صحیح اور بے رحم تنقیدی نظر سے دیکھا اور پرکھا جائے۔ اگر صرف جانبدارانہ واہ واہ پر اکتفا کیجائے گی تو کوئی پائیدار چیز پیدا نہیں ہو سکے گی۔

شفیق بانو:- ترقی بہر صورت پسندیدہ چیز ہے، بشرطیکہ ترقی کا پردہ رکھ کر عریاں نگاری نہ کی جائے، جو کہ اب عام دستور ہو چلا ہے

شکیلہ اختر:- میں کسی لیبل کی قائل نہیں، ہر بلند ادیب ترقی پسند ہوتا ہے، اور ہر دور کا اعلیٰ ادب ترقی پسند ہوتا ہے۔

شیریں:- ترقی پسند تحریک کی گرانبہا خدمات کا اعتراف نہ کرنا گویا اپنی کامل جہالت کا اعلان ہے، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ میں ترقی پسند تحریک کے بعض نقال اور جنسی بھوک کے مارے ہوئے ادبا و شعرا کی کاوشوں کی معترف نہیں ہوں، کیونکہ اسی قسم کے ادب نے جو اصل میں پروپیگنڈا ہے ترقی پسند تحریک کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے اس کے بلند مقاصد کو نقصان ہی پہنچایا ہے، اور معترضین کو اچھا خاصا مسالہ ہاتھ آگیا ہے۔

ادب ہی کیا، میں تو زندگی کے ہر شعبے میں ترقی پسندی کو
صالحہ عابد حسین:- لازمی سمجھتی ہوں، جو قوم لکیر کی فقیر ہوگی، وہ زندگی کے میدان
میں ہمیشہ پیچھے رہے گی میرا خیال تو یہ ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے بانی حالی
اور ان کے معاصرین تھے، اور موجودہ تحریک کو جن لوگوں نے چلایا، وہ دراصل ان کو تازہ
کرنے والے ہیں ـــ بہر حال موجودہ ترقی پسند تحریک بھی جن قابل اور سلجھے ہوئے دماغوں
نے شروع کی تھی۔ (مثلاً منشی پریم چند اور قاضی عبد الغفار وغیرہ) اور جس صحیح ذوق اور نیک
ارادے کے ساتھ ـــ وہ بہت ضروری قابل ستائش اور قابل تقلید ہے، لیکن کچھ
ہی عرصے بعد ترقی پسندی کے کچھ اور ہی معنی سمجھے جانے لگے، اور ہر کس و ناکس بزعم خود
ترقی پسند ادیب بن گیا، اور خدا بھلا کرے۔ اکثر رسالوں اور پبلشروں کا، جنہوں نے اس
ترقی پسند ادب کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھ کر اسی ادب اور ان ادیبوں کو خوب اچھالا، اور نہ
صرف اپنے رسالوں کو بلکہ بچارے نئے ادب کو بھی خوب ہی بدنام کیا۔ جو شخص انقلاب،
خون، مزدور، عورت اور جنس کے موضوع پر خامہ فرسائی کرنے، جس کے ہاں
زیادہ سے زیادہ عریانی بلکہ فحاشی ہو، الجھی ہوئی عبارت ہو، اور مجذوب کی سی بڑ ہو تو اور
بہتر، وہی سب سے بڑا ترقی پسند ادیب اور نئے ادب کا علمبردار ثابت کیا گیا ـــ تو حضرت
ایسے ترقی پسند ادیب کو تو میں دور ہی سے سلام کرتی ہوں، جو ادیب محض تخریب کرنا
جانتا ہو تعمیر سے دلچسپی نہ لے، جو ہر پرانی چیز کو برا، اور ہر نئی چیز کو اچھا جانے، جس کا
مقصد گندگی اچھالنا ہو، جو نہ عورت کو سمجھتا ہو اور نہ اس کی عزت کرتا ہو، پھر بھی اپنا
اولین مقصد اسی کو موضوع سخن بنانا جانتا ہو، اس کا ذکر بھونڈے سے بھونڈے اور
اور توہین آمیز سے توہین آمیز الفاظ میں کرے، جس کا دل و دماغ جنسی بھوک سے

ماؤف ہوچکا ہو، اس ادیب کی کم از کم میں تو — خواہ مجھے قدامت پرست ہی سمجھا جائے — نہ تعریف کرسکتی ہوں نہ تقلید، لیکن میں ترقی پسند تحریک سے مایوس نہیں، اگر چہ اکثر نوجوانوں نے جو ہر قسم کی بھوک سے بیقرار تھے، نئے ادب کی آڑ لے کر اپنا اور نئے ادب کا نام خوب روشن کیا، اور بعد میں جنگ کے زمانے میں تو انقلاب اور مزدور، غریبی اور ناداری، مفلسی اور بیچارگی سب پس پشت پڑ گئے، اور بس ایک جنون، جنس کا اُن کے دماغ اور دل پر سوار ہو گیا۔ لیکن اسی پُر آشوب دور میں بھی، اتنے گنے بھی بہر سمجھدار، قابل اور نیک نیت دماغ اس کی صحیح خدمت اور ترجمانی کرتے رہے۔ ان کو میں بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے میں جب اس میں سے خس و خاشاک کو چھانٹ دیا جائے گا، اور سمجھدار، سلجھے ہوئے معقولیت پسند ادیب اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں گے، تو ترقی پسند تحریک سارے ملک میں مقبول اور محبوب ہو جائے گی۔ اور بہت مفید اور تعمیری کام انجام دے گی۔

صدیقہ بیگم سیوہاردی :- اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کو دیکھ کر تو اس کے مخالف بھی اس کو سراہے بغیر نہ رہ سکے ترقی پسندی کسی جامد تصور کا نام نہیں، بلکہ وہ وقت کی طرح آگے بڑھتی ہے، ادیب ہونے کے علاوہ ایک انسان کی حیثیت سے بھی ہمارا فرض ہے، کہ ہم وقت کے اہم تقاضوں کا ساتھ دیں — زمانہ کے ساتھ چل کر زمانہ کی رہنمائی کریں۔

عائشہ درانی :- اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے لئے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتی، لیکن جتنا اس اہم تحریک کے متعلق جانتی

ہوں۔ اس نے مجھے متاثر کیا ہے، اگرچہ میں اس تحریک کے تحت کوئی خاص تحریک نہیں کر سکی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ رجعت پسندوں کی غوغا آرائی اس تحریک کی روح کو اب تک نہ کوئی نقصان پہنچا سکی ہے نہ آئندہ پہنچا سکے گی۔

قرۃ العین حیدر:- میں اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حامی ہوں۔ زندگی ایک نئے موڑ پر آ چکی ہے، انسانیت ایک عالمگیر انقلاب سے ہمکنار ہو رہی ہے، دنیا ایک نئے پیغام کی منتظر ہے، اور اس (sentimentalism) اور تجرباتی دور میں وہی ادب ہمارے لئے صحت مند، تعمیری اور (optimism) ثابت ہو سکتا ہے، جو زندگی کے اس بدلتے ہوئے دھارے۔ اس تیز بہاؤ کا ساتھ دے۔ اور جو زندگی کی صحیح تنقید ہو۔ ایک نئی اور بہتر دنیا کا پیغام ترقی پسند ادب کا پیغام ہے، یاسیت اور قنوطیت کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں، ادب کی افادیت اور واقعیت ایک ہی قسم کے (cynical nature) نظریوں کی نمائندگی اور اس (sentimentality) پر منحصر نہیں جو ہمارے ترقی پسند ادب کے زیادہ حصے میں پایا جاتا ہے، کہیں کہیں سے مارکس، اینگلز یا فرائڈ کو افسانے میں گھسیٹ لانے سے افسانہ لازمی طور پر ترقی پسند نہیں بن جاتا، زندگی کا بہاؤ ایک مقررہ اور طے شدہ حد فاصل سے نہیں روکا جا سکتا، میں جمالیات کو حقیقت پسندی کے منافی اور داخلیت پرستی پر مبنی نہیں سمجھتی، افادیت اور جمالیات کی، زندگی سے ہم آہنگی ہی صحیح ترقی پسندی ہے۔

مسز عبدالقادر:- اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق بھی میرے خیالات بجنسہ وہی ہیں، جو میں استفسار نمبر ۱ کے جواب میں

کہہ چکی ہوں،

ہاجرہ مسرور:- میں اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حامی ہوں، لیکن اس حد تک کہ ادب اور پروپیگنڈے میں تمیز ہو سکے، آج کل ہمارے اکثر ادبائ و شعرا ترقی پسند تحریک کے نام پر ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جس میں ادبیت کو پروپیگنڈے کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، میرے نزدیک یہ کھلا پروپیگنڈا ادب ہرگز نہیں، میں اس صورتِ حال کے سخت خلاف ہوں۔

۳۔ جدید اُردو افسانہ نگاری میں جنسی تجزیہ کی رَو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

تسنیم سلیم:- میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں، اس لئے انسانی جبلت اور جنس پرستی سے منکر نہیں ہو سکتی، البتہ میرا قلم کبھی اس طرف نہیں چلا، افسانوں میں افسانہ نویس خود اپنے دماغ کا تجزیہ کرتا ہے اور جو مسئلہ اُس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، وہی اُس کے خیالوں پر مسلط رہتا ہے اور وہ اُسی کو بیان کرتا ہے ـــــ افسانے لکھنا اپنے سوچ و چار کی نمائش کرنا ہے اور جب کسی افسانہ نگار کو جنسی تشنگی کے سوا اور کسی بات کا احساس نہ ہو، تو وہ کیا کرے، کس طرح ماسوا کی طرف نظر اُٹھائے ـــــ میرا کردار اتنا مضمحل نہیں کہ میرے ہوش و حواس پر جنسی جذبات طاری ہو جائیں اور میں گردوپیش سے بے خبر ہو کر صرف انہی احساسات میں اپنے افکار کو خلط ملط کر دوں، میری نگاہ پیش منظر سے آگے جہاں

اور بھی ہیں" ہر چند کہ دوسرے جہاں میں جانے کے لئے بھی شاید ستاروں کی سرزمین
سے گذرنا ہوگا۔ مگر مجھے دامن بچانا آتا ہے" اس حد تک نہیں کہ انسانی جبلت کو
کچل ڈالوں البتہ اس حد تک کہ میرا اپنے جنسی احساس سے تکلیف ہونا پڑھنے والوں
کے دل و دماغ کو محض اسی مرکز پر نہ اٹکا دے۔ میرے احساس کے اور بہت سے پہلو
بھی تو قابل ستائش ہیں ___ جن کے پاس بھی موضوع سخن ہے وہ اسے خوشی سے
بروئے کار لائیں، یہ اور بات ہے کہ ان کو پڑھ کر اور افسانہ نگار کو جنسی بھوت کا غلام
دیکھ کر مجھے گھن بھی آتی ہے۔ اور افسوس بھی ہوتا ہے۔

حمیدہ سلطان:- میں افسانوں میں جنسی تجزیہ کو بالکل غیر ضروری چیز سمجھتی ہوں، رسائل ہمیشہ پختہ کار مردوں اور عورتوں کے ہاتھوں میں نہیں رہتے
نوعمر لڑکے لڑکیاں بھی ان کو دیکھتے ہیں، ان کو کہ دھندلا قسم کے افسانوں کو پڑھ کر وہ
کچھ سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں، اور ناقص خیالات ان کے بھولے بھالے دلوں میں پیدا
ہو جاتے ہیں، اکثر تیز اور حساس معصوم دماغ ان واہیات افسانوں کو پڑھ کر لاشعوری
طور پر ان سے متاثر ہو جاتے ہیں، اس طرح ایسے افسانے بجائے کچھ سمجھانے یا
فائدہ پہنچانے کے ذہنالان ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

خدیجہ مستور:- میں جنس پر لکھنے کو برا نہیں سمجھتی، کیونکہ جنسی بد اعنوانیوں کے
شاید ہمارے وہ ادبی رسالے تک ہیں، جو ادب میں جنس کے
ذکر سے چراغ پا ہو جاتے ہیں ___ جنسی حماقتوں کے مار کھائے ہوئے انسانوں
کے آنسو پونچھنے کے لئے اپنے رسالوں کا تین چوتھائی میٹر اشتہارات کے لئے
وقف کئے ہوئے ہیں وہ مصلح ادب کے پیغمبر ___ وہ شرف انسانی کے محافظ!

—— بہرحال مجھے یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ جنس پر لکھنے کے لئے ڈاکٹروں کی سی محققانہ درشتی یا بازاری جنسی کتابوں کا سا چٹخارہ دونوں ہی جدید اردو افسانہ نگاری پر بدنما دھبے ہیں۔

زہرہ جبین:— مختصر افسانہ مغربی صنف ادب ہے۔ مغرب ہی کی تقلید میں جنسی موضوع اردو افسانوں میں شامل ہوا، لیکن اس نکتہ کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا، کہ مغرب اور مشرق جنس کے معاملہ میں بھی فرسنگوں دور ہیں، نیز ہمارے sex starved نوجوانوں کو جب اپنے جنسی ہیجانات کو تسکین دینے کا اور کوئی ذریعہ نہ ملا تو ذہنی عیاشی پر اتر آئے۔

سحاب قزلباش:— میں نومبر (۱۹۷۵ء) میں لکھنؤ گئی، ہاجرہ مسرور بہن سے ملاقات ہوئی، اس سوال کے بارے میں میں نے پوچھا جواب میں وہ مسکرائیں اور کہا کہ "اس سوال پر میں نے خوب جی کھول کر لکھا ہے"! مجھے عصمت باجی یاد آگئیں جیسے ایک اونچی سی جگہ پر وہ کھڑی مسکرا رہی ہیں، اور ہاجرہ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی ہیں —— بے حد تیز قدم بڑھا رہی ہیں، لوگ چیخ رہے ہیں کہ کہیں گر نہ پڑتا، اور مجھے بھی خیال ہو رہا ہے مگر نہ جانے کیوں جتنا تیز یہ بڑھی جا رہی ہیں، اتنا ہی عصمت مسکراتی ہوئی اونچی ہوتی جا رہی ہیں، —— نہ جانے کیوں!
—— مگر ہاجرہ بہن کے اس سوال پر میں چونک پڑی، کہ "سحاب، تم نے کیا لکھا ہے اس سوال کے بارے میں؟" —— میں جیسے بے جان ہو گئی اور —— اپنے دائرے کے چاروں طرف دیکھ کر گھبراہٹ میں میرے منہ سے نکل گیا ؎

لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز!

جنسی موضوعات کا تذکرہ ادب میں ہمیشہ سے موجود ہے،

سنجیدہ اشرف :- اور رہے گا، چونکہ زندگی اور جنس کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ادب جو مفسرِ حیات ہے، جنسی تجزیہ سے کیسے عاری ہو سکتا ہے، جنسیات و معاشیات ہی زندگی کے سنگہائے بنیاد قرار دئے گئے ہیں اور ادب اگر ان کی مخلصانہ ترجمانی کرے تو اُسے موردِ طعن و تشنیع قرار نہیں دیا جا سکتا، میری یہ رائے ترقی پسندی اور جنسی تجزیہ کے ان حصول کے متعلق نہیں جو ادب کے لئے ترقیٔ معکوس کا درجہ رکھتے ہیں۔

سیّدہ اشرف :- ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ اور زندگی سے جنس کو کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اِسے توجیہاتِ انسانی میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، میرے خیال میں فنکار کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ صحت مندانہ شعور کیساتھ جنسی مسائل پر روشنی ڈالے، بے معنی اور فضول اخلاقی قدریں اب انسان کے لئے ناقابلِ برداشت صورت اختیار کر چکی ہیں، یہی بیزاری اور رواجی پابندی (بظاہر اخلاقی بندش) جو اپنے جلو میں بے شمار برائیاں لئے ہوئے ہے، بعض اوقات لاشعوری بغاوت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، اور انسان کو سینکڑوں الجھنوں میں مبتلا کر دیتی ہے، ان حالات کے پیشِ نظر جنسی مسائل کو اجاگر کر کے زندگی کی گتھیوں اور پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جدید اردو ادب میں جنسی تجزیہ کی حد تعمیری اور افادی پہلو سے بہت ہی مستحسن اقدام ہے، لیکن جو "خال حد سے بڑھا ساہوا" صحیح جنسی شعور کے ساتھ جنسی مسائل پر قلم اٹھانا انسب ہے۔

شائستہ اختر سہروردی :- جدید اُردو ادب میں جنسی تجزیہ نمایاں چیز ہے مختلف وجوہات نے مغربی ادب میں اس چیز کو پیدا کیا۔ اُردو ادب میں اس کی نمود کسی حد تک مغربی ادب کی نقل اور کچھ حد تک معاشرتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے،

جس حد تک مغربی ادب کی نقل کا تعلق ہے، جنسی تجزیے جالوسی چیز ہے اور جس حد تک ہماری اپنی معاشرتی تبدیلیوں کا عکس ہے، ایک تجزیہ کا درجہ رکھتی ہے اور قابل غور ہے،

عصمت چغتائی کے افسانے اُردو ادب کے اس رویہ کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ اوروں نے بلکہ بہتوں نے اس موضوع پر زور آزمائی کی، مگر عصمت ہی اس کو ادب کے درجہ پر لا سکیں، انہوں نے اصلیت کو بے نقاب کر دکھایا ہے، اور یہ بتانے میں کامیاب ہوئی ہیں کہ پس پردہ سماج کی پابندیوں سے جکڑی ہوئی سوسائٹی کے اندر بھی فطرت کی بے پناہ قوت کس طرح رنگ لاتی ہے، اور رسم و رواج کے رنگین نقابوں کے پیچھے بھی فطرت اپنے اصلی رنگ میں جولانیاں کرتی ہے، دیکھنے والے اس کی طرف سے منہ پھیر لیں، شاعر اور مصور اس کے وجود سے انکار کرتے ہوئے گذر جائیں لیکن حقیقت ان کے نہ ماننے سے مٹ نہیں جاتی وہ اندر اندر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

ہر نئی چیز کو کامیابی سے برتنے کے لئے اس پر پورا قابو اور عبور ہونا چاہیئے، اور اس کو پوری طرح سمجھنے کی ضرورت ہے، منہ زور گھوڑے پر ایک شہسوار ہی چڑھ سکتا ہے، اسی طرح جنس ایک بے پایاں مضمون ہے۔ اس کو کامیابی سے برتنے کے

لئے انسانی فطرت کی گہرائیوں سے بڑی گہری اور حقیقی واقفیت ضروری ہے اس کے متعلق جو نفسیاتی انکشافات ہوئے ان پر پورا پورا عبور لازمی ہے چند ایک سنے سنائے الفاظ، یہاں وہاں سے لئے ہوئے جملے کافی نہیں ہیں لیکن افسوس کہ اُردو افسانہ میں صرف عریانی اور جنسی امور پر بیکار خامہ فرسائی کو نفسیاتی تجزیہ کا مرتبہ دے دیا گیا اس کا نتیجہ اخلاق پر بُرا پڑ رہا ہے، اور ادب کو کچھ حاصل نہیں ہو رہا بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ چونکہ یہ روش ادبی درجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی اسلئے اخلاق پر بُرا اثر ڈال رہی ہے، جہاں پر اور جب مصنف کامیابی سے جنسی امور پر روشنی ڈال سکے ہیں، اور انسانی فطرت کے اس عقدے کو فلسفیانہ طور سے حل کرنے یا کم از کم سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہاں اخلاق پر بُرے اثر کا سوال ہی نہیں آسکتا۔

شفیق بانو:۔ سخت مخالف ہوں، ـــــــ شاید اسی لئے کہ اس موضوع پر کبھی چاہوں بھی تو ایک لفظ نہیں لکھ سکتی:۔

شکیلہ اختر:۔ جنسی تجزیہ کی رو حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

شیریں:۔ جنسی تجزیہ اکثر اوقات نہایت باریک اور اہم مسائل زندگی کو حل کر ڈالتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ تجزیہ نیک نیتی سے کیا جائے، اور اپنے جنسی جذبات کی تسکین کی خاطر بازاری اور سستا لٹریچر پیدا کرنا مقصود نہ ہو۔

صالحہ عابد حسین:۔ ؎ ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور اب بعض بیچاری ادیب شاعر عورتوں کے اعصاب پر بھی محض جنس مسلط ہو کر رہ گئی ہے۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی:- جنسی تجزیہ کی رَو میں میں نے ایک آدھ افسانہ لکھا ہے۔ میں محض جنسیاتی انداز کے موضوعات سے اجتناب برتتی ہوں، اس لئے کہ اگر اس میں سماجی پستی کی جھلک نظر نہیں آتی، اور لذتیت حاوی ہوتی ہے، تو وہ کہانی فن کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتی، یہ میری اپنی رائے ہے۔

عائشہ درانی:- جنسی تجزیئے کا نام سُن کر میں زبردستی اپنے قلم کی زبان سے بڑی گی نصیحتیں تو ہرگز نہ اُگلواؤں گی، کیونکہ میں جنس پر انسانی زندگی کی بے شمار اچھائیوں اور برائیوں کا بوجھ محسوس کرتی ہوں لیکن (مجھے کچھ نئے لیکن بہت مشہور افسانہ نگار معاف فرمائیں کہ) ادب میں جنسی تجزیہ اس طور سے نہ کیا جائے کہ علم الاجسام کا کوئی مخصوص بیان پڑھنے کی ضرورت نہ رہے، یا اسی نوع کی دوسری باتیں ــــ اگر آپ کو کوئی جنسی بدعنوانی نظر آئی ہے اور آپ خیال کرتے ہیں کہ اسے ادب میں پیش کر کے اصلاح کی کوئی صورت ہے، تو شوق سے پیش کیجئے، مگر خدا کے لئے جدت کے شوق میں کسی کے جسم کے کپڑے اتار کر (زبان حال سے) یہ نہ فرمائیے کہ دیکھو واللہ۔ اس سانولے سلونے جسم پر کیسا خوفناک پھوڑا ہے یعنی کچھ عجیب سا تصور بندھتا ہے۔ یہ ابھار دیکھو، مگر اس کا اپریشن کرتا ہے آہ (چٹخارا لے کر) کاش ایسا نہ ہو!" ــــ تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ چند افسانہ نگار حضرات کے جنسی افسانے دیکھ کر ــــ مگر میں ڈرتی ہوں کہ کوئی میری یہ تحریر

یدکر اخلاقی قدریں بدل جانے کا اعلان نہ کرنے لگے
میں جنسیات سے متعلق ادبی تحریروں کو ایک اصول پر پرکھتی ہوں اور وہ یہ ہے
مجموعی تاثر سے ایک غیر محسوس سی نصیحت کے اکتساب کے لئے قارئین کا ذہن
یوڈ ہو جائے ــــــــــ اگر یہ نہیں ہے، تو میں ایسی تحریروں کو وہی درجہ
یتی ہوں جو یورپ کی کسبیوں کی ان برہنہ تصاویر کو جو ہمارے بازاروں میں دھڑا
دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر لیہ ــ جدید اُردو افسانے میں جنسی تجزیہ کی رَوکی میں مخالف نہیں
ہوں، اگر ہمیں زندگی کی صحیح عکاسی اور نمائندگی کرنی ہے تو
ہم اپنی تخلیقات میں جنسیات کو نظر انداز نہیں کر سکتے، عصمت، ممتاز مفتی اور منٹو
کے بغیر ہمارے جدید ادب کا کینوس مکمل نہیں ہو سکتا تھا، میں ان لوگوں میں سے
نہیں ہوں جو ڈی ایچ لارنس کا نام سن کر بھویں چڑھا لیتے ہیں، اگر جنسی مسائل کو صحت
مندی کیساتھ پیش کیا جائے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس رجحان کے علمبرداروں کو گردن
زدنی قرار دیں، لیکن آجکل ہمارے بیشتر ادبا جس بے رحمی سے اس رجحان کو بغیر
کسی مقصد کے محض تفریحاً [illegible] (E) کر رہے ہیں، میں اس کے خلاف ہوں،
Sese in life آنجل مینن کا خیال ہے، لیکن میں جنس کو اس قدر لا محدود
[illegible] (all pervading) نہیں سمجھتی، زندگی کی وسعت کو اتنا محدود
(down) نہیں کیا جا سکتا، کہ انسان ان ذہنی پیچیدگیوں سے آگے بڑھ ہی نہ سکے۔
ہمارے افسانہ نگار جنسیات کو جس قلمگراہ کن اور بے ترتیب ([illegible])
انداز سے پیش کر رہے ہیں اُسے دیکھ کر ایک طرح کی کراہت ر (Repulsion)

سی محسوس ہوتی ہے، اور یقین نہیں آسکتا کہ زندگی اتنی بیمار اور غلیظ ہے۔

مسز عبد القادر:۔ میں افسانہ نگاری میں جنسی تجزیہ کی رو کے خلاف ہی نہیں بلکہ اسے افسانہ نگاری کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ سمجھتی ہوں۔

ہاجرہ مسرور:۔ میں جنسی تجزیہ کو اس لئے گالی نہیں سمجھتی۔ کہ ہماری زندگی میں قدم قدم پر جنسی خامیوں کی کارفرمائیاں بکھری پڑی ہیں، اگر ا
کو یہ کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان کا تجزیہ نہ کرے، لیکن مر
خیال ہے کہ جنسی تجزیہ کرتے ہوئے ہمارے اکثر ادیب کچھ اس طرح گڑبڑا جا
ہیں، کہ الٹا ان کا اپنا جنسی تجزیہ کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے ادیب کے لئے ضرو
ہے، کہ وہ ایک ڈاکٹر کی طرح ذمہ دار ہو، یہ نہیں کہ مرض کی تشخیص کرتے ہوئے خو
ایسے چٹخارے لینے لگے، جیسے کھٹائی چوس رہا ہو، میرا خیال ہے کہ جنس پر لکھ
ہوئے ضبط، وقار اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے، اگر ادیب کا مقص
کسی جنسی برائی کو پیش کرنا ہے، تو ضروری ہے کہ اس کی زبان اور انداز بیان میں
اس برائی کی اتنی جھلک ہو، کہ قاری کا ذہن اکتساب لذت کے بجائے اس بر
کو محسوس کرتا رہے۔

آجکل اکثر حضرات ادب میں جنسی تجزے کے خلاف یہ دلیل پیش کرتے
ہیں کہ جنس کا ذکر آتے ہی خواہ مخواہ ذہن بھٹک جاتا ہے، سو اس ضمن میں
عرض ہے کہ اگر کسی کو بیل، آسمان یا دیواریں دیکھ کر کسی قسم کی لذت حاص
ہوتی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیل، جس سے لاتعداد انسانوں کو فائ
پہنچتا ہے، دنیا سے اڑا دی جائے، آسمان کو کھود کر زمین پر بچھا دیا جائے دیو

والے گھروں میں رہنے کے بجائے ہمارے ادیب کھلے میدان میں رہنے کی تلقین کرنے پر کمر باندھ لیں ـــــ اور پھر نہایت ادب سے گذارش ہے کہ بے چارے اس زمانے کے ادیب کے سر یہ ذمہ داری ہرگز نہ ڈالئے کہ وہ عوام کے بجائے چند افراد کے لئے ادب تخلیق کرے۔

۴۔ آپ افسانے میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہیں، یا کردار نگاری کو۔ یا دونوں کو؟

تسنیم سلیم :ـــ میری نگاہ میں افسانہ کے لئے پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اگر مصور حقیقت بیں ہے، تو وہ پھول اور کانٹے دونوں کو محض رنگوں کی آمیزش سے فطری صورت میں پیش کر سکتا ہے، میں ہمیشہ اپنے کردار کو اجاگر کرنا چاہتی ہوں، اور اس کی زندگی کے اچھے برے پہلو دکھا کر اگر صحیح عکاسی کر سکوں تو مطمئن ہو جاتی ہوں، دنیا کے ذرے ذرے میں پلاٹ بکھرے پڑے ہیں، ان کو بننا اور جمع کرنا بے سود! ـــ کیا ہمارا ہر قدم، ہمارے جسم کی ہر حرکت، ہمارا ہر عمل اور ہمارا ہر سانس بجائے خود ہمارے گرد خاکوں کا تانا بانا نہیں بُن دیتا! اگر کردار کو مکمل طور پر سامنے لایا جائے، تو وہ محض اپنے تنفس سے لاکھوں خاکے اگل سکتا ہے، اور آپ ان میں زندگی کے بے شمار رنگ دیکھ سکتے ہیں۔

حمیدہ سلطان :ـــ میں افسانے میں پلاٹ کو ضروری نہیں سمجھتی، کردار نگاری کا

خیال رکھتی ہوں، اگر کردار نگاری کو اہم نہ سمجھا جائے، تو میں سمجھتی ہوں کہ پلاٹ زور دار نہیں سکتا، کرداروں کے ساتھ پلاٹ تو از خود بنتا چلا جاتا ہے۔

خدیجہ مستور:- میں پلاٹ کی اہمیت سے منکر نہیں۔ بلکہ پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہوں، لیکن مجھے کردار نگاری زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

زہرہ جبین:- پلاٹ اور کردار نگاری دونوں افسانہ کے الگ الگ پہلو ہیں ضروری نہیں کہ ہر افسانے میں پلاٹ بھی ہو اور کردار نگاری بھی ایسا وہ افسانہ جس میں پلاٹ مفقود ہے، لیکن کردار نگاری کا معجزہ ہے میرے نزدیک مکمل افسانہ ہے۔

سحاب قزلباش:- پلاٹ کو میں کبھی بھی خاطر میں نہ لائی، کردار نگاری نے اکسایا تو وہی میرے قلم کے ہمراہ کھنچی چلی آتی ہے، اور آخر پلاٹ بھی کہیں سے نظر آجاتا ہے۔ ——— اور سچ پوچھئے تو اس ٹیکنیک کے پھیر میں ابھی دماغ الجھا ہی نہیں، یا پھر شاید یہ میری نافہمی کی وجہ ہو ——— ابھی تک میرا کوئی خاص اسٹائل نہیں، چلنے کی کوشش کر رہی ہوں، ڈر ہے گر نہ پڑوں ——— قہقہوں کی تاب لاکر ——— کیونکہ ہر اناڑی پر دنیا ہنستی ہے!

سنجیدہ اشرف:- جدید افسانہ میں پلاٹ سے زیادہ کردار نگاری ضروری بھی ہے، پلاٹ، فکر اور ذہنی عمل کو مشکل کر واقعیت و حقیقت کو صرف ایک مرکز پر ٹھہرائے رکھتا ہے، اور قاری کے ذہن پر وہ ایک ہی تصویر جو معینہ پلاٹ کی صورت میں پہلے ہی معین کر رکھتا ہے چھوڑ جاتا ہے، اس طرح بعض اوقات پڑھنے والے پر قنوطیت سی چھا جاتی ہے، کردار نگاری افسانے میں متعدد تصاویر

ابھارتی ہے۔ جو ایک دُوسرے سے مربوط ہو کر قاری کے ذہن کو فکر و تعمق پر مجبور کر دیتا ہے تاہم بعض اوقات افسانے میں پلاٹ اور کردار نگاری دونوں اپنے آپ کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

سیدہ اشرف :- یوں تو افسانہ میں پلاٹ بھی نہایت ضروری چیز ہے، لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کردار نگاری افسانہ کی جان ہے اور افسانہ کی کامیابی کا محض کردار نگاری پر دار و مدار ہے۔

شائستہ اختر سہروردی :- پلاٹ اور کردار نگاری ہی افسانہ کے دو بڑے جز ہیں، انہی کے اتصال سے افسانہ بن کر تیار ہوتا ہے اس لئے ہر دو ہی ضروری ہیں، ایک کو دوسرے پر کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ہاں اگر آپ میری ذاتی رائے پوچھتے ہیں، تو میں کمزور پلاٹ لیکن زبردست کردار نگاری سے بھرپور افسانہ کو کمزور کردار نگاری لیکن بہترین پلاٹ کے افسانہ پر ترجیح دیتی ہوں۔

افسانہ کیا چیز ہے؟ افسانہ لکھتے وقت ہمارا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہی نا کہ زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں اور انسانی فطرت کے بے انتہا مدوجزر صفحۂ قرطاس پر لائیں اس کے لئے ہم پلاٹ کا فریم استعمال کرتے ہیں لیکن پلاٹ سوائے اس کے قصہ کہنے یا قصہ کو پیش کرنے کا آلہ ہے اور کچھ نہیں۔ لیکن کردار؟ — کردار افسانہ کی جان ہیں، کردار ہی کو پیش کرنے کے لئے، انسان کی طبیعت کی نیرنگیوں کو دکھانے ہی کے لئے ہی ہم افسانے لکھتے ہیں یا ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ اور اگر ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے تو ہماری کوشش بیکار رہی، کمزور کردار سے قصے کی کامیابی معلوم!

اسی لئے جہاں کردار نگاری اور پلاٹ کا توازن بہترین ناول اور افسانہ کی تخلیق کا

باعث ہوتا ہے۔ وہاں کمزور پلاٹ کے باوجود کامیاب ناول لکھے جا سکتے ہیں، لیکن
کمزور کردار نگاری ناول یا افسانہ کو بے جان کر دیتی ہے۔
ہاں بعض افسانے ایسے بھی ہوتے یا ہو سکتے ہیں، جہاں دلچسپی کا مرکز انسانی فطرت
نہیں بلکہ واقعات اور حالات ہوتے ہیں۔ ایسے ناولوں اور افسانوں میں پلاٹ کو کردار سے
زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں قصہ کو وجود میں لانے کا باعث جو چیز ہوئی، وہ
ایک بیرونی شے تھی۔ ایک خارجی چیز ـــــ لیکن جہاں داخلی جز زیادہ اہم ہے (اور
زیادہ تر افسانہ اور ناول میں داخلی جز ہی اہم ہوتا ہے) وہاں کردار نگاری پلاٹ سازی
پر فوقیت رکھتی ہے۔

شفیق بانو:۔ میں پلاٹ کو زیادہ اہم سمجھتی ہوں۔

شکیلہ اختر۔ میرے نزدیک افسانہ میں پلاٹ اور کردار نگاری دونوں ضروری ہیں۔

شیریں:۔ میں کردار نگاری کو زیادہ ضروری سمجھتی ہوں، اور کبھی کبھی
پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کو،

صالحہ عابد حسین:۔ افسانے میں کردار نگاری اور پلاٹ دونوں کو بہت اہمیت
حاصل ہے، ـــــ افسانہ آخر کیا ہوتا ہے، کسی ایک
شخص یا کئی لوگوں کی زندگی کا واقعہ ـــــ میرے نزدیک تو جس افسانے میں کوئی
پلاٹ نہ ہو، بلکہ بے ربط خیالات کا ایک مجموعہ ہو وہ افسانے کے نام کا مستحق ہی نہیں
اور ظاہر ہے کہ اگر قصے کے افراد کی سیرت ہی پڑھنے والے کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ کیا
قصہ ہوا۔ افسانے میں پلاٹ اور کردار نگاری دونوں لازم ملزوم ہیں، اور وہی افسانہ
کامیاب کہا جا سکتا ہے، جس کا پلاٹ مربوط ہو، کردار بنتے چلے جاتے، ہنستے روتے

چلتے پھرتے ۔۔۔ اصلی انسان معلوم ہوں، جن کے ساتھ ہم خود بھی ان کے رنج اور خوشی میں شریک ہو سکیں اور جن کی سیرت کا ایک خاکہ ہمارے دماغ میں آجائے۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی :۔ میں اپنے افسانوں میں پلاٹ اور کردار نگاری کے ساتھ موضوع کی اہمیت اور نزاکت کا بھی خیال رکھتی ہوں۔

عائشہ درانی :۔ اس بارے میں میں نے اپنا کوئی اصول نہیں بنایا ہے۔

قرۃ العین حیدر :۔ میں افسانے کی تکنیک میں پلاٹ پر کردار نگاری اور خیالات و تاثرات کے خوبصورت اظہار کو ترجیح دیتی ہوں میں نے پلاٹ کی تعمیر کی طرف اب تک توجہ نہیں کی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ میں ناول کامیابی سے کبھی نہ لکھ سکوں گی۔

مسز عبدالقادر :۔ میں افسانے میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہوں لیکن میں نے خود پلاٹ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ میرے افسانوں کے پلاٹ تو کھنڈروں کی کہانی کھنڈروں کی زبانی سننے سے خود بخود بن جاتے ہیں۔

ہاجرہ مسرور :۔ یوں تو پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہوں، لیکن کردار نگاری پر زیادہ زور دینا پسند کرتی ہوں۔

۵۔ آپ کے فن پر غیر ارادی یا کس افسانہ نگار کی زبان اور بیان اثر انداز ہوئے ہیں؟

تسنیم سلیم :۔ جو حرکتیں غیر ارادی طور پر ہو جائیں، میں ان کو قابل غور نہیں

بھی ، جو چیز قلم سے نکل گئی ، پھر اُس پر اتنی توجہ نہیں دی کہ کسی کی مشابہت بھی ڈھونڈھ نکالوں، اس کا اندازہ لکھنے والے سے پڑھ کر پڑھنے والے کو ہو سکتا ہے ۔ البتہ میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جہاں تک پڑھ کر متاثر ہونے کا سوال ہے ، جدید افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کی منظر نگاری سے ، احمد ندیم قاسمی کی بلند خیالی سے ، سعادت حسن منٹو کی بیباکی سے اور شفیق الرحمٰن کی شگفتگی سے مرعوب ہوئی ہوں ۔ میں نے ان افسانہ نگاروں کو ان خصوصیات کی بنا پر مکمل پایا ہے ، اور اگر نقالی کی قائل ہوتی تو ارادتاً یہی رنگ اپنے افسانوں میں نمایاں کرنا چاہتی ، مگر نقل کر کے لطافت کا گلا گھونٹنے سے یہ بہتر ہے کہ ان کو پڑھ کر ذہن کو تازگی بخشی جائے اور زندگی میں کروٹ کا احساس پیدا کیا جائے ۔

حمیدہ سلطان :- میرے ابتدائی افسانوں پر علامہ راشد الخیری مرحوم کا اثر غیر ارادی طور پر ہوا ۔ ایک طویل افسانہ (مشرق و مغرب) رسالہ "امین نسواں" میں مسلسل چھپتا رہا ، اور پھر کتابی صورت میں نکلا ۔ تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مختلف رسائل نے اس خیال کا اظہار کیا ، کہ اس افسانے کی زبان علامہ مرحوم کی طرح شستہ و رفتہ ہے ، انداز تحریر بھی اُن سے ملتا ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی ، کہ راشد الخیری مرحوم دہلوی ہی تھے ۔ اور اپنے افسانوں میں دہلی کے شرفا کی بہو بیٹیوں کی زبان استعمال کرتے تھے ۔

لیکن اب میرے افسانوں پر کسی ادیب کے خیالات و زبان کا اثر نہیں ۔ یہ خود میرے خیالات و احساسات کا نچوڑ ہیں ۔۔۔۔ میری اپنی زبان ہیں ۔

خدیجہ مستور :- اس کا فیصلہ میرے افسانے پڑھنے والے زیادہ بہتر کر سکتے ہیں

زہرہ جبیں :- اس سلسلہ میں اپنی چھوٹی بہن کے ریمارک پیش کئے دیتی ہوں ۔

میرا ایک سنجیدہ سا افسانہ پڑھ کر بولی "آپا، یہ افسانہ تو احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا سا ہے" میں نے پوچھا "اور میرے دوسرے افسانے کیسے ہوتے ہیں؟" — اس کا جواب مجھے یہ ملا "کچھ تو شفیق الرحمن کی کہانیوں کے سے اور کچھ ایسے جن میں صرف زہرہ آپا کا رنگ ہوتا ہے۔"

سحاب قزلباش :- اس کا کبھی خیال بھی نہ آیا، کبھی غور ہی نہیں کیا، اور نہ ہی کوشش کی کسی کی روش پر چلنے کی، جب موڈ میں ہوئی تو اپنے جذبات کے سہارے اپنی روزمرہ کی بول چال میں لکھ مارا۔ اس سوال سے میں چونکی بھی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی کہی ہوئی باتیں خود پڑھ رہی ہوں —— میں خود کچھ نہیں کہہ سکتی، شاید پڑھنے والے اپنی رائے قائم کر سکیں، ہاں مجھے آجکل کے لکھنے والوں میں یہ لوگ بے انتہا پسند ہیں، مگر خود لکھتے ہوئے ایسی غرق ہو جاتی ہوں کہ احساس بھی نہیں رہتا ان لوگوں کے رنگ کا —— البتہ میں نے کرشن چندر، عصمت، شفیق الرحمن، حجاب اور منٹو بے حد پڑھا ہے، اور پڑھتے پڑھتے جیسے ان کے ہمراہ چلی ہوں۔ ویسے تو میں نے ہر نئے افسانہ نگار کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، مگر یہ لوگ مجھے خصوصیت سے پسند ہیں اور میں ان کی بے حد مداح ہوں، کرشن چندر کی وہ معصوم سی مچلی ہوئی تمنائیں جو کشمیر میں بھی رنگین نہ ہونے پائیں وہ سیدھا سادا انداز اور رلا دینے والی ٹریجیڈیز —— اس کے وہ بلند خیالات جسے مجوبیت دنیا نہ اپنا سکی۔

عصمت کے وہ اونچے منصوبے، جن کو عملی طور پر پورا کرنے کے جرم میں ان چھپے ہوئے سیاہ دلوں کے نقاب اپنی چبھتی ہوئی طنز سے اتارنے کی کوشش میں

اس کھسیانے سے ہندوستان نے اپنی بلی کی اس جرأت پر اُسے عدالت کے سُنہری
کٹہرے میں لاکھڑا کیا، اور اس کی اس چھپی چھپی طنز آمیز مسکراہٹ پر ہندوستان صرف
اس کے بجائے کھمبا نوچ سکا اور عصمت لپک کر عدالت سے اُونچے منٹو کے پاس
جا کھڑی ہوئی ـــــ ان پُراسرار ہستیوں کی تحریر میں ڈھلے ہوئے جذبات پڑھ کر غمیر
تمنا اُٹھتا ہے تو حجاب اپنے تخیلات کی معصوم دنیا میں گھسیٹ لیجاتی ہیں، جہاں
زندگی بھی آئیڈیل ہو جاتی ہے، اور انہی تصورات میں قہقہوں کی دنیا نظر آجاتی ہے اور
میں چونک پڑتی ہوں ـــــ جہاں شفیق الرحمٰن رومانی دنیا میں اپنی حد سے زیادہ خوبصورت
ہیروئین کے ساتھ اور شیطان قسم کے دوست کے ہمراہ رئیس کی نیچر شفیق کی سی ہے)
ورزش کرتے نظر آجاتے ہیں، تو کبھی خوبصورت سی ہیروئین کو چھوڑ کر دودھ کی بوتل لئے
ہوئے ان تتلیوں کے پکڑنے میں مشغول نظر آتے ہیں جو کبھی اُن کے ہاتھ نہ آئیں گی اور
وہ شائد ساری زندگی اسی خواب میں گذاریں۔ یا پھر گھبرا کر کرکٹ کے میچ میں بولنگ
کرنے لگیں ـــــ اور پھر شفیق کے وہ شریر نپے تلے خیالات، وہ شرارت بھرے
جملے، جنہیں پڑھ کر بے اختیار بڈھے ہندوستان کا دل کھیلنے کودنے کو چاہنے لگتا
ہوگا ـــــ مگر اختر اور نیوی بھی پیچھے نہیں، آجکل یہ بھی کتنے اُونچے بڑھتے چلے
جا رہے ہیں ـــــ دنیا کی پروا کئے بغیر عصمت اور منٹو کی منزل سے الگ ـــــ گاتے
ہوئے ـــــ مترنم آواز لوگوں کو چونکا دیتی ہے۔ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں، جن میں
بڑے بڑے شاعر۔ بڑے بڑے مدبر اپنے دامن کو تار تار ہوتے دیکھ کر اس ننھے
ادیب کو گالیاں دیتے ہوئے ریشمی پردوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔
یہ ہیں میرے دلپسند ادیب جن کے وقار و جرأت سے میری دلچسپی جا رہی ہے۔

آپ خود ہی اندازہ لگا سکیں گے کہ کہاں ہیں اور کہاں یہ لوگ ع
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک !

میں نے یہ امر سوچنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی، نہ مجھے اس
یدہ اشرف :- کا احساس ہوا کہ میری تحریر پر کسی افسانہ نگار کی زبان و بیان
نمایاں ہوئے ہیں یا نہیں۔

اگر غیر ارادی طور پر کسی مصنف کے بیان اور زبان سے میری
ہ اشرف :- تحریر متاثر ہوئی ہے، تو اس طرف میری توجہ نہیں۔

میرے طرزِ تحریر اور ادبی مذاق کے بننے میں نذیر احمد
ستہ اختر سہروردی :- کی کتابوں کو بہت بڑا دخل ہے، اُن کی کتابیں میری
ی ہوئی ہیں، اور اس عمر سے رٹی ہوئی ہیں، جبکہ طبیعت بے حد اثر پذیر ہوتی ہے،
انداز کا ارادتاً اور غیر ارادتاً بہت کچھ اثر ہوا ہوگا۔

نقل کرنے سے ہمیشہ بچتی رہی ہوں۔ جہاں تک غیر ارادی طور
یق بانو :- پر کسی سے متاثر ہونے کا سوال ہے، اس کا اندازہ مجھ سے بہتر
بن لگا سکتے ہیں، میرے خیال میں تو میری ڈگر مخصوص ہے، اور مکمل کوشش
ی ہوں کہ اپنے قلم سے اپنے ہی احساسات بیان کروں، تقلید سے انتہائی
ت ہے، جب لکھنے بیٹھتی ہوں تو بیگانۂ ماسوا ہو جاتی ہوں، اس کا ہوش ہی
یں رہتا کہ کسی دوسرے افسانہ نگار کو افسانہ نگار سمجھوں۔

یلہ اختر :- میں نہیں کہہ سکتی :-

بر یں :- اس استفسار کا جواب میرے "حالاتِ زندگی" میں موجود ہے،

اس کا جواب مجھ سے بہتر دوسرے لوگ دے سکتے ہیں۔

صالحہ عابد حسین :- میرا اپنا خیال یہ ہے کہ چونکہ میں بچپن سے منشی پریم چند مرحوم کے افسانوں کی دلدادہ اور ان کی معتقد رہی ہوں، اس لئے کچھ نہ کچھ ان کے اسلوب سے متاثر ہوئی ہوں گی ـــــ اگرچہ میرا اور ان کا دائرہ بالکل الگ الگ اور مختلف ہے ـــــ میں تو زیادہ تر اپنے گردوپیش کی گھریلو زندگی پیش کرتی ہوں۔ اور اُن کا دائرہ لامحدود تھا ـــــ رہا زبان اور بیان کا معاملہ تو یہ جیسے کچھ بھی ہیں غالباً میرے اپنے ہی ہیں۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی :- اس سوال کا جواب شاید میں نفی میں دوں، اس لئے کہ میں نے کسی افسانہ نگار کے تتبع میں کہانیاں نہیں لکھیں ـــــ چونکہ اُردو کا افسانوی ادب میری نظروں سے پوشیدہ نہیں اس لئے غیر شعوری طور پر بہت ممکن ہے کہ کسی افسانہ نگار کا اثر ہو۔

عائشہ درانی :- سوال بڑا ٹیڑھا سا ہے۔ عمر میں بڑے ہونے کا غرور ایک طرف آنکھیں دکھاتا ہے، تو دوسری طرف سچ بولنے کا خبط جان کو آتا ہے۔ میری افسانہ نگاری کی "اوور ہالنگ" ہونے کے بعد بالکل غیر ارادتاً جن افسانہ نگاروں کی زبان اور بیان سے میں متاثر ہوئی وہ میری چھوٹی بہنیں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور ہیں۔ میری رومانی کہانیوں میں خدیجہ کی زبان اور بیان کی جھلک ہے۔ اور ادھر کچھ نئی کہانیوں میں بالکل غیر ارادی طور پر ہاجرہ کا رنگ قبول کر رہی ہوں۔

قرۃ العین حیدر :- میں نہیں کہہ سکتی کہ کسی خاص افسانہ نگار کا طرزِ بیان

ے اسلوب پر اثر انداز ہوا ہے یا نہیں، کرشن چندر میرا پسندیدہ فنکار ہے
س کے سٹائل سے بہت متاثر ہوں، ممکن ہے کہ غیر ارادتاً میں نے کہیں
اس کا طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہو۔

عبدالقادر:۔ میرے فن پر کسی افسانہ نگار کی زبان یا بیان کا کوئی اثر نہیں، میرا فن فقط میرا اپنا ہے، کسی غیر کی نظریں
پہ نہیں پڑیں:۔

ہ مسرور:۔ اس کا فیصلہ کرنا میرے لئے دشوار ہے۔

۶۔ اپنے فن کا موجودہ اسلوب اپنانے میں آپ نے ارادتاً کیا کیا کوششیں کیں۔

م سلیم:۔ محض یہ کہ میں اپنے ذہنی انتشار کا صحیح عکس پیش کر سکوں، یا یوں سمجھئے، کہ قلم کاغذ کی مدد سے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں
لئے جب میں مضطرب ہوتی ہوں، تو میرے افسانوں میں افراتفری پھیل جاتی
، اور جب پرسکون ہوتی ہوں تو تحریر بھی مستقل مزاج نظر آتی ہے۔ میرے
ہیں افسانہ نگاری کا مقصد کہانیاں گھڑنا نہیں، بلکہ اپنے خیالات اور احساسات
لفظی پیکر پہنانا ہے، اس لئے بے ساختہ لکھتی ہوں اور لکھنے کے بعد نظر ثانی
تبدیل کو ضروری نہیں سمجھتی، خواہ موضوع میں بے ربطی پیدا ہو جائے، یا
بیں الجھاؤ۔

حمیدہ سلطان :- میں نے از خود افسانہ لکھنے کی کوشش ہی کبھی نہیں کی، تو فنی اسلوب اپنانے کی کوشش کا ذکر بیکار ہے، جب دل کے تقاضے مجھے بہت مجبور کرتے ہیں، یا کوئی خاص واقعہ متاثر کرتا ہے، تو میں لکھنے بیٹھ جاتی ہوں، ہاں، میں نے اب تک جو کچھ بھی لکھا، ہمیشہ محسوس کر کے ــــ میرے اکثر افسانے محض افسانے ہی نہیں، زندگی کی روداد بھی ہیں، اگر انسان لکھنا چاہے تو اس دنیا کا ہر واقعہ افسانوں سے کہیں زیادہ دلکش ہے، میں تو اپنے اردگرد ہمیشہ اور ہر جگہ افسانے بکھرے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔

خدیجہ مستور :- مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، میں نے ارادتاً تو کوئی خاص قابلِ ذکر کوشش نہیں کی، ہاں، غیر ارادی طور پر کوئی کوشش ہو گی جبھی تو میری حیات ادب میں بھی مختلف رنگ نظر آتے ہیں، ہاں، اب ارادتاً یہی کوشش کرتی ہوں کہ بڑی بڑی باتیں بھی افسانوں میں کہوں، تو چھوٹے چھوٹے جملوں میں اور ذرا مسکرا کے ـــــ میرا خیال ہے کہ افسانہ ٹھوس اور خشک تقریروں کے ٹھونسنے سے افسانہ تو ہرگز نہیں رہ جاتا۔ ہاں اور جو کہئے کہ دوں۔

زہرہ جبین :- ارادتاً یا غیر ارادتاً ابھی تک میں نے اس فن کی طرف پوری توجہ ہی نہیں دی، اور آئندہ کے ارادے اس استفسار کی ذیل میں نہیں آتے۔

سحاب قزلباش :- یہ سوال ذرا ٹیڑھا ہے، نہ میں فنکار ہوں، نہ فنکار بننے کا دعویٰ ہے، اور نہ ہی اس فن کی تکمیل کی کوشش کر رہی ہوں، ہاں، جب کسی چیز سے دل متاثر ہوا۔ اور جذبات نے اکسایا لکھنے

ئی ، اندر سے کسی نے نقشہ سا کھینچ دیا ، اور دل کے ہاتھوں اپنی سیدھی سادی
ہیں لکھنا شروع کر دیا ، مگر دوران تحریر میں مجھے جھجک جھجک کر ، رک رک کر ،
ے ماحول اور اپنے دائرے کے اندر ہی گھوم پھر کر لکھنا پڑتا ہے ، ہزار مرتبہ
ر جذبات نے اکسایا کہ دائرے سے باہر کی دنیا بڑی خوبصورت ہے ، کچھ
کے بارے میں بھی لکھو ، تحریر رنگین ہو جائے گی ، مگر قلم رک جاتا ہے ، اور
ی ڈیکتا ہوا مردہ سا ہندوستان اپنی دھندلی دھندلی آنکھوں سے گھورتا
نظر آجاتا ہے ، جیسے کہ رہا ہو ——— " نہیں ، ہندوستان کی لڑکیاں اپنی پھٹی
چادر کو ابھی احتیاط سے اوڑھ لیتی ہیں مگر ننگے سر وہ اپنے دائرے سے
کبھی نہیں نکل سکتیں ، وہیں مر جاتی ہیں گھٹ گھٹ کر ، اور پھر تم تو ابھی کماری ہو ،
ی عزت میری لاج - دوسرے ملکوں کو حسد بھری نگاہوں سے نہ دیکھو ،
نہیں ، تمہارا ہندوستان اُسی روش پر پھیرتا رہتا ہے - جہاں تمہارے
ان گھوم پھر کر مر گئے ، اور اب تک میں بھی اسی لکڑی کے سہارے ، اور اُنہی
پُرانے کپڑوں کے ساتھ اُسی راہ پر قدم ناپ رہا ہوں ، موت کے انتظار میں
——— لکڑی کے سہارے تم کو بھی چلنے کے لئے لکڑی مل جائے گی ، تم خود اکیلے
کی کوشش ہرگز نہ کرنا - ہندوستان کی بیٹیوں کو یہ چیز زیبا نہیں ———
ہیں اپنے باغی جذبات سے تھک کر ہندوستان کی گردیا کو آنسوؤں سے
ں گھول کر پٹیلے سے رنگ کا روغن کر دیتی ہوں ، بس یہی ارادۃً کرتی چلی
ی ہوں ، اپنی روش الگ بنانے کا ارادہ کیا تھا - مگر بوڑھے ہندوستان
ت یاد آجاتی ہے کہ لکڑی کا سہارا تم کو بھی مل جائے گا - جب چلنا اکیلے

ٹھیک نہیں ـــــ کیونکہ تم پر عورت کا لیبل چپکا ہوا ہے، اور وہ بھی ہندوستان کی بیٹی ـــــ، مجھے عصمت باجی کی یہ بات یاد آگئی کہ " سحاب، اب میں عورت مرد کا سوال بالکل فضول ہے۔ دماغ ایک، دل ایک، پھر آخر... " میں صرف مسکرادی اُن کی اس جرأت پر اور اپنی اس بزدلی پر جو میری سرشت میں گھل مل گئی ہے۔

سنجیدہ اشرف :- تا ہنوز موجودہ اسلوب اپنانے کی ارادتاً تو کسی قسم کی سعی نہیں کی ممکن ہے کہ آئندہ کوئی خاص راہ اختیار کر سکوں۔

سیدہ اشرف :- موجودہ اسلوب اپنانے میں میں نے کوئی شعوری سعی نہیں کی۔

شائستہ اختر سہروردی :- جہاں تک مجھے معلوم ہے میرا کوئی خاص اسلوب نہیں۔ اور نہ ہی میں نے اپنا کوئی مخصوص طرز بنانے کی کوشش کی، نہ تو کبھی اس کی فرصت ہی ملی کہ لکھنے پڑھنے کی طرف خاص توجہ دے سکوں اور نہ جو کچھ اب تک لکھا ہے وہ نظر میں اتنا بچا کہ خود کو ایک ر[illegible] سمجھ کر ایک خاص اسلوب یا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کروں۔ میری تمام تحریریں انتہائی مشغولیت، انتشار اور عجلت کے عالم میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں! اسی کو میرا مخصوص رنگ سمجھ لیجئے۔

شفیق بانو :- کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی۔

شکیلہ اختر :- میں نے اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں کے افسانے اور ناول بکثرت پڑھے ضرور ہیں۔ کبھی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔

صالحہ عابد حسین :- اس سوال کا جواب دینا ذرا مشکل ہے، بہر حال میں اس کے جواب میں اپنے ایک مضمون کا کچھ حصہ نقل کئے دیتی ہوں۔

"میری کوشش صرف یہ ہے کہ میں اپنے گرد وپیش کی زندگی کو غور سے دیکھوں اور
سچائی سے دکھاؤں۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے مشاہدے کی عادت
ڈالی اور اپنے محدود دائرے میں بہت کچھ دیکھا۔ بیماریاں اور پریشانیاں دیکھیں،
عزیز ترین ہستیوں کی دائمی جدائی دیکھی، اور اُن کی یاد کو زندگی کا گراںبہا سرمایہ پایا، خوشیاں
اور راحتیں، سلوک اور اتفاق، لڑائی جھگڑے، محبت اور نفرت، خودغرضی اور تن
دہی خلوص اور ایثار کے جلوے دیکھے، محبت کے پردے میں نفس پرستی اور خودمطلبی
دیکھی، اور سختی اور کھرے پن میں خلوص اور ہمدردی کا تماشہ دیکھا، بیماریوں اور مصائب
میں انتہائی صبر اور برداشت دیکھی، اور تندرستوں کو بیمار بننے کا شوقین بھی پایا، غربت
میں قناعت اور سخاوت ــــ فراغت میں ہوس اور کنجوسی دیکھی، سرمایہ داری کے مظالم
اور غریبوں کی برداشت اور بے ہمتی، مردوں کی بے حیثیتی اور بے حسی، بچوں کی ناقص اور
غلط تربیت اور نکمی تعلیم، نوجوانوں کی فیشن پسندی اور مغرب پرستی اور بھیڑ چال دیکھی، سستی
شہرت کیلئے ناروا اور ناواجب کوششیں بھی اور خاموش عمل خدمات بھی دیکھیں، اور
پھر جاہلوں میں بھی انسانی ہمدردی اور انسانیت کی اعلیٰ خوبیاں اور پڑھے لکھے لوگوں
میں حیوانوں کی سی خصلتیں بھی دیکھیں ــــ لیکن ان سب کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد
جو بات معلوم ہوئی، وہ صرف اتنی کہ انسانی سیرت حد سے زیادہ پیچیدہ اور اس کا مطالعہ
اور مشاہدہ بہت کٹھن، صبر آزما، اور دشوار کام ہے، پہلے لکھنے بیٹھتی تھی۔ تو بے تکان
لکھتی چلی جاتی تھی، اور اب قلم ہاتھ میں لیتی ہوں تو ڈرتی ہوں کہ جو کچھ لکھ رہی ہوں اس
میں نہ جانے کتنی سچائی ہے، اور کتنی خیال آرائی، بہرحال کوشش یہ کرتی ہوں کہ
انسانی زندگی اور سیرت کو ہمدردی سے دیکھوں اور سچائی سے دکھاؤں اور اپنے مقصول

سے کرداروں سے اس طرح گھل مل جاؤں کہ ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھ سکوں۔ اور کامیابی سے ان کی زندگی کی تصویر کھینچ سکوں۔ اگر اس کوشش میں تھوڑی سی کامیابی بھی حاصل ہو جائے تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔"

صدیقہ بیگم سیوہاروی :- فن چونکہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، اس لئے فنکار اگر اس سے بچ کر کچھ پیش کرنا چاہیئے، تو اس کی یہ کوشش رائگاں جائیگی۔ پھر بھی ہم فراری ادب کی تخلیق کرتے ہیں، اب اگر اسے صرف فراری ادب کی حدود ہی میں دیکھا جائے، تب بھی جہاں کہیں سماجی مسائل کا ہلکا سا پرتو پڑ جائے، وہ فراری ادب نہیں رہتا، چنانچہ ابتدا میں میری تحریریں ادب برائے ادب کے تصور کے باوجود کہیں کہیں زندگی کی غمازی کرتی ہیں، پھر مجھ کو اشتراکیت کے مطالعہ کا موقع ملا، اور اسی دوران میں ہندوستان کی اشتراکی پارٹی بھی قانونی ہوئی، اس طرح مجھکو اس کے مطالعہ میں اور بھی آسانی ہوئی، چنانچہ ذہنی طور پر میرے رجحانات میں جو تبدیلی ہوئی، اسکا نتیجہ "ہچکیاں" اور اس کے بعد کے افسانے ہیں، یہ تبدیلی جسقدر غیر شعوری طور پر ہوئی، وہاں شعوری احساسات کا بھی کسی حد تک دخل ہے۔

عائشہ درّانی :- میں ایک بہت معمولی لکھنے والی ہوں اور مجھے اس کا احساس پوری طرح تھا اور ہے، کہانی لکھنے کے بعد اور خصوصاً چھپنے کے بعد شاید ہی وہ کبھی مجھے مطمئن کر سکی ہو، پہلے رومانی کہانیاں لکھیں جنہیں قارئین نے سراہا لیکن خود بخود مجھے احساس ہوا کہ میں سراسر جھوٹ لکھ رہی ہوں سنے ۔۔۔ جی اچاٹ ہو گیا۔ زندگی پر نظر دوڑائی تو ایک بار پھر لکھنے کا چاؤ پیدا ہو۔ اب ادھر جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحریر میں الجھاؤ کو میں ناپسند

کرتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی کہانیوں میں بھی اس سے احتراز کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:۔ اپنا موجودہ طرزِ نگارش اپنانے میں میں نے ارادتاً قطعی کوئی کوشش نہیں کی، شروع میں مجھے اپنی تحریروں کی طرف سے کبھی اچھی طرح سے اطمینان نہ ہوتا تھا، لیکن جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے افسانہ نگاری کا شوق چھوڑنا نہیں چاہیئے، تو گذشتہ برس میں نے چند افسانے لکھے، کسی خاص ادیب کا اسلوب میرے پیش نظر نہیں تھا، میں رسالے بہت کم پڑھتی ہوں، اور کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ اپنے چند پسندیدہ ادیبوں کی تصانیف کے علاوہ اردو کی زیادہ کتابیں پڑھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا، دراصل افسانہ نگاری میرے نزدیک ایک بہت ہی فضول مشغلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، جب کورس کی کتابوں یا تفریحی مشاغل سے اکتانے لگتی ہوں، تو افسانے لکھنا شروع کر دیتی ہوں، اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے، کہ افسانے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس قدر "بوریت" پھیلتی ہے کہ اسے مدتوں کے لئے ادھورا چھوڑنا پڑ جاتا ہے، اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ فضول افسانہ آج تک نہیں لکھا گیا ہوگا۔

مسز عبدالقادر:۔ اپنے فن کا موجودہ اسلوب اپنانے میں میں نے کبھی ارادتاً کوئی کوشش نہیں کی ہے، صرف وہ الہام قلمبند کرتی ہوں، جو مجھے شکستہ کھنڈروں اور آثارِ قدیمہ میں بیٹھ کر ہوتے ہیں۔

ہاجرہ مسرور:۔ کیا جانے کامیاب ہوں یا ناکامیاب، لیکن تھوڑے عرصے سے میری یہی کوشش ہے کہ قاری کو چونکانے کے لئے بجائے ڈھائی من کا پتھر پھینکنے کے تولہ بھر کی کنکری سے نشانہ لگاؤں، لیکن یہ دوسری بات ہوگی اگر پڑھنے والے کو میری کنکری ڈھائی من کے پتھر کی ضرب لگائے بغیر ہیں

اپنے فن کو ایسے اسلوب سے بچانے کی بہت کوشش کرتی ہوں، کہ غریب قاری میرا افسانہ ختم کرکے یہ محسوس کرے کہ اس نے "کمیونسٹ مینی فسٹو" یا "ہندوستان کا غذائی بحران" یا فرائڈ کی کسی کتاب کے چند ورق پڑھ کر چھٹکارا پایا ہے، میں کوشش کرتی ہوں، کہ اپنے افسانوں میں صاف، سادی اور عام فہم زبان استعمال کروں، جس اچھائی یا برائی کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے، اسے اچھی طرح واضح کرسکوں، اور نتائج سے قاری کے ذہن کو نہ بھٹکنے دوں، غرض میں چاہتی تو یہی ہوں کہ میرا افسانہ پڑھتے ہوئے انسان کبھی مسکرا بھی سکے، کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھی بھر سکے، اور کچھ سوچنے پر بھی مجبور ہو جائے۔

۷۔ اپنے فن کے بارے میں آپ نے مستقبل کے لئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے؟

تسنیم سلیم:۔ مجھے اپنے خیالات عزیز، اور اپنی روش پسند ہے، اسی پر قائم رہنا چاہتی ہوں۔

حمیدہ سلطان:۔ میں اپنے افسانوں کو مستقبل میں زندگی کے زیادہ قریب لے جانے کی کوشش میں ہوں میرا خیال ہے محض رومانی افسانے لکھنے بالکل فضول ہیں، کیونکہ زندگی میں رومان تو برائے نام ہے، (حیات تو تلخیوں کا دوسرا نام ہے)

خدیجہ مستور:۔ میرے سامنے مستقبل کیلئے کوئی پروگرام نہیں، اس سے قبل بھی کبھی پروگرام بناکر کوئی کام نہیں کیا۔

زہرہ جبین:- میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جس کام کیلئے میں نے کوئی پروگرام مرتب کیا وہ ادھورا ہی رہا، پھر جس انسان کی ہر حرکت ایک خاص موڈ کے زیر اثر ہو، وہ بھلا ان تفصیلات کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہے۔

سحاب قزلباش:- حال کی تو یہ کیفیت ہے کہ آنیوالی کل کا انتظار بھی ہوتا نظر نہیں آتا کہاں پھر مستقبل کے منصوبے بقول غالب ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

سنجیدہ اشرف:- میرے ذہن میں کوئی پروگرام نہیں،

سیدہ اشرف:- مستقبل کیلئے کوئی مرتب پروگرام نہیں، حالات کی ساعدت اور سازگاری درکار ہے، یوں تو کئی خیالی ہیں ارادوں کے سینکڑوں حباب بنتے اور بگڑ جاتے ہیں، بس خیالات کے طوفان میں زندگی کی کشتی ڈول رہی ہے، بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں، لیکن صحت کا قابل اطمینان حد تک ٹھیک نہ ہونا کچھ نہیں کرنے دیتا معاشرتی موضوعات اور گھریلو مسائل کے متعلق چند کتابیں ترتیب دینے کا ارادہ ہے۔

شائستہ اختر سہروردی:- مستقبل کیلئے کوئی پروگرام نہیں سوچا، جب اسکی امید ہی نہ ہو کہ سنجیدگی کیساتھ کبھی لکھ سکوں گی، تو مستقبل کے متعلق کچھ سوچنا فضول ہے، ہاں اگر فرصت ملی تو نفسیاتی ناول اور افسانے لکھنے کا ارادہ ہے

شفیق بانو:- صرف یہی کہ لکھوں، لکھتی رہوں، اور لکھ لکھ کر ایڈیٹر صاحبان کے تقاضوں سے فی الوقت نجات حاصل کرتی رہوں — خواہ میرے دل و دماغ کا نیلام ہو جائے مگر لکھنے سے کبھی توبہ نہ کروں۔

شکیلہ اختر:۔ ابھی تو افسانے لکھتی رہوں گی پھر ایک ناول لکھنے کا ارادہ ہے
شیریں:۔ کبھی سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔
صالحہ عابد حسین:۔ کوشش کروں گی کہ کم لکھوں اور اچھا لکھوں۔
میں کہانیاں کسی خاص پروگرام کے ماتحت نہیں لکھتی
صدیقہ بیگم سیوہاروی:۔ جب کوئی خاص موضوع میرے ذہن میں خود افسانے
میں ڈھل جاتا ہے، تو میں اُسے کاغذی پیرہن بخش کر ایک تصویر بنا دیتی ہوں۔
عائشہ درانی:۔ کوئی خاص پروگرام فی الحال میرے پیش نظر نہیں ہے۔
اپنے "فن" (کس قدر گرینڈ لفظ ہے!) کے بارے میں
قرۃ العین حیدر:۔ اسوقت تک کچھ نہیں سوچا، بہت ممکن ہے، کہ افسانہ
کے مشغلے سے بہت جلد طبیعت اکتا جائے، مجھے انگریزی میں لکھنا زیادہ اچھا لگتا
کبھی کبھی جی چاہتا ہے، کہ انگریزی جرنلزم کا career بنانے کی کوشش کیجائے
یہ خیال خاصہ ridiculous سا ہے، اور پھر اس ہندوستان میں! جہاں
کے متعلق لکھا جاتا ہے، کہ یہ خاتون تو ہو ہی نہیں سکتیں، قطعی کوئی مرد ہے، جو
نام سے اتنے عمدہ مضامین لکھتا ہے۔
اپنے فن کے مستقبل کے متعلق میرا کوئی پروگرام نہیں
مسز عبد القادر:۔ افسانے ویرانوں، کھنڈروں اور پرانے مقبروں میں جنم لیتے ہیں
شکستہ ارم خطوں اور منیو سواد وادیوں کی آغوش میں پروان چڑھتے ہیں، اس۔
وہ خانہ بدوش ہیں، اور خانہ بدوشوں کو مستقبل یا پروگرام سے کیا واسطہ
ہاجرہ مسرور:۔ اسکا زیادہ بہتر جواب تو میرا مستقبل ہی دے سکے گا۔

۸۔ کیا آپ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

تسنیم سلیم :- میں نے کبھی کچھ لکھنے سے پہلے قوت ارادی سے کام نہیں لیا ہیں جب جیسا دل چاہا لکھا، واللہ اعلم اس بے ساختگی سے مجبور رہ کر کب کیا لکھوں! ــــ ایک کہانی بڑی آہستہ خرام ثابت ہو رہی ہے ممکن ہے وہ ناول کی صورت میں منظر عام پر آئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو مکمل کرنے کے بعد جب میرے دماغ سے اس واقعہ کے تاثرات ہلکے ہو جائیں، تو میں اشاعت کے بجائے اس کو نذر آتش کر دینا پسند کروں ــــ وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔

حمیدہ سلطان :- میرا ایک معاشرتی ناول ثروت اکرام ۱۹۴۲ء میں چھپ چکا ہے یہ ناول میں نے ۱۴ سال کی عمر میں لکھا تھا اس ناول کا دوسرا حصہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے ابھی شائع نہیں ہوا تیار رکھا ہے اگلے سال شاید اسکو چھپواؤں

خدیجہ مستور :- جی ہاں، اگر صحت نے اجازت دی تو افسانوں کا تیسرا مجموعہ مکمل کرنے کے بعد ناول ہی لکھنے پر ساری توجہ صرف کروں گی۔

زہرہ جبین :- ناول لکھنا تو درکنار یہاں تو اتنا بھی حوصلہ نہیں، کہ ناول پڑھا بھی جا سکے۔

سحاب قزلباش :- ارادہ تو ہے، لیکن اس وقت جب منزل ادب میں صرف قدم گننے جائیں اور کوئی نہ پہچان سکے کہ یہ عورت کے ہیں یا مرد کے، مگر اس "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک"!

سنجیدہ اشرف :- ایک خیال ضرور ہے جو شاید کبھی ارادہ بن کر عملی صورت اختیار کر لے۔

سیدہ اشرف :- فی الحال ناول نویسی کی طرف طبیعت مائل نہیں۔

شائستہ اختر سہروردی :- ناول لکھنے کا ارادہ تو نہیں، خواہش ضرور ہے لیکن

بد قسمتی سے قوتِ تنقید قوتِ تخلیق سے زیادہ [illegible] ہے، اور عدیم الفرصتی کے

اب تک ناول لکھنے میں حائل رہی ہے۔

شفیق بانو:۔ جی ہاں، ضرور ایک شروع بھی [illegible] رکھا ہے

جب لکھ سکی تو ضرور لکھوں گی۔

شکیلہ اختر:۔ جی ہاں۔

شیریں:۔ ارادے کیا کیا نہیں ہیں۔

صالحہ عابد حسین:۔ میرا ناول "عذرا" عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی:۔ میں ایک ناول لکھ رہی ہوں جو نیم سوانحی / semi

biographical ہو گا۔

عائشہ درانی:۔ ایسا کوئی ارادہ نہیں۔

قرۃ العین حیدر:۔ ناول لکھنے کا اب تک تو کوئی ارادہ نہیں ہوا۔ کیونکہ میں

جب کہ جب ایک افسانہ ختم کرنا مصیبت ہو جاتا ہے، تو ناول اس رفتار سے

میں بھی مکمل نہ ہو سکے گا۔

مسز عبد القادر:۔ ناول میں نے ابھی تک نہیں لکھا۔ مگر لکھنا چاہتی ہوں

کھنڈرات مجھے اس کیلئے اکسا رہے ہیں۔ تاہم مجھے اس کیلئے الہام نہیں [illegible]

ٹیکسلا گئی تو گرمی کا موسم تھا، یکسوئی اور اطمینان سے وہاں نہ ٹھہر سکی، اور نہ

آتی۔ چنانچہ اب دوبارہ جاؤں گی۔

ہاجرہ مسرور:۔ ادھر کئی ماہ سے ناول لکھ رہی ہوں:۔